اختر بلوچ

کرانچی والا 1

اختر بلوچ

کراچی والا
(حصہ اوّل)

ILM O ADAB PUBLISHER & BOOK SELLER KARACHI
علم و ادب

کتاب کا نام: کرانچی والا (حصہ اوّل)

مصنف کا نام: اختر بلوچ

سرورق : اختر سومرو

اشاعت اوّل : 2016 زیر اہتمام آج کی کتابیں

اشاعت دوم : 2019 زیر اہتمام فکشن ہاؤس لاہور

اشاعت سوم : 2020 زیر اہتمام علم و ادب پبلیشرز اینڈ بک سیلرز

تعداد: 500

زیر اہتمام: علم و ادب پبلشر اینڈ بک سیلر

علم و ادب پبلشر اینڈ بک سیلر

دکان نمبر 311، تھرڈ فلور، بک مال، اُردو بازار، کراچی

رابطہ نمبر: 0335-2620640 / 0331-2952483

www.facebook.com/ilmoadabpublisher

E-mail: ilmoadabpublisher@gmail.com

www.ilmoadabpublisher.com

انتساب

آزاد قلم دار

مصدق سانول

کے نام

جو اپنے کام کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

ان کی حوصلہ افزائی نہ ہوتی تو لکھنے کا یہ سلسلہ جاری نہ رہتا

ترتیب

پیش لفظ

خودآگہی کا سفر

تاریخ نویسی ایک بے رحم شعبہ ہے۔ یہ آپ کو ایسی معلومات فراہم کرتا ہے جو آپ کو جو چونکا دیتی ہیں، ذہن کے بند دریچوں کو کھولنے پر مجبور کرتی ہیں۔ سکہ بند اور درباری قسم کے تاریخ دان ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ اپنی سوچ کے دائرے کو محدود رکھیں۔ ایک مخصوص وقت تک وہ اس کوشش میں کامیاب ہوجاتے ہیں، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگ ایسے مخصوص دائروں سے باہر نکل آتے ہیں۔ وہ سوال کرتے ہیں، اور جب انھیں اپنے سوالوں کا جواب نہیں ملتا تو اس کے لیے کھوجنا شروع کرتے ہیں۔ یہ ایک مثبت عمل ہے اور جاری رہنا چاہیے۔ ہمیں تاریخ کو مسخ کرنے کے بجائے اس میں پوشیدہ تلخ حقائق منظرعام پر لانے چاہئیں تاکہ بحیثیت قوم اپنی درست سمت کا تعین کرسکیں۔

تاریخ کے پوشیدہ تلخ حقائق کو منظرعام پر لاکر پاکستانی قوم کے اذہان کے بند دریچوں کو کھولنے کی کوشش کرنے والوں کی مختصر فہرست میں ایک اہم نام کا اضافہ ہوا ہے۔ وہ نام ہے اختر بلوچ۔ انسانی حقوق کی تحریک کے ایک فعال اور مستعد کارکن کی حیثیت سے اختر بلوچ نے کئی مظلوم طبقات (مثلاً تیسری جنس، سندھ کے شیڈول کاسٹس) کے بارے میں قابل قدر تحقیق کا قرض ادا کیا۔ گزشتہ چند برسوں سے وہ کراچی کی تاریخ قدیم عمارات، شاہراہوں اور شخصیات پر تحقیق کے ذریعے مرتب کررہے ہیں۔ اس تحقیق کے ابواب ڈان ڈاٹ کام پر بلاگ کی صورت میں پیش کیے جاتے رہے ہیں اور اختر بلوچ نہایت دل آویز انداز میں پاکستانی شہریوں کو خودآگہی کے سفر پر چلتے رہنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔

عوام کو اپنے اپنے شہروں کی تاریخی عمارات اور ثقافتی میراث کے بارے میں حقائق سے آگاہ کرنے کی ضرورت تقریباً ہر ملک میں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ عام شہری تاریخی عمارات کو دیکھتا تو روزانہ ہے لیکن ان عمارات کا مشاہدہ کرنے کی نہ اُسے ضرورت محسوس ہوتی ہے اور نہ پیٹ بھرنے اور بال بچوں کو پالنے کی جدّوجہد اُسے اس کام کے لیے فرصت فراہم کرتی ہے۔ جن اقوام کو ترقی پسند کہا جاتا ہے انھیں یہ اعزاز، علاوہ اور کامیابیوں کے، اس بنا پر بھی دیا جاتا ہے کہ انھوں نے تاریخی عمارات اور ثقافتی ورثے

کو محفوظ کرلیا ہے، ان کے بارے میں مطبوعات کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کرلیا ہے اور عوام کو ان عمارات اور ثقافتی دولت کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کا سلسلہ جاری کیا ہوا ہے۔

پاکستانی معاشرے کی یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ تاریخی عمارات اور ثقافتی میراث کا تحفظ نہ ریاست کی ترجیحات میں شامل ہے نہ عوام کی۔ یہاں وہی تاریخی عمارات زمیں بوس ہونے سے بچ گئی ہیں جنھیں برطانوی تسلط کے دور میں سرکاری طور پر محفوظ کرلیا گیا تھا۔ اگرچہ اُن کی دیکھ بھال کا نظام اتنا ناقص ہے کہ بیشتر عمارات شکست وریخت کا شکار ہورہی ہیں۔ کئی مقامات پر ثقافتی ورثہ اقتصادی ترقی (ڈیولپمنٹ) کے نام پر برباد کیا جارہا ہے جس کی ایک مکروہ ترین مثال لاہور کا اورنج ٹرین منصوبہ ہے، جس کی زد میں آنے والی 11 تاریخی عمارات کو سنگین نقصان پہنچنے کا احتمال ہے اور یہ خدشہ بھی ہے کہ عوام ان عمارات کو صحیح طور پر دیکھنے اور اُن کے حسن کا جائزہ لینے کے امکانات سے محروم ہوجائیں گے۔

کراچی میں تاریخی عمارات کئی حوادث کا شکار ہوئی ہیں۔ 1947 میں کراچی تقریباً پانچ لاکھ کی آبادی کا ایک خوبصورت شہر تھا، یا یوں کہیے کہ ایک خوبصورت شہر بن رہا تھا۔ چوڑی چوڑی سڑکوں کے کنارے مختلف نوعیت کی عمارات جیسے خالق دینا ہال، ہندو اور مسلم جم خانے، لکشمی بلڈنگ وغیرہ تعمیر کی گئی تھیں، آمدورفت کی سہولت کے لیے ٹرام چلتی تھی، سمندر کلفٹن پر کوٹھاری چھتری کے قدم چھوتا تھا۔ آزادی کے بعد چند سالوں میں کراچی کی آبادی میں کئی گنا اضافہ ہوگیا اور تمام اطراف میں ہر قسم کی عمارات پر آبادی کا دباؤ بڑھ گیا۔ تاریخی عمارات بھی قبضہ گروہوں کی ہوسِ ملکیت کا شکار ہوگئیں۔ سمندر کو پیچھے دھکیل کر ضرورت سے زیادہ دولت جمع کرنے والوں کے لیے نئی آبادیاں بنائی گئی ہیں اور عوام کے سمندر کے کنارے سیر کرنے پر پابندیاں لگانے کی تجاویز بنائی جاتی رہتی ہیں۔

حکومت ہندوستان سے نقل مکانی کرکے آنے والے انبوہ کی آبادی کے لیے کوئی منظم منصوبہ بنانے سے قاصر تھی، چنانچہ جس کا جہاں سینگ سمایا بسیرا کرلیا؛ مندروں، فلاحی اداروں، تعلیمی مراکز، سب پر قبضہ کرنا جائز قرار دے دیا گیا۔ ان تمام کارروائیوں کو سرکاری اہلکاروں کی تائید حاصل تھی۔ اگر کسی نے فیصلہ کرلیا کہ کراچی کے قدیم ترین مسیحی قبرستان کی جگہ پر ایک پلازہ بنایا جائے تو سرکاری اہلکاروں نے ساری رکاوٹیں دور کردیں۔

حکومت نے تاریخی عمارات، شاہراہوں اور چوراہوں پر عوام کے قبضے کی اس تحریک کی مزاحمت

یا مخالفت نہیں کی۔ اس کی وجہ دونوں کی سماجی اور ثقافتی اقدار کے بارے میں غلط فہمیاں تھیں۔ ایک مفروضہ تھا کہ پاکستان کی تاریخ 14 اگست 1947 یا سندھ میں محمد بن قاسم کی آمد سے شروع ہوئی تھی اس لیے برصغیر میں مسلمان حکومت کے قیام یا 1947 سے پہلے کی تعمیر کردہ تاریخی عمارات کا تحفظ ضروری نہیں تھا کیونکہ وہ اسلام سے مختلف تہذیبوں کی نمائندگی کرتی تھیں۔ چنانچہ غیر مسلم تاریخی عمارتوں کو منہدم کرنا یا اُن میں کلمہ گو خاندانوں کو بسا کر انھیں مشرف بہ اسلام کرنا قومی نیکی میں شمار کیا جانے لگا۔ جب تاریخی عمارات اور شاہراہوں پر غاصبانہ قبضے اور ان کی ہیئت میں تبدیلی کو قومی فرض کا درجہ دے دیا گیا تو ان عمارات وغیرہ کو بنانے والوں کے نام کو تاریخ سے خارج کرنے کا عمل بھی ضروری ہو گیا۔ اختر بلوچ کی نظر میں یہ روّیہ درست نہیں ہے، اس لیے وہ کہتے ہیں کہ تاریخ کے گمشدہ اوراق دریافت کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قوم ایک درست سمت میں سفر کرنا سیکھ لے۔ اس مختصر کتاب کے اوراق گواہ ہیں کہ اختر بلوچ نے تاریخ کا کھوج لگانے کا فرض نہایت خوبصورتی سے اور موثر انداز میں ادا کیا ہے۔

اختر بلوچ نے ہمیں بتایا ہے کہ کلفٹن پر کوٹھاری نے سمندر تک جانے کے لیے پیئر کیوں تعمیر کرایا، شہر کے قدیم ترین مسیحی قبرستان پر پلازہ کیسے بنا، ہماری حکومت نے عطیہ فیضی اور فیضی رحیمن کے ساتھ کتنا شریفانہ سلوک کیا، کس طرح انھیں بے گھر کیا اور کسمپرسی کے عالم میں ایک معمولی ہوٹل میں وقت گزارنے پر مجبور کیا۔ ہمیں یہ بھی بتایا کہ سر شاہنواز بھٹو کو اسمبلی کے انتخاب میں شکست دینے والے جیٹھانند عبدالمجید سندھی کا آزادی کی تحریک میں مقام کتنا اعلیٰ ہے۔ ناوٗل کے ساتھ کیا کیا زیادتی ہوئی۔ ایمپریس مارکیٹ کی زمین پر 1857 میں باغی سپاہیوں کو توپ سے کس طرح اڑایا گیا تھا اور اس جگہ پر اُگنے والے گلاب کس طرح کنکریٹ کی تہوں کے نیچے دبا دیے گئے، انھوں نے بتایا ہے کہ دین محمد وفائی روڈ پہلے اسٹریچن روڈ تھی اور اسٹریچن نے کراچی کو جدید بستی بنانے کے لیے کیا کیا خدمات انجام دیں۔ یہودیوں کے قبرستان کا جو حال ہوا سو ہوا، فلیگ سٹاف ہاؤس ڈیزائن کرنے والے یہودی ماہر کا نام تاریخ سے خارج کرنے کے لیے کیا کیا جتن کیے گئے۔

ان صفحات میں آپ کو موہٹہ پیلس کی کہانی ملے گی، یہ بھی پتا چلے گا کہ میرپور خاص کے بھان سنگھ کو سب سے زیادہ صدمہ کس بات کا ہوا، ایڈلجی ڈنشا نے شہر کو کیسا ہسپتال بنا کر دیا، دیارام گدومل نے تعلیم کے فروغ کے لیے کیا خدمات انجام دیں اور کس طرح ایک خاتون کی عزت بچانے کے لیے

کوچۂ ملامت میں اپنا بستر لگا لیا، کراچی میں روشنی کا انتظام کرنے والا ہر چند رائے وشنداس کون تھا، ہندو جم خانہ کی سات ایکڑ زمین کس کس نے ہتھیائی۔ نہایت دلچسپ کہانیاں ہیں، کراچی کی یہودی مسجد کی، ایلفنسٹن کے عروج و زوال کی، گوردوارے میں مسجد کی اور مری ماتا مندر میں امام حسین کے تعزیے کی۔ یہ داستانیں اختر بلوچ نے شگفتہ زبان میں بیان کی ہیں اور جب وہ احمد رشدی کے یادگار نغمے "بندر روڈ سے کیماڑی" کا ذکر کرتے ہیں تو کانوں میں احمد رشدی کی آواز گونجنے لگتی ہے۔

تاریخی عمارات اور شخصیات کے تذکرے میں اختر بلوچ نے ہمیں گزرے ہوئے زمانے کی ثقافت کے مناظر بھی دکھائے ہیں۔ وڈیرے ایلفنسٹن میں سودا خریدنے ضرور آتے تھے، کیونکہ گورے لوگ یہی کرتے تھے، گورے لوگوں اور میموں کے سامنے پیش ہونے کے لیے وہ نئے نئے سوٹ سلواتے تھے لیکن گوری عورتوں کا سامنا کرنے سے کتراتے تھے کیونکہ ان سے چھیڑ چھاڑ کے نتائج نہایت سنگین ہو سکتے تھے۔

کچھ تذکرہ نوکر شاہی کی حرکات کا بھی شامل داستان ہے، خاص طور پر نوکر شاہی کے سرخیل جناب چودھری محمد علی صاحب کا۔ جوگندر ناتھ منڈل کے ساتھ اُن کے ناروا سلوک کا کفارہ اختر بلوچ یوں ادا کرتے ہیں: "جوگندر ناتھ منڈل کی قربانیاں، مسلمانوں سے محبت، مسلم لیگ سے وفاداری سب اپنی جگہ، لیکن اس عظیم شخص کے ساتھ ایک بیوروکریٹ نے جو کچھ کیا، وہ اب غالباً تاریخ کا حصہ بن گیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں اب بھی پاکستان میں بے شمار جوگندر موجود ہیں جو اس وطن سے اپنی دوستی کا ثبوت دیتے دیتے تھک گئے ہیں لیکن کوئی بھی اسے ماننے کے لیے تیار نہیں۔ کیا اچھوتوں کو ماننے کے لیے اور اقلیتوں کی قربانیوں کا اعتراف کرنے کے لیے پاکستان میں ایک اور جناح کی ضرورت ہے؟"

میرا خیال ہے سب سے زیادہ دلچسپ اور سبق آموز انکشافات حکومت اور اس کے کارندوں کی سچ کو دبانے کی کوششوں کے بارے میں ہیں۔ قائداعظم کی 11 اگست 1947 کی تقریر سنسر کرنے کی کوشش تو اب عوامی یادداشت کا مستقبل حصہ بن گئی ہے۔

مس فاطمہ جناح کی ریڈیو پر تقریر اس طرح سنسر کی گئی کہ جب "قابل اعتراض" جملے آئے تو مس جناح بولتی رہیں لیکن ٹرانسمیشن بند کر دی گئی۔ زیڈ اے بخاری نے معذرت نامہ بھیجا کہ ٹرانسمیشن میں گڑبڑ بجلی کی فراہمی میں تعطل کی وجہ سے ہوئی تھی۔ مس جناح کا جواب خاصے کی چیز ہے:

بحوالہ آپ کا مراسلہ نمبر پی یو جی 1 (16)/51 مورخہ 12 ستمبر 1951۔ گیارہ ستمبر کو آپ نے میرے براڈ کاسٹ کی کاپی شام سات بجے منگوا بھیجی تھی اور آٹھ بجے شام آپ بنفس نفیس نہایت مشوش حالت میں میری رہائش گاہ پر تشریف لائے تھے اور آپ نے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ مجھ سے اپنی تقریر میں سے بعض جملے حذف کرنے کی استدعا کی تھی۔ میں نے جذبات سے بالاتر ہو کر آپ کو سمجھانے کی کوشش کی تھی اور آپ کو بتایا کہ اگر ایک خود مختار جمہوری ملک میں کسی قسم کی آزادیِ اظہار نہیں ہے تو میں اپنی تقریر کو تبدیل کرنے کے بجائے اپنی تقریر سے دستبردار ہونے کو ترجیح دوں گی جو خود آپ کی فرمائش پر نشر کی جارہی تھی۔

معمول کے مطابق براڈ کاسٹ کے ختم ہونے کے بعد آپ نے میری ریکارڈ شدہ تقریر مجھے سنوانے کے لیے کہا تھا۔ اس میں کسی قسم کی کوئی خرابی نہیں تھی۔ یہ کتنی حیران کن بات ہے کہ اس وقت نہ تو آپ نے اور نہ آپ کے عملے کے کسی رکن نے ٹرانسمیٹر وں میں کسی نقص یا خرابی کا ذکر تک کیا تھا۔ مجھے اپنے گھر واپسی پر اپنی تقریر کی براڈ کاسٹ میں خرابیوں کا پتا چلا تھا اور یہ بات میرے لیے موجب حیرت تھی کہ یہ خرابیاں عین انہی جملوں کے وقت پیدا ہو گئی تھیں جن کو حذف کرنے کی آپ نے درخواست کی تھی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ٹرانسمیٹر نہایت مستعد اور فرمانبردار قسم کے ہیں جو آپ کی سہولت کے پیش نظر نقص پیدا کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔

''جن لوگوں نے میری اصل براڈ کاسٹ میں رکاوٹ ڈالنے اور خرابی پیدا کرنے کی کوشش کی اور میری آواز کو لوگوں تک پہنچنے سے روکا اور جن جملوں کو انھوں نے ختم کرنے کی کوشش کی، وہ دراصل ان کی اہمیت کو اجاگر کر گئے۔ آپ نے اپنے خط میں اپنے ریجنل اسٹیشنوں سے میری براڈ کاسٹ کی روانی کی رپورٹوں کا حوالہ دیا ہے، اگر آپ ان سے مطمئن ہوتے تو پھر کسی قسم کی معذرت کی ضرورت نہیں تھی۔ جہاں تک اس ضمن میں لوگوں کی شکایت کا تعلق ہے تو ان ناراض ہونے والوں کو معقول طور پر مطمئن کرنا آپ کا کام ہے۔ آپ کی وضاحت نہ تو تسلی بخش ہے اور نہ قائل کرنے والی۔ ایسی صورت میں معذرت اقبالِ جرم کا محض ایک ملائم سا انداز ہے۔''

اس ضمن میں ریڈیو پاکستان پر ایک گانے کی سنسر شپ کا قصہ بھی دلچسپ ہے۔

''ایک دن عالمی یوم خواتین تھا۔ یہ جنرل پرویز مشرف کے دور کی بات ہے۔ ہم نے اس موقع پر ایک گانا 'ہم مائیں، ہم بہنیں، ہم بیٹیاں، قوموں کی عزت ہم سے ہے' نشر کیا۔ یہ گانا ابھی آدھا ہی نشر ہوا تھا کہ ڈیوٹی افسر مجاہد عزیز ہانپتے کانپتے اسٹوڈیو میں داخل ہوئے اور ساؤنڈ انجینئر کو عجیب وغریب اشارے کرنے لگے۔ ہم ان کے اشارے سمجھ نہ پائے۔ اردو میں ایک مثال مشہور ہے کہ گونگے کی بولی گونگے کی ماں ہی سمجھے۔ اچانک بیک گراؤنڈ میوزک چلنا شروع ہوگیا۔ ہم حیران پریشان۔ انھوں نے کہا کہ دوسرا گانا نشر کرو۔ اس کے بعد ہم نے نئے سرے سے تمہید باندھی، فنی خرابی کا ذکر کیا، اور نیا نغمہ نشر کر دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ایف ایم انچارج نے اس بات پر اعتراض کیا تھا کہ یہ نغمہ محترمہ بے نظیر بھٹو کے دور حکومت میں نشر ہوا تھا۔ وہ اب جلاوطن ہیں، اور ملک میں مشرف کی حکومت ہے۔ سارے پروگرام مانیٹر ہوتے ہیں۔''

زیر نظر بلاگز میں اختر بلوچ نے کئی درجن کتابوں کے حوالے دیے ہیں، یہ بھی تاریخ وثقافت کے طالب علموں پر ایک احسان ہے کہ وہ اپنے تحقیقی کام میں ان مطبوعات سے مدد لے سکتے ہیں۔

اس موقع پر یہ کہنا مناسب ہوگا کہ خود آگہی کا سفر کراچی تک محدود نہیں رہنا چاہیے۔ ملک کے تمام حصوں میں تاریخ کے گمشدہ اوراق تلاش کرنا ضروری ہے، کم ازکم سندھ کے مختلف حصوں میں بھی یہ کام کیا جانا چاہیے۔ نگر پارکر میں جین اور ہندو تاریخی عمارات پر تحقیقی کام اور اُن کے تحفظ کے لیے منصوبہ بندی وقت کا تقاضا ہے۔ سندھ کے دوسرے علاقوں میں بہت سے تاریخی مندر اور دیگر عمارات خستہ حالی کا شکار ہو رہی ہیں؛ اُن میں سے کچھ تو موریا حکومت کے دور کی باقیات بتائی جاتی ہیں۔ ان تمام تاریخی عمارات پر تحقیق اور تحفظ کی تحاریک کے لیے معقول وسائل کی فراہمی ایک اہم مسئلہ ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ تاریخ اور ثقافت کے فروغ کے لیے قائم ادارے اور پبلک تنظیمیں اختر بلوچ اور ان جیسے کھوجیوں کی حمایت اور امداد کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کریں اور ضروری وسائل کی فراہمی ممکن بنائیں، اس سے پہلے کہ یہ ثقافتی ورثہ ریت کی گود میں گم ہو جائے۔

آئی اے رحمٰن

لاہور

5 جولائی 2016

اعتراف

ایک دن مجھے میرے دوست اور سینئر صحافی عباس جلبانی کا فون آیا، وہ ملنا چاہ رہے تھے۔ ملاقات کا وقت غروب آفتاب کے بعد اور مقام ہمارے مشترکہ دوستوں عبدالرزاق ابڑو اور اصغر آزاد کا دفتر طے پایا۔ اس شام کچہری (مجلس) جب عروج پر پہنچی تو عباس نے مجھے بلوچی میں کہا، ”تو ڈان ڈاٹ کام واسطہ لکھے؟“ (تم ڈان ڈاٹ کام کے لیے لکھو گے؟) میں نے ہامی بھر لی۔ ایسی محفلوں میں ہونے والی گفتگو کے بارے میں ایک مثل عام ہے: ”رات گئی، بات گئی“۔ لیکن ایسا نہیں ہوا، دوسرے ہی دن شام کو ڈان ڈاٹ کام سے اردو کے ایڈیٹر آزاد قلم دار کا فون آیا۔ انھوں نے اپنا تعارف عباس جلبانی کے حوالے سے کروایا اور کہا کہ آپ ہمارے یہاں لکھنے میں دلچسپی رکھتے ہیں؟ میں نے ہاں میں جواب دیا۔ وہ بولے، تو کل پرسوں تک کچھ بھیج دیں۔ اُن دنوں مرحوم پولیس افسر چودھری اسلم کی زیرِ قیادت لیاری میں جاری گینگ وار کے خلاف آپریشن ہو رہا تھا، لیکن بہت زیادہ کوشش کے باوجود قانون نافذ کرنے والے ادارے لیاری کا چیل چوک عبور نہ کر پائے تھے۔ میں نے چیل چوک کی تاریخ پر ایک مختصر سا بلاگ لکھ کر آزاد اور عباس کو بھیج دیا۔ ایک دن کے بعد دونوں کا فون آیا کہ یہ مختصر ہے، اس میں کچھ اور اضافہ کریں۔ میں نے کچھ اضافے کے بعد بلاگ دوبار بھیجا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ یہ چھپے گا۔ قریباً دو یا تین دن بعد ہمارے دوست تنویر آرائیں کا میرپور ساکرو ٹھٹہ سے فون آیا کہ ”تُسی بڑا چنگا لکھا اے۔“ (آپ نے بہت اچھا لکھا ہے۔) اس کے بعد آزاد نے میرا پیچھا نہ چھوڑا اور بلاگز کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کبھی تاخیر ہو جاتی تو فوراً فون آ جاتا۔ پھر مصدق سانول، جو ڈان ڈاٹ کام کے ایڈیٹر تھے اور علاج کے لیے بیرونِ ملک گئے ہوئے تھے، واپس کراچی آ گئے۔ کیا کمال انسان تھے۔ انھوں نے سب سے پہلے میرے بلاگز کا عنوان ”کراچی والا“ تجویز کیا۔ ایک آدھ بلاگ رد بھی کیا۔ ان سے قبل مبشر زیدی جو آج کل ڈان ٹی وی پر پروگرام ”ذرا ہٹ کے“ کرتے

ہیں، انھوں نے بھی جناح صاحب کے حوالے سے ہمارا ایک بلاگ روک دیا تھا، لیکن آج کل ان کے پروگرام دیکھتا ہوں تو میرا وہ بلاگ اُن کے پروگراموں کے سامنے ایک معصوم بچہ نظر آتا ہے۔ خیر، مصدق سانول اور آزاد دونوں آج اس دنیا میں موجود نہیں ہیں، لیکن اُن کی یاد اور ارشادات آج بھی میرے ساتھ ہیں۔

جیسے جیسے بلاگز کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا، "ایسا لگتا تھا کہ ہمارے تقریباً تمام دوست کمر کس کر ہماری رہنمائی کے لیے میدان میں آ گئے ہیں۔" "بھئی اس پر لکھو، یہ موضوع تمھاری نظر سے نہیں گزرا، کیوں؟" ان دوستوں میں نمایاں مظہر لغاری، سلام دھار یجو، عزیز سنگور، سعید جان بلوچ، لطیف بلوچ، الطاف مجاہد، اجمل کمال، اسد اقبال بٹ، حسن منصور، جناب حسین نقی، عقیل عباس جعفری، فاضل جمیلی، اے ایچ خانزادہ، سلمان پیرزادہ، نعمت اللہ بخاری، ڈاکٹر توصیف احمد خان نمایاں تھے۔ ہمارے ایک ساتھی وسعت اللہ خان نے کہا، کافی لکھ چکے ہو، اب کتاب چھپنی چاہیے، اس سے پہلے کہ کتاب لاکتاب ہو جائے۔ اس موقع پر معروف فوٹو جرنلسٹ اختر سومرو کی مہربانی بھی قابل ذکر ہے کہ جنھوں نے فوٹو گرافی کے ابتدائی گُر سکھائے۔ جس کی وجہ سے جیسے تیسے ہم گزارے لائق فوٹو بنانا سیکھ ہی گئے۔ فوٹو جرنلسٹ اکبر بلوچ، سید شریف الحسن، نعمان، عمران اور ماجد بٹ، اعجاز کورائی، سید رضوان، قاضی خضر حبیب بھی مشکل مقامات پر فوٹو گرافی کے لیے ہماری ہمراہی کرتے رہے۔ ان کی محبتوں کا بھی کوئی جواب نہیں۔ اس حوالے سے اور بھی اور بے شمار دوست اور ساتھی ہیں جن کا فرداً فرداً ذکر ممکن نہیں۔

چونکہ ہمارا مسکن پریس کلب ہے اس لیے جب پریس کلب میں ہمارے بلاگز کا چرچا ہوا تو ایک صحافی ہمارے پاس تشریف لائے اور کہا کہ وہ بلاگ لکھنا چاہتے ہیں۔ ہم نے کہا، ضرور لکھیں۔ کس موضوع پر لکھیں گے؟ وہ بولے، موضوع کا مسئلہ نہیں، بس آپ کی ایک مدد کی ضرورت ہے۔ ہم نے جواباً کہا، ہم حاضر ہیں۔ وہ بولے، آپ اپنے بلاگز میں تاریخی حوالے ضرور دیتے ہیں۔ یہ بہت خوشی کی بات ہے، اس سے آپ کے بلاگز میں وزن آ جاتا ہے۔ (وہ نہ جانے کس وزن کی بات کر رہے تھے، ہمارے نامور صحافی دوست پیرزادہ سلمان کی نظر میں وزن سے مراد بس اتنی ہے کہ شعر پڑھنے میں وزن ہونا چاہیے۔) ہم نے اُن کا شکریہ ادا کیا۔ وہ مزید بولے، لیکن ایک مسئلہ

درپیش ہے۔ حوالے ہم بھی دینا چاہتے ہیں۔ ہم نے کہا، ضرور دیں۔ انھوں نے فرمایا، پورا اردو بازار چھان مارا لیکن حوالوں کی کتاب نہ ملی۔ اگر آپ یہ کتاب دے دیں تو ہم فوٹو اسٹیٹ کروا کر لوٹا دیں گے۔

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

جب ہم نے انھیں حوالوں کی بابت بتایا کہ کس طرح چار سو یا پانچ سو صفحات کی کتاب پڑھنے کے بعد کوئی ایک آدھ حوالہ ملتا ہے، اور نہیں بھی مل سکتا، تو انھوں نے بلاگ لکھنے پر لعنت بھیج دی۔

ایک صاحب نے ہم سے کہا، آپ کے بلاگز میں ہندو، عیسائی، پارسی اور دیگر غیر مسلم شخصیات، اُن کی خدمات کا ذکر بہت زیادہ نظر آتا ہے، کیا آپ مسلمانوں کے لیے نہیں لکھ سکتے؟ میں نے انھیں عرض کیا کہ مسلمانوں کی خدمات کے لیے تو سبھی لکھتے ہیں، لیکن چونکہ غیر مسلموں کے بارے میں کوئی نہیں لکھتا تو اس لیے میں ہی لکھ لیتا ہوں۔

میرے ان بلاگز کی شہرت کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ پاکستان بھر میں مختلف اخبارات یہ بلاگز اردو میں دوبارہ شائع کرتے ہیں اگرچہ ڈان ڈاٹ کام کا حوالہ نہیں دیتے۔ بلکہ ہمارا نام لکھ دیتے ہیں اس کے لیے ان کا شکر گذار ہوں۔ ڈان اردو پر چھپنے والے میرے بلاگز کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ یہ بیک وقت انگریزی اور سندھی میں بھی شائع ہوتے ہیں۔ انگریزی تراجم کے لیے میں مجی آدرش، ایاز لغاری کا بہت مشکور ہوں، جنھوں نے بلاگز کا بہت بڑا حصہ اردو سے انگریزی میں منتقل کیا۔ بعد میں ملازمت اور شادی کی وجہ سے وہ ترجمے کے لیے ناپید ہو گئے۔ اس کے بعد عارف انجم، حسین دادا اور غوث محی الدین نے یہ فرض نبھایا۔ سندھی ترجمے کے لیے ہمارے دوست ہمسفر گاڈھی قابل ستائش ہیں۔ جنھوں نے نہ صرف ہمارے بلاگز کا اردو سے سندھی میں ترجمہ کیا بلکہ ان کی اور ڈاکٹر علی کی ادارت میں شائع ہونے والے کثیر الاشاعت پندرہ روزہ سندھی رسالے افیئر میں شائع بھی کیے۔ میں صحافی جی ایم جمالی کا بھی مشکور ہوں جن کی معاونت کے بغیر شاید یہ کتاب شائع نہ ہوتی۔ بلاگز کا سلسلہ جاری ہے اور کبھی طبیعت لکھنے پر مائل نہ ہو تو ڈان ڈاٹ کام اردو کے ایڈیٹر منظر الٰہی اور ان کے معاون بلال مغل کے شکوے شروع ہو جاتے ہیں اور بلاگز کا سلسلہ دوبارہ سے شروع ہو جاتا ہے۔

بلاگ لکھنا بھی کوئی آسان کام نہیں لیکن اس کی کمپوزنگ مجھ جیسے انسان کے لیے بلاک لکھنے سے بھی زیادہ دشوار ہے، مگر چند ایک ساتھیوں جیسے کاشان کاشف، محسن سومرو اور ارشد سولنگی نے بھی بہت مدد کی۔ ان کا بھی شکریہ واجب ہے۔ لیکن جو بھی اس کتاب کو پڑھ کر بلاگ لکھنا چاہے وہ ضرور لکھے۔ حوالوں کی کتاب اور کمپوزر پر انحصار کرنے کے بجائے کتابیں پڑھنا اور خود ہی کمپوزنگ کرنا سیکھے، یہ ہی کامیابی کا بنیادی راز ہے۔

چارلس نیپیئر، ہرمزجی، روپ چند اور بن قاسم

کلفٹن کا علاقہ کب سے آباد ہے؟ اس کا نام کلفٹن کیوں ہے؟ یہ جاننے کے لیے ایک بہت وسیع اور مکمل تحقیق کی ضرورت ہے۔ لیکن ہم آپ کو یہ ضرور بتائے دیتے ہیں کہ چارلس نیپیئر، ہرمزجی، روپ چند اور بن قاسم کلفٹن کے ایک احاطے میں بڑے سکون سے رہتے ہیں۔

معاف کیجیے گا، چارلس نیپیئر کبھی یہاں رہتے تھے لیکن اب نہیں۔ باقی تینوں حضرات اب بھی موجود ہیں۔ ثبوت یہ کہ یہاں ان کے ناموں کی تختیاں لگی ہوئی ہیں۔ جیسا کہ ناموں سے ظاہر ہے، چاروں حضرات کا تعلق جدا جدا مذاہب سے ہے۔ پہلے صاحب اہلِ کتاب ہیں، دوسرے آتش پرست، تیسرے بت پرست اور چوتھے صاحب بت شکن ہیں۔ ان میں سے دو یعنی بن قاسم اور چارلس نیپیئر، ان دونوں میں ایک قدر مشترک ہے کہ دونوں صاحبان نے سندھ فتح کیا تھا۔ آج ہم جس معاشرے میں جی رہے ہیں وہاں دوسرے مذاہب کو تسلیم نہ کرنا، ان کی تعلیمات کو رد کرنا، ان کے ماننے والوں کو واجب القتل قرار دینا ایک عام سی بات ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ خود اپنے مذہب کے مختلف مکاتبِ فکر اور فرقوں سے وابستہ لوگوں کو نہ صرف واجب القتل قرار دیا جاتا ہے بلکہ قتل کر بھی دیا جاتا ہے۔ مسلمان تو اس حوالے سے ویسے ہی خاصے مشہور ہیں، لیکن ہندوستان میں آباد نیچ ذاتوں والے ہندوؤں سے اونچی ذات والے ہندو بھی کوئی اچھا سلوک نہیں کرتے۔ بعض اوقات تو مار بھی ڈالتے ہیں۔ ایسا کچھ وہاں آباد عیسائیوں کے ساتھ بھی ہوتا رہتا ہے۔

اب یہ ہے نا حیرت کی بات! عیسائی، پارسی، ہندو اور مسلمان کلفٹن کے اس احاطے میں ایک ساتھ کیسے بس رہے ہیں؟ پہلے ان چاروں حضرات کا کلفٹن کے حوالے سے تعارف ہو جائے، پھر بات کو آگے بڑھاتے ہیں۔

ہرمزجی کا پورا نام سر جہانگیر جی ہرمزجی کوٹھاری ہے؛ روپ چند تو روپ چند ہی ہیں، یہ 1930 میں سندھ کے پہلے ایڈیشنل جوڈیشل کمشنر تھے، اور بن قاسم کو تو آپ جانتے ہی ہوں گے، انھوں نے سندھ کو باب الاسلام ہونے کا 'شرف' بخشا تھا۔ موصوف نے حجاج بن یوسف کے حکم پر سندھ فتح کیا۔

روپ چند جی نے کلفٹن کے علاقے میں ساحل سمندر پر ایک پارک تعمیر کروایا تھا۔ جہانگیر جی ہرمز جی کوٹھاری نے ساحل سمندر تک پہنچنے اور اس کی لہروں سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایک راہ گزر یا سیر گاہ (Parade) تعمیر کروائی تھی اور ساحل سے سمندر تک لے جانے والا، ستونوں پر قائم ایک پلیٹ فارم یا پیئر، جس کا نام لیڈی لائیڈ پیئر (Lady Lloyd Pier) تھا۔

کلفٹن کتنا قدیم ہے؟ ایچ ٹی لیمبرک اپنی کتاب سر چارلس نیپئر اور سندھ (مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس 1952) کے صفحہ 40-339 پر چارلس نیپئر اور کلفٹن کا ذکر یوں کرتے ہیں:

> شدید گرمیوں کے موسم میں سر چارلس نیپئر اپنے خاندان کو کلفٹن کی ایک پہاڑی پر لے گئے جو بحیرۂ عرب کے ساتھ ہے۔ صحت افزا مقام کی ہونے کی وجہ سے یہاں چند گھر بنائے گئے تھے۔ لیکن لیڈی نیپئر یہاں پہنچ کر بیمار ہو گئیں۔ شوہر نے بالکل ایک نرس کی طرح تیمارداری کی۔ اُن کی بیٹی اور نواسی بھی بیمار پڑ گئیں۔ سر نیپئر کے اعصاب معمولات حکومت اور گھریلو مسائل کی وجہ سے جواب دے گئے۔ انھوں نے موسمِ سرما تک کام کرنے سے انکار کر دیا اور استعفیٰ دے دیا۔ حالانکہ انھیں کہا گیا تھا کہ وہ ستمبر تک اس عہدے پر برقرار رہیں۔ اگر وہ مزاحیہ انداز میں یہ ساری کہانی لکھتے تو اس طرح لکھ سکتے تھے کہ میں وہ شخص ہوں جو بچوں اور خواتین کی وجہ سے اس طرح پھنسا ہوا ہوں جیسے بنج پیازوں کے بیچ۔ کیا میرے اگلے چار ماہ ٹھیک رہیں گے؟ مجھے اس عظیم الشان انڈیا، اس کی ضرورتوں اور بدحکومتی سے چھٹکارا مل سکے گا؟

نیپئر کی بات تو مکمل ہوئی۔ آیئے اب ہرمز جی کی بنائی ہوئی راہ گزر یا پریڈ کا ذکر کرتے ہیں کہ اُس کی تعمیر کب اور کیوں ہوئی۔ یہ بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے، تو میرا خیال ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ ہر شاندار تاریخی تعمیر کے پیچھے بھی کسی نہ کسی عورت کا ہی ہاتھ ہوتا ہے۔ وہ کس طرح؟ کوریا سے تعلق رکھنے والی کیمی میرپو نے پاکستان میں 1960 کی دہائی میں ایک طویل عرصہ گزارا اور اپنی یادداشتوں کا ایک سفرنامہ آج کا پاکستان کے نام سے لکھا۔ اس سفرنامے کے صفحہ 59 پر لکھتی ہیں:

> لائیڈز پیئر کی بنیاد ایک خاتون نے رکھی تھی۔ نہایت پیاری خاتون، جو آنریبل لیڈی لائیڈ

تھیں۔ ہر سہ پہر کو جب سمندر سے خنک ہوا کلفٹن کی ریت سے گزرتی تو وہ، وکٹوریہ میں سوار، اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے ایک چکر لگاتی تھیں۔ سمندر کو جانے والی راہ پتھریلی تھی اور کہیں بھی ہموار نہیں تھی۔ پانی تک فاصلہ بھی بہت طویل تھا۔ اسی طرح ایک دن سیر کے دوران لیڈی لائیڈ کو ایک معزز پارسی رئیس سے ملنے کا اتفاق ہوا جن کا نام سر جہانگیر ہرمزجی کوٹھاری تھا۔ دونوں جلد ہی گہرے دوست بن گئے۔ کوٹھاری صاحب سمندر کے کنارے ایک چھوٹی سی پہاڑی پر تعمیر شدہ شاندار بنگلے میں رہتے تھے۔ لیڈی لائیڈ اور سر جہانگیر اس بنگلے کی بالکونی میں چائے پیتے۔ یہاں ہوا کا بہت زور ہوتا تھا۔ ایک دن دونوں یہیں بیٹھے تھے، لیڈی لائیڈ پتھریلے راستے پر سینکڑوں لوگوں کو چلتے دیکھ رہی تھیں اور ضرور سوچتی ہوں گی کہ پتھروں کی نوک سے ان کے پاؤں ضرور زخمی ہوتے ہوں گے۔ اس دلدوز نظارے کے بعد انھوں نے سر جہانگیر سے کہا کہ اگر یہاں باقاعدہ سڑک ہو تو ان بیچارے بے شمار لوگوں کو تکلیف نہ ہو جو یہاں تازہ ہوا کی تلاش میں آتے ہیں، جنھیں اتنی توفیق نہیں کہ وہ سمندر کے نزدیک گھر بنائیں۔

قابل احترام پارسی نے آنریبل لیڈی کی بات مان لی۔ اب وہ اس فکر میں تھے کہ یہ سب کچھ کیسے ہو۔ لیڈی نے سمجھایا کہ صرف ایک پیئر کی ضرورت ہے جو نیچے ساحل سے سمندر تک جائے۔ یہ بہت بڑی بات ہوگی اور اُن کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے امر ہو جائے گا۔ سر جہانگیر کو یہ تجویز پسند آگئی اور انھوں نے پیئر تعمیر کروادی، لیکن اپنے نام کی بجائے اپنی دوست کے نام پر۔ عوام کے لیے یہ راہ 23 مارچ 1921 کو کھول دی گئی۔ کلفٹن کے ساحل کو جاتے راستے پر ایک کتبے پر سیاح یہ الفاظ پڑھ سکتے ہیں: لیڈی لائیڈز پیئر۔

کوٹھاری صاحب نے تین لاکھ روپوں کی لاگت سے یہ پیئر اور پویلین تعمیر کروایا اور کراچی کے عوام کی نذر کر دیا۔ یہ تحفہ سر جہانگیر کی سخاوت اور عوامی جذبے کی مثال ہے۔ آج ہر شخص سرخ جودھپوری پتھر سے تعمیر کردہ اس پیئر کا لطف اٹھا سکتا ہے جو سیدھا نرم ریت کے ٹیلوں کی طرف لے جاتا ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے ہی ذکر کر چکے ہیں، یہاں ایک تختی روپ چند بالارام کے نام کی بھی لگی ہوئی ہے جو

1930 میں سندھ کے ایڈیشنل جوڈیشل کمشنر تھے۔ اس تختی پر تاریخ اور سن کا اندراج نہیں۔ وکی پیڈیا پر ان کے پوتے سُندر رشوداسانی لکھتے ہیں کہ یہ پارک سن 1900 میں ان کے دادا نے بنوایا تھا اور اس کی ایک پینٹنگ بھی ان کے پاس ہے۔ ہم نے بڑی کوشش کی کہ سُندر سے کوئی رابطہ ہو جائے، کم از کم پینٹنگ کا عکس ہی مل جائے، لیکن ناکامی ہوئی۔ پڑھنے والوں میں سے کسی کو اس بارے میں کوئی معلومات ہوں تو ہمیں ضرور آگاہ کریں۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ بن قاسم، یعنی محمد بن قاسم، نے 712 عیسوی میں سندھ فتح کیا، لیکن اس کے بعد خود ان کے ساتھ کیا ہوا بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ سندھی ادبی بورڈ کی کتاب چچ نامہ (اشاعت 2008) کے صفحہ 4-242 پر جو کچھ درج ہے اس کا مختصر احوال آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:

راجہ داہر کے قتل ہونے کے بعد ان کی دو بیٹیاں گرفتار ہوئیں جنھیں محمد بن قاسم نے دارالخلافہ دمشق بھیج دیا۔ چند دن کے بعد خلیفۃ المسلمین کے دل مبارک میں خیال آیا۔ دونوں کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ بڑی کا نام سریادیوی اور چھوٹی کا پرل دیوی تھا۔ حسب معمول خلیفہ ولید بن عبدالملک سریادیوی کے حسن و جمال پر لٹو ہو گئے۔ سریادیوی کو اپنی طرف کھینچا تو وہ تلملا کر کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی، بادشاہ قائم رہے، یہ کنیز بادشاہ کے خلوت کے قابل نہیں، امیر عادل عمادالدین محمد بن قاسم نے ہمیں تین دن اپنے پاس رکھنے کے بعد یہاں بھیجا ہے۔ کیا تمھارا یہی دستور ہے؟

غصّے کی وجہ سے خلیفہ کو تحقیق اور تصدیق کا ہوش نہ رہا، فوراً ہی کاغذ قلم منگوا کر پروانہ لکھا کہ محمد بن قاسم جہاں بھی ہو، اس پر لازم ہے کہ خود کو کچی کھال میں بند کرا کے دارالخلافہ کو واپس ہو۔ جب محمد بن قاسم کو فرمان اودھ پور کے شہر میں موصول ہوا تو انھی کے کہنے پر انھیں کچی کھال میں لپیٹ کر اور صندوق میں رکھ کر دارالخلافہ (دمشق) لے جایا گیا۔ راہ میں محمد بن قاسم نے اپنی جان خدائے پاک کے حوالے کی۔ صندوق خلیفہ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ خلیفہ نے راجہ کی بیٹیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ دیکھو ہمارا حکم ہمارے ماتحتوں پر اس طرح جاری ہوتا ہے۔ راجہ کی بیٹی چنگی نے بادشاہ کو کہا کہ محمد بن قاسم نے ہم کنیزوں پر کوئی دست درازی نہ کی تھی، ہم نے انتقاماً جھوٹ بولا تھا۔ اس نے ہمیں بادشاہت سے گرا کر قدامی کے درجے پر پہنچایا تھا۔ آخر میں مصنف جو لکھتا ہے وہ جوں کا توں آپ کی

خدمت میں پیش ہے:

محمد بن قاسم کی عقل و ہمت یاوری کرتی تو ایک دن کی باقی ماندہ مسافت تک چل کر آتا۔ پھر خود کو چمڑے میں بند کرواتا۔ جہاں یہ جب تحقیق ہوتی تو آزاد ہو جاتا۔ یوں برباد نہ ہوتا۔

محمد بن قاسم کے سندھ فتح کرنے کے صدیوں بعد سر جہانگیر ہرمزجی اور روپ چند بالا رام نے پارک اور کوٹھاری پریڈ تعمیر کروایا لیکن ان دونوں پر فتح محمد بن قاسم کو ہی حاصل ہوئی۔ کوٹھاری پریڈ کی تختیاں پارک کے شروع میں لگی ہوئی ہیں جبکہ روپ چند پارک کی تختی کوٹھاری پریڈ کے پچھلے حصے میں لگی ہوئی ہے جسے کوئی اہل نظر ہی دیکھ پاتا ہے۔ ہمارے دوست حسن منصور کی ایک خبر کے مطابق:

22 جولائی 2005 کو ایک بہت بڑے پارک کی تعمیر کا آغاز ہوا۔ ایک اندازے کے مطابق یہ پارک پاکستان کا سب سے بڑا پارک ہے۔ اس پارک کا رقبہ 130 ایکڑ ہے۔ اس کی تعمیر پر 500 ملین روپے کے اخراجات آئے۔ آج کراچی میں لوگ بن قاسم پارک کو تو جانتے ہیں لیکن سر جہانگیر ہرمزجی اور روپ چند بالا رام کون تھے، اس کے بارے میں انھیں شاید ہی کوئی معلومات ہوں۔

معروف تاریخ داں ڈاکٹر مبارک علی، محمد بن قاسم اور راجہ داہر کے درمیان جنگ کو کفر و اسلام کی جنگ نہیں سمجھتے۔ ان کا کہنا ہے کہ راجہ داہر کی فوج میں محمد علافی کی سربراہی میں مسلمانوں کا ایک گروہ شامل تھا۔ ان کا مزید کہنا ہے کہ یہ بات درست نہیں کہ محمد بن قاسم کی فوج میں چھوٹی ذاتوں کے ہندو بھی شامل تھے۔ بن قاسم کے سندھ فتح کرنے کے بعد، بلکہ ابتدائی فتوحات کے بعد ہی، مقامی آبادی کے بعض غریب اور بیروزگار افراد بھی عرب فوج میں شامل ہو گئے۔ ان کے مطابق عربوں نے قدیم مراعات یافتہ طبقے کی رہنمائی میں حکومت کرنا شروع کی جس کی وجہ سے نچلی ذاتوں، طبقوں اور قبیلوں کے ساتھ پرانے رویے کو باقی رکھا گیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معاشرے کے نچلے طبقوں کے حقوق کا کوئی پاس نہیں کیا گیا اور اس بات کی کوئی کوشش نہیں کی گئی کہ ان پر پچھلی حکومتوں کے زمانے میں جو ذلت آمیز شرائط عائد کی گئی تھیں انھیں ختم کر کے معاشرے میں باعزت مقام دیا جائے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ڈاکٹر صاحب کا کہنا صحیح ہے، اور یقیناً صحیح ہی ہوگا، تو پھر محمد بن قاسم فاتح تھے، جارح تھے یا اسلام پھیلانے آئے تھے؟

ناؤمل: غدار یا محسنِ سندھ؟

سندھ کی تاریخ کتنی پرانی ہے اور کیا ہے، اس پر بے شمار لوگ بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ یہاں تین ہزار سال قبل مسیح کے موئن جودڑو کے آثار بھی ہیں تو جنوبی سندھ کے شہر میر پور خاص میں کاؤ جودڑو جیسا تاریخی ورثہ بھی موجود ہے۔ موئن جودڑو تو بچ گیا لیکن کاؤ جودڑو کے ساتھ کیا ہوا، اس پر پھر کبھی لکھیں گے۔

سیٹھ ناؤمل ہوت چند سندھ کی تاریخ کا ایک ایسا کردار ہے کہ اگر اس کا نام حذف کر دیا جائے تو سندھ کی تاریخ ادھوری رہ جائے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ناؤمل وہ شخص تھا جس نے سندھ پر انگریزوں کے قبضے کے لیے ان کی مکمل مدد کی۔

اس نے ایسا کیوں کیا؟ مالی فائدے کے لیے؟ انگریز سرکار کی جانب سے کوئی خطاب حاصل کرنے کے لیے؟ یا اس کے والد سیٹھ ہوت چند کے ساتھ میروں کی حکومت میں جو کچھ ہوا تھا اس کا بدلہ لینے کے لیے؟ ان تمام باتوں پر آگے چل کر بات کریں گے لیکن ایک حقیقت ہمیں ذہن میں رکھنی ہوگی کہ میروں کی حکومت کے خاتمے کے بعد جب سندھ میں انگریزوں کا راج قائم ہوا تو ایک جدید سندھ نے جنم لیا۔ شہری علاقوں میں روڈ راستے بنے، بجلی آئی، اسکول اسپتال بنے، ریلوے کے نظام نے جنم لیا، جدید نہری نظام اور بہت کچھ نیا متعارف ہوا۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ نہری نظام انگریز نے ریونیو حاصل کرنے کے لیے بنایا، ریلوے افغانستان تک فوجی ساز و سامان پہنچانے کے لیے اور اسکول و اسپتال براؤن صاحبوں کے لیے (جو گورے صاحبوں کے حاشیہ بردار تھے)۔ انگریزوں کی دیکھا دیکھی ہندوؤں اور پارسیوں نے بھی ایسے بے شمار فلاحی ادارے قائم کیے جس کے بعد مسلمانوں کو بھی ایسے ادارے قائم کرنے کا خیال آیا اور انھوں نے فلاحی اور تعلیمی ادارے قائم بھی کیے۔

قصہ طویل ہو گیا، اب آتے ہیں اصل موضوع کی طرف، یعنی سیٹھ ناؤمل ہوت چند کون تھے اور کیوں غدار وطن ٹھہرے؟ محمد عثمان دموہی اپنی کتاب کراچی تاریخ کے آئینے میں (دوسری اشاعت 2013) میں ہوت چند کے حوالے سے لکھتے ہیں:

اس شخص کی دولت، جاگیر اور مرتبہ حاصل کرنے کی ہوس کی وجہ سے سندھ کے وطن پرست

مسلمانوں اور ہندوؤں کو نہ صرف آزادیٔ وطن سے محروم ہونا پڑا بلکہ غلامی کی صعوبتوں کو بھی برداشت کرنا پڑا۔ اس شخص نے انگریزوں کو سندھ پر قابض کرانے میں میرانِ سندھ کے خلاف مکروفریب اور دغابازی کا دلیرانہ مظاہرہ کیا۔

ناؤمل کے خاندانی پس منظر کے بارے میں لکھتے ہیں:

وہ 1729 میں کراچی شہر کی بنیاد رکھنے والے مشہور ہندو تاجر بھوجومل کا پڑپوتا تھا جو 1804 میں کراچی کے قدیم محلے کھارادر میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ہوت چند بھی ایک مشہور تاجر تھا۔ اس کا کاروبار نہ صرف سندھ بلکہ ہندوستان، افغانستان، ایران اور مسقط تک پھیلا ہوا تھا۔ سندھ کے جو ہندو تاجر میرانِ سندھ کو قرض فراہم کرتے تھے ان میں اس کا نام بھی شامل تھا۔ اس کی حیدرآباد کے دربار تک رسائی تھی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنا بااثر ہونے کے باوجود ناؤمل کے خاندان کے ساتھ ایسا کیا ہوا کہ ناؤمل نے سندھ پر انگریزوں کا قبضہ کروایا؟ سیٹھ ناؤمل کی کتاب یادگیریوں (یادداشتیں؛ تیسری اشاعت سندھی ادبی بورڈ 1996) سندھ میں اس دور کے واقعات پر مشتمل ہے۔ سندھی میں لکھی گئی یہ یادداشتیں بعد میں انگریزی میں ترجمہ کروائی گئیں اور 1915 میں پہلی بار یہ کتاب انگریزی میں شائع ہوئی۔ بعد میں اسے دوبارہ سندھی میں ترجمہ کیا گیا۔ اس کے صفحہ 89 پر ناؤمل لکھتے ہیں:

1831-2 کی بات ہے کہ نصرپور کے ایک ہندو مزدور کا بیٹا اپنے استاد کی سختیوں سے تنگ آکر ایک مسجد کے دروازے کے قریب جا کھڑا ہوا۔ کچھ مسلمانوں کی اس پر نظر پڑی۔ وہ اسے مسجد میں لے گئے۔ اس پر غصے میں آکر ہندو دکانداروں نے اپنی دکانیں بند کر دیں اور مسلمانوں کو سودا سلف دینے سے انکار کر دیا۔ مسلمانوں نے انتقامی طور پر لیاری میں موجود پانی کے کنوؤں میں گندگی ڈال دی۔ ان کنوؤں سے ہندو پینے کا پانی بھرتے تھے۔

دوسرے دن نورل شاہ نامی ایک سید نے ہمارے محلے سے گزرتے ہوئے گالیاں دیں۔ میرا چھوٹا بھائی پرسرام جو اس محلے کے بیرونی دروازے پر کھڑا تھا، اس نے نورل شاہ کو نرمی سے سمجھایا کہ اس طرح کی بات مناسب نہیں۔ دونوں میں تلخ کلامی ہوئی اور جوش میں آکر نورل شاہ نے کہا کہ پرسرام نے میرے پیغمبر کی شان میں گستاخی کی ہے۔

مسلمانوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔

بعد میں نورل شاہ نے قرآن گلے میں ڈال کر سندھ کے مختلف شہروں کا دورہ کیا اور لوگوں کو بھڑکایا۔ اس دوران کسی طریقے سے میرا بھائی پرسرام جیسلمیر [راجستھان] منتقل ہو گیا۔ معاملہ اس وقت سندھ کے حاکم میر مراد علی تالپور تک پہنچا۔ مسلمانوں کا دباؤ تھا، میر صاحب نے میرے والد ہوت چند کو فرمان بھیجا کہ سیٹھ پرسرام کو حیدرآباد روانہ کیا جائے۔ پرسرام کراچی میں نہیں تھا۔ میر صاحب نے دوسرا فرمان بھیجا کہ ہوت چند خود حاضر ہو۔ میرے والد حیدرآباد پہنچے۔ میر صاحب نے جھگڑے کے حل کے لیے معاملہ نصرپور کے قاضی کی عدالت میں بھیجا۔ [نصرپور حیدرآباد سے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹا سا شہر ہے۔] قاضی نے معاملہ سننے سے انکار کر دیا۔ مسلمانوں نے اس کے بعد اچانک حملہ کر کے سیٹھ ہوت چند کو اغوا کر لیا۔ وہ دس سے بارہ دن مسلمانوں کی تحویل میں رہے جنھوں نے انھیں زبردستی مسلمان کرنے کا ارادہ کیا (مراد یہ ہے کہ ان کی ختنہ کرنے کی کوشش کی) لیکن چونکہ ان کی عمر 50 سال تھی اور ان کی ختنہ کرنا قرآن کے بھی خلاف تھا، اس کے علاوہ مسلمانوں کا یہ خوف بھی تھا کہ اس کے نتائج خطرناک بھی ہو سکتے ہیں، اس لیے وہ اپنے اس ارادے سے باز رہے۔ بعدازاں میر مراد علی کو پچھتاوا ہوا اور میرے والد کی بازیابی کا حکم جاری کیا۔ جس کے بعد میرے والد کو رہائی ملی۔

اس وقت سندھ میں عام تاثر یہ تھا کہ سیٹھ ہوت چند کی ختنہ کر دی گئی تھی۔ ناؤمل کی یادداشتوں میں یہ واقعہ خاصی تفصیل سے درج ہے، ہم نے اس کا مختصر خلاصہ پیش کیا ہے۔

تقسیم سے قبل سندھ کی ہندو برادری بہت زیادہ امیر تھی اور سندھ کے وڈیرے اور جاگیردار تو چھوٹی بات، حکمران خاندان تک ان کا مقروض ہوتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود انھیں وہ سماجی رتبہ حاصل نہ تھا جو مسلمانوں کو حاصل ہوتا تھا۔ جیمز برنس کے مطابق، ''سندھ میں ہندوؤں کو گھوڑے کی سواری منع ہے، اس لیے دولت مند تاجر بھی گدھے کی سواری کرتے نظر آتے ہیں۔ ہندوؤں کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اگر کسی مسلمان کی سواری گزرے تو اس کے راستے میں ادب سے ایک طرف کھڑے ہو جائیں۔''

ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتاب سندھ خاموشی کی آواز میں لکھتے ہیں کہ سیٹھ ہوت چند کا خاندان سندھ کا ممتاز ہندو خاندان تھا، اس لیے جب اس خاندان کے سربراہ کے ساتھ یہ ذلت آمیز سلوک ہوا، اسے اغوا کیا گیا، قید میں بھوکا پیاسا رکھا گیا اور بعض شواہد کی بنا پر اس کی ختنہ بھی کر دی گئی، تو ان واقعات کا اثر اس کے خاندان کے افراد اور سندھ کے ہندوؤں پر زبردست ہوا۔ یہ تھی وہ صورت حال جس نے یقیناً ناؤمل اور دوسرے ہندوؤں میں عدم تحفظ کے احساس میں شدت پیدا کی ہوگی۔

ناؤمل کی انا کو زبردست ٹھیس لگی ہوگی۔ غالباً اسی بنا پر اس نے میروں کی حکومت کے خاتمے میں انگریزوں کی مدد کی ہوگی۔ ہمارے خیال میں تن تنہا ناؤمل پر یہ الزام لگانا کہ اس نے میروں کی حکومت کا خاتمہ کروایا، زیادتی ہوگی۔ میران سندھ کی حکومت تین حصوں یعنی حیدرآباد، میرپور خاص اور خیرپور میں تقسیم تھی۔ وہ کاروبار مملکت چلانے کے لیے ہندو تاجروں کے قرضوں کے محتاج تھے۔ ان کی کوئی باضابطہ تربیت یافتہ فوج نہیں تھی۔ ان تمام عوامل کے سبب انگریزوں کا سندھ پر بآسانی قبضہ ہوگیا۔

انگریزوں نے ناؤمل کی خدمات کے اعتراف میں اسے اعزازات سے بھی نوازا۔ برطانوی دور حکومت کے ایک اہلکار خداداد خان اپنی تالیف لُبِّ تاریخ سندھ، (پہلی اشاعت 1900، دوسری اشاعت 2009، سندھی ادبی بورڈ) میں لکھتے ہیں:

> سی آئی ای (CIE) کے لقب کا تمغہ جو انگریز سرکار نے سیٹھ ناؤمل کے لیے بھیجا تھا، فریئر محل عرف فریئر ہال میں ایک شاندار دربار منعقد کر کے سیٹھ ناؤمل کو اپنے ہاتھ سے دیا۔ اس موقع پر انھوں نے جو خطاب کیا وہ خاصا طویل ہے ہم اس کا خلاصہ پیش کیے دیتے ہیں۔ انھوں نے کہا، میں نہایت خوشی سے یہ تحریر تمھارے سپرد کرتا ہوں۔ تم نے انگریز سرکار کی زبردست خدمت کی ہے۔ ملکہ معظمہ نے بڑی شفقت سے تمھیں سی آئی ای (کمپینیئن آف دی موسٹ ایگزالٹڈ آرڈر آف دی اسٹار آف انڈیا) کا لقب عطا کر کے عزت بخشی ہے۔ سال 1843 میں جب سندھ کے میر صاحبان اور انگریز سرکار کے بیچ لڑائی ہوئی، اگرچہ اس وقت تمھیں سخت جانی و مالی خطرہ تھا، تاہم تم نے کوشش کر کے میر صاحبان سے متعلق ایسی ایسی خبریں اور ایسی تجاویز پیش کیں جن کے مطابق انگریز سرکار کے عملدار اپنے لشکر میں تبدیلی کر سکیں۔ ان خدمات کے عوض تمھیں جاگیر اور پنشن عطا کی گئی۔"

ڈاکٹر مبارک علی اپنے مضمون ''کیا ناؤمل غدار تھا؟'' کے آخر میں لکھتے ہیں: ''معاشرے میں اقلیت کا کردار بڑا نازک ہوتا ہے۔ اگر اقلیت مالی اور اقتصادی لحاظ سے خوشحال ہو تو اس کے دشمنوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اکثر اقلیت کو وطن دشمن اور غدار کہا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں معاشرہ اندرونی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے اور اقلیت ملک و قوم کی محبت سے دور ہوتی چلی جاتی ہے۔ ہندوستان اور سندھ میں انگریزی حکومت کے قیام میں اقلیتوں کے عدم تحفظ کو بڑا دخل تھا۔''

ناؤمل کا انتقال 73 سال کی عمر میں 16 ستمبر 1878 کو کراچی میں ہوا۔ ان کی یادداشتوں پر مبنی کتاب کا دوسرا ایڈیشن آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے 1986 میں شائع کیا، تاہم کتاب کے تعارف میں بھی انھیں غدار ہی لکھا گیا ہے۔

کون سے قائداعظم؟

پچھلے ہفتے ایڈیٹر صاحب نے فرمان صادر کیا کہ اختر بھائی، قائداعظم کا یوم پیدائش قریب آرہا ہے، اس بار کی قسط مزار قائد پر ہو جائے۔ ہم نے بھی ہامی بھر لی بلکہ تھوڑی شرمندگی بھی ہوئی کہ اتنے دن ہو گئے، بابا جی کی خدمت میں حاضری کی فرصت ہی نہ مل پائی۔

ہمارے بچپن میں قائداعظم کا مزار ایک ایسا مقام تھا جہاں کم سے کم وقت اور پیسوں میں پہنچا جا سکتا تھا۔ شروع میں تو داخلے کی کوئی فیس نہ تھی، لیکن آہستہ آہستہ نہ صرف فیس ادا کرنی پڑی بلکہ اب تو خاندان کے ہر فرد کے لیے ٹکٹ لینا پڑتا ہے۔ جیسے ہی آپ پیدل یا اپنی گاڑی میں مزار کے احاطے میں داخل ہوں گے، آپ کے ہمراہ تمام لوگوں کی گنتی کی جائے گی اور ہر فرد کے حساب سے 20 روپے کا ٹکٹ دیا جائے گا۔ موٹر سائیکل کھڑی کرنے کی فیس 20 روپے ہے جبکہ دیگر گاڑیوں کے علیحدہ علیحدہ ریٹس ہیں۔ پارکنگ ایریا میں ایک بورڈ بھی نصب ہے جس پر واضح طور پر لکھا ہے کہ گاڑی میں کسی ٹوٹ پھوٹ کی ذمہ داری انتظامیہ پر عائد نہ ہوگی۔ جب آپ واپس لوٹیں گے تو واپسی کے گیٹ پر موجود اہلکار آپ سے ٹکٹ واپس لے لیں گے۔ ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ہم نے اہلکار کو بتایا کہ یہ ٹکٹ ہمیں دفتر جمع کروانے ہوں گے۔ اہلکار نے ناخوشگوار لہجے میں پوچھا: کیوں؟ ہم نے کہا کہ اوّل تو پیسے لینے ہیں۔ دوم اس بات کی سند رہے کہ ہم یہاں آئے تھے۔ اہلکار نے داخلہ اور پارکنگ ٹوکن کے کونے پھاڑ کر ہمیں لوٹا دیے۔

بہرحال، ہم نے مزار قائد پہنچنے کے لیے مرکزی راستے کے بجائے اس سے متصل ایک اور راستہ اختیار کیا۔ لیکن چند ہی لمحوں بعد اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ یہ ایک انتہائی ناہموار اور بے ترتیب راستہ تھا۔ خیر، ہم مزار قائد کے مرکزی دروازے پر پہنچ گئے۔ شام کا وقت ہو چکا تھا۔ مزار پر تعینات گارڈز معمول کے مطابق پاکستانی پرچم اتار رہے تھے۔ ہم اس کارروائی کی تصویریں بنا رہے تھے کہ اچانک زور زور سے سیٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ دیکھا تو ایک باریش عمر رسیدہ شخص چند لوگوں کو اشارے سے بلا رہا تھا۔ ہم تصویریں بنا چکے تھے، سو چا دیکھیں ماجرا کیا ہے۔ بحث ہو رہی تھی۔ طلب

کیے جانے والے افراد نے پوچھا: کیا مسئلہ ہے؟ اس نے کہا: جوتے جمع کراؤ اور ٹوکن لو۔ (ٹوکن لو کے معنی ہیں پیسے دو۔) اس نے کہا: اور تم خود جو جوتے پہن کر یہاں کھڑے ہو، کیوں؟ تو اس نے کہا: ہمارا مرضی۔ خیر، دو ایک لوگوں نے بیچ میں پڑ کر معاملہ نمٹا دیا۔ اچانک میرے عقب میں کوئی سرگوشی میں بولا: نوٹ پر تو قائداعظم چھاپ دیا۔ اس کمائی سے دل نہیں بھرا، اب یہ کمائی کر رہے ہیں۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ قائداعظم کے ساتھ ہم نے کیا کیا ہے۔

کمال کی بات یہ ہے کہ مزار قائد کی تعمیر کا نقشہ بھی ایک ہندوستانی آرکیٹیکٹ کا بنایا ہوا ہے۔ مزار کے لیے کل چار نقشے تیار کیے گئے تھے اور ان چاروں میں سے کوئی آرکیٹیکٹ بھی پاکستانی نہ تھا۔ ایک نقشہ ترک آرکیٹیکٹ اے واصفی ایگلی، دوسرا ہندوستانی آرکیٹیکٹ نواب زین یار جنگ، اور تیسرا برطانوی آرکیٹیکٹ راگلن اسکوائر نے تیار کیا تھا۔ یہ تینوں نقشے رد کر دیے گئے۔ بالآخر دسمبر 1959 میں مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کی خواہش پر نقشے کی تیاری کا کام ایک اور ہندوستانی آرکیٹیکٹ یحییٰ مرچنٹ کو دیا گیا۔

معروف صحافی غلام محی الدین اپنے ایک مضمون میں مزار کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ مزار کے ڈیزائن کا بنیادی کام 28 جنوری 1960 کو مکمل ہو گیا تھا۔ تعمیراتی کام کا باقاعدہ آغاز 8 فروری 1960 کو ہوا۔ 31 جولائی 1960 کو اس وقت کے صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے مزار کا سنگ بنیاد رکھا۔ 31 مئی 1966 کو مزار کا بنیادی ڈھانچہ مکمل ہو کے 12 جون 1970 کو عمارت کو سنگ مرمر سے آراستہ کرنے کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ 23 دسمبر 1970 کو چین کے مسلمانوں کی جانب سے بطور تحفہ بھیجا گیا 81 فٹ لمبا فانوس گنبد میں نصب کیا گیا۔ مزار کی تعمیر پر ایک کروڑ 48 لاکھ روپے کی لاگت آئی جو اس زمانے میں ایک خطیر رقم تھی۔ مزار کا کل رقبہ 116 ایکڑ مرکزی رقبہ 61 ایکڑ اطراف کے 55 ایکڑ پر مشتمل ہے۔ مزید لکھتے ہیں کہ مزار کے 5 دروازے ہیں، ایم اے جناح روڈ پر واقع دروازے کا نام باب جناح، شاہراہ قائدین پر واقع گیٹ کا نام باب قائدین، مشرقی جانب واقع دروازے کو باب تنظیم، شمالی جانب واقع گیٹ کو باب امام اور پرانی نمائش پر واقع گیٹ کو باب اتحاد کا نام دیا گیا ہے۔

مزار کے مشرقی حصے میں ایک کمرے کے اندر پانچ قبریں ہیں۔ مزار قائد پر فاتحہ خوانی پر جانے والوں کی اکثریت اس کمرے تک نہیں پہنچ پاتی، اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس کمرے میں جانے پر اور وہاں

موجود قبروں پر فاتحہ خوانی کرنے کی پابندی ہے بلکہ لوگوں کی ان قبروں کی وہاں موجودگی کے بارے میں لاعلمی ہے۔ یہ قبریں معمولی افراد کی نہیں بلکہ ان کے سیاسی سفر میں شریک رفقائے کار کی ہیں۔ ان میں سب سے پرانی قبر نواب لیاقت علی خاں کی ہے، دوسری قبر سردار عبدالرب نشتر کی ہے، تیسری قبر محترمہ فاطمہ جناح کی ہے، چوتھی قبر محمد نورالامین کی ہے اور پانچویں بیگم رعنا لیاقت علی خاں کی ہے۔ رعنا لیاقت علی خاں کی قبر کے سوا باقی چار قبروں پر کتبے بنگالی زبان میں بھی درج ہیں۔

قائداعظم محمد علی جناح برصغیر پاک و ہند کی وہ شخصیت تھے کہ جن کی پیدائش سے لے کر وفات تک ہر شخص نے ان کی تاریخ پیدائش، جائے پیدائش، شادی مذہب کے بارے میں اپنے اپنے انداز میں لکھا ہے۔ حالیہ دور میں پاکستان کی درسی کتابوں میں ان کی جائے پیدائش وزیر مینشن کراچی لکھی جاتی ہے، لیکن ماضی کی درسی کتابوں میں ان کی جائے پیدائش ضلع ٹھٹھہ کا ایک علاقہ جھرک لکھی گئی ہے۔

مٹھی بائی اور جناح بھائی پونجا کے سات بچوں میں محمد علی جناح سب سے بڑے تھے۔ ان کے تین بھائی احمد علی، بندے علی اور رحمت علی تھے جبکہ تین بہنیں مریم، فاطمہ اور شیریں تھیں۔ سندھ مدرسۃ الاسلام کے ریکارڈ میں ان کا نام محمد علی جناح بھائی اور شہر پیدائش کراچی درج ہے۔

جناح صاحب کی پرائمری تعلیم کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں لیکن ٹھٹھہ ضلع کے گاؤں جھرک کے لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ وہاں پیدا ہوئے۔ واضح رہے کہ سندھ کے قدیم ترین پرائمری اسکولوں میں سے ایک جھرک میں واقع ہے جو کہ سندھ مدرسۃ الاسلام سے بھی 15 برس پہلے قائم ہوا اور ابھی تک چل رہا ہے۔ جھرک کے بزرگ شہریوں کا دعویٰ ہے کہ جناح نے پرائمری تعلیم وہیں حاصل کی اور یہ بھی کہ اسکول کے ریکارڈ میں ان کی تاریخ پیدائش 20 اکتوبر 1875 درج تھی۔ یہ ریکارڈ مبینہ طور پر 1960 کے بعد حیدرآباد ڈویژن کے کمشنر نے اپنی تحویل میں لے لیا جو کہ آج تک واپس نہیں کیا گیا۔

یہ ون یونٹ کا دور تھا جب لوگوں کی شناخت، زبانوں، صوبائی حدود اور حتیٰ کہ ملک کے دارالخلافہ اور حلیے تک کو تبدیل کیا جا رہا تھا۔ ون یونٹ پروجیکٹ کی تکمیل کے لیے تاریخ کو تبدیل کرنا بہت ضروری تھا چنانچہ سب کچھ ازسرنو تیار ہو رہا تھا۔ خدا خدا کر کے ون یونٹ پورا ہوا تو ملک آدھا رہ گیا۔ 1960 تک کی جو کتابیں اور دستاویزات تلف ہونے سے بچ گئیں ان میں جناح صاحب کی کوئی واضح تاریخ پیدائش تو درج نہیں البتہ کہیں کہیں یہ کہا گیا ہے کہ وہ "کوئی پونے ایک سو برس قبل" جھرک

کے قریب کسی چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے۔

اگست 1960 میں سندھی ادبی بورڈ کے زیر اہتمام شائع کردہ سندھی زبان میں ساتویں جماعت کی نصابی کتاب کا دوسرا سبق قائداعظم محمد علی جناح کے بارے میں ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ان کے والد ایک غریب تاجر تھے۔ اسی سبق میں مزید یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جناح ''سیٹھ نور محمد لالن والوں سے تین ہزار روپے قرض لے کر ولایت میں بیرسٹری پڑھنے کے لیے گئے تھے۔''

اب آتے ہیں ایک اور معاملے کی جانب؛ وہ ہے قائداعظم کی تقاریر کا جن میں ایک جانب تو وہ سیکولر نظر آتے ہیں جب کہ دوسری جانب مذہبی۔ گورنر جنرل کی حیثیت سے انھوں نے 11 اگست 1947 کو اس وقت کی قانون ساز اسمبلی سے جو خطاب کیا تھا اس سے ظاہر تھا کہ پاکستانی ریاست کی بنیاد سیکولر ہوگی۔ لبرل فورم پاکستان کے اگست 2012 میں شائع کردہ کتابچے قائداعظم کا دستور ساز اسمبلی سے خطاب (کے صفحہ 11 اور 12 پر اس خطاب کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے:

> ''آپ آزاد ہیں، آپ مکمل آزاد ہیں کہ اپنے مندروں میں جائیں۔ آپ کو پوری آزادی ہے کہ اپنے مسجدوں کا رُخ کریں یا پاکستان کی ریاست میں جو بھی آپ کی عبادت گاہیں ہیں ان میں آزادی سے جائیں۔ آپ کا کوئی بھی مذہب، ذات یا مسلک ہو سکتا ہے۔ ریاست کے امور کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔۔۔۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ہندو ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے۔ میں یہ بات مذہبی معنوں میں نہیں کہہ رہا ہوں، کیونکہ یہ تو ہر فرد کے نجی عقیدوں کا معاملہ ہے۔ بلکہ ریاست کے باشندے ہونے کی بنا پر سیاسی معنوں میں۔''

11 اگست 1947 کی اس تقریر سے مذہبی جماعتوں کو یہ فکر لاحق ہوگئی کہ جناح پاکستان کو ایک غیر مذہبی، آزاد اور روشن خیال ملک بنانا چاہتے ہیں۔ یہ جماعتیں جناح صاحب کو نہ تقسیم سے قبل سمجھ پائی تھیں نہ بعد میں۔ اگر یہ جماعتیں صرف قائداعظم کی دوسری شادی اور ان کی بیٹی کی پسند کی شادی پر غور کرتیں تو شاید ان کی سمجھ میں بات آجاتی۔ معروف محقق عقیل عباس جعفری اپنی کتاب قائداعظم کی ازدواجی زندگی کے صفحہ 39-40 پر لکھتے ہیں:

دارجیلنگ واپس آنے کے بعد ایک شام محمد علی جناح سر ڈنشا پٹیٹ کے پاس پہنچے اور ادھر

ادھر کی باتوں کے بعد ان سے پوچھنے لگے: مختلف فرقوں کے افراد کے مابین شادیوں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ سر پیٹٹ نے، جو صورت حال سے بالکل بے خبر تھے، بہت زور دے کر اپنی رائے کا اظہار کیا کہ ایسی شادیوں سے قومی یگانگت اور یکجہتی میں خاصہ اضافہ ہوگا اور ہوسکتا ہے کہ انجام کار یہی شادیاں فرقہ وارانہ منافرت کا آخری حل ثابت ہوں۔ جناح اس سے بہتر جواب کی توقع نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے بحث پر مزید الفاظ ضائع کیے بغیر اپنے بوڑھے دوست سے دوٹوک الفاظ میں کہا: میں آپ کی بیٹی سے شادی کا آرزومند ہوں۔ سر ڈنشا سکتے میں رہ گئے، ان کو اندازہ نہ تھا کہ ان کی رائے کے خود ان کی ذات پر کوئی اثرات مرتب ہوں گے۔ انھیں سخت طیش آ گیا اور ایسی کسی بات کو سوچنے تک سے انکار کر دیا جو ان کے نزدیک لغو اور مضحکہ خیز تھی۔

لیکن جب قائداعظم کی بیٹی دینا نے ایک پارسی سے شادی کرنا چاہی تو انھوں نے بھی سراسر انکار کر دیا۔

ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ 11 اگست والی تقریر کے فقط 6 ماہ بعد 25 جنوری 1948 کو اپنے اعزاز میں بار ایسوسی ایشن کراچی کی جانب سے دیے گئے استقبالیے سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا کہ وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ لوگوں کا ایک طبقہ جو دانستہ طور پر شرارت کرنا چاہتا ہے یہ پروپیگنڈا کر رہا ہے کہ پاکستان کے دستور کی اساس شریعت پر استوار نہیں کی جائے گی، انھوں نے فرمایا کہ آج بھی اسلامی اصولوں کا زندگی پر اسی طرح اطلاق ہوتا ہے جس طرح 13 سو برس پہلے۔

گورنر جنرل پاکستان نے فرمایا کہ کچھ لوگ اس پروپیگنڈے سے گمراہ ہو گئے ہیں، میں انھیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ غیر مسلموں کو بھی خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، اسلام اور اس کے اعلیٰ نصب العین نے جمہوریت کا سبق پڑھایا ہے۔ اسلام نے ہر شخص کو مساوات، عدل اور انصاف کا درس دیا ہے، کسی کو جمہوریت، مساوات اور حریت سے خوفزدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے جبکہ وہ دیانت کے اعلیٰ ترین معیار پر مبنی ہو اور اس کی بنیاد ہر شخص کے لیے انصاف اور عدل پر رکھی گئی ہو۔

(قائداعظم محمد علی جناح تقاریر و بیانات بحیثیت گورنر جنرل پاکستان 48-1947، شائع کردہ حکومت پاکستان وزارت اطلاعات و نشریات اسلام آباد)۔

قائداعظم کی زندگی کا ایک اور تنازع یہ ہے کہ انھوں نے قیام پاکستان کے بعد عیدالفطر اور

عیدالاضحیٰ کی نمازیں کس کی امامت میں ادا کی تھیں۔ ایک طبقے کی رائے یہ ہے کہ ان نمازوں کی امامت معروف مذہبی و سیاسی رہنما شاہ احمد نورانی کے والد شاہ عبدالعلیم صدیقی نے کی تھی جبکہ اس وقت کی تصویروں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ امامت علامہ ظہورالحسن درس نے کی تھی۔

عیدالاضحیٰ کی نماز کا واقعہ کچھ یوں ہے کہ نماز کا وقت ہوگیا لیکن گورنر جنرل کے آنے میں کچھ تاخیر تھی۔ گورنر جنرل کے عملے نے علامہ ظہورالحسن درس سے درخواست کی کہ نماز میں کچھ منٹ کی تاخیر کی جائے تاکہ گورنر جنرل نماز میں شریک ہوجائیں لیکن علامہ صاحب نے انکار کردیا اور نماز شروع کروادی۔ ابھی نماز عید کا خطبہ جاری تھا کہ قائداعظم عیدگاہ پہنچ گئے۔ اگلی صفیں پُر ہوچکی تھیں لہٰذا انھیں آخری صفوں میں جگہ ملی۔ وہ وہیں بیٹھ گئے اور نماز ادا کی۔ نماز کے بعد عملے کے کچھ لوگوں نے قائداعظم کے کان بھرنا شروع کیے کہ علامہ صاحب کی ضد کی وجہ سے انھیں پچھلی صفوں میں نماز ادا کرنی پڑی۔ کان بھرنے والے لوگوں کو اس وقت سخت مایوسی ہوئی جب قائداعظم نے کہا کہ پاکستان کو ایسے ہی علما کی ضرورت ہے۔

میں نے ایک بار معروف صحافی مرحوم ضمیر نیازی سے، جن سے میری بڑی نیاز مندی تھی، قائداعظم کی دیگر تقاریر کا حوالہ دے کر بات کی تو انھوں نے مسکراتے ہوئے فرمایا: لے دے کے 11 اگست والی ایک تقریر ہے جس کو ہم پاکستان کو سیکولر ریاست بنانے کے لیے استعمال کرتے ہیں؛ اب اگر یہ تقریر بھی نہ ہوتو ہم کیا کریں گے؟ دوسری جانب جب ہم نے تاریخ داں ڈاکٹر مبارک علی سے اس سلسلے میں بات کی تو ان کا کہنا تھا کہ ایک تقریر کسی نظریے کے نفاذ کے لیے کافی نہیں۔ ہمیں اس خیال کو کہ پاکستان ایک غیر مذہبی اور آزاد خیال ریاست ہو، بنیاد بنا کر کام کرنا چاہیے۔ ممتاز دانشور ڈاکٹر مہدی حسن سے اس بابت سوال کیا تو ان کا کہنا تھا کہ 11 اگست کے بعد کی تقریروں کو چھوڑیں؛ چونکہ 11 اگست کی تقریر آئین ساز اسمبلی میں کی گئی تھی، اس لیے یہ بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔

ہوسکتا ہے۔ چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ قائداعظم نے یہ تقاریر 1940 کی دہائی میں کی تھیں۔ اگر حالیہ دور میں ہوتیں تو کوئی بھی وکیل کسی اعلیٰ عدالت میں ایک آئینی درخواست دے مارتا اور پھر جو زرداری صاحب کے ساتھ ہوا شاید قائداعظم کے ساتھ بھی ویسا ہی ہوتا۔ قائد کے وکیل کو بھی اعلیٰ عدالتوں کو یہ یقین دہانی کرانی پڑتی کہ چونکہ گورنر جنرل کا عہدہ غیر سیاسی ہے اور وہ ملکہ برطانیہ کا نمائندہ ہے اس لیے آئندہ کوئی بھی سیاسی بیان نہیں دے گا۔

قائداعظم کی زندگی کے گمشدہ اوراق

قائداعظم محمد علی جناح کی زندگی کے کچھ پہلو ایسے ہیں جو آج تک کسی بھی عام پاکستانی کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں کچھ ایسے حقائق منظر عام پر آتے ہیں جو پاکستان کی نوکر شاہی سے ہضم نہیں ہوتے، حتیٰ کہ قائداعظم محمد علی جناح کے بارے میں ایسی معلومات جو ان کی ہمشیرہ فاطمہ جناح نے لکھی ہیں وہ بھی ریکارڈ سے غائب کر دی گئیں۔

پاک و ہند کی تاریخ نویسی ہمیشہ سے مستند ہونے کے بجائے متنازعہ رہی ہے۔ عموماً تاریخ نویسی کا عمل راجوں مہاراجوں اور بادشاہوں کے پیشہ ور مورخین ان کے دور میں کرتے تھے۔ اس طرح لکھی جانے والی تاریخیں ہمیشہ مدح سرائی سے بھرپور ہوتی تھیں۔ یہ تاریخیں عوامی تاریخیں نہیں ہوتی تھیں، بلکہ ان میں فقط حکمرانوں کی فتوحات، سخاوت اور نام نہاد کارناموں کا ذکر ہوتا تھا۔ دور قدیم میں اس طرح کی تاریخ نویسی کی وجہ بالکل واضح تھی کہ حکمران یہ سمجھتے تھے کہ ان کے تمام کارنامے عقل و فہم کا عالیشان نمونہ ہیں۔ لیکن یہ سلسلہ صرف دور قدیم تک محدود نہیں رہا بلکہ دور جدید میں بھی حکمران ایسی تاریخیں اور سوانح عمریاں لکھواتے ہیں جس میں صرف ان کے کارناموں کا ہی ذکر ہوتا ہے۔

سابق فوجی آمر ایوب خان کے دور میں ایک ادیب نے ایک ناول لکھا اور چھپوانے کے لیے پبلشر کے پاس لے گیا لیکن اسے سخت مایوسی کا شکار ہونا پڑا جب تمام پبلشرز نے انھیں بتایا کہ ان کا ادارہ صدر ایوب کی کتاب فرینڈز ناٹ ماسٹرز چھاپ رہے ہیں اور ناول چھاپنے کے لیے ان کے پاس بالکل وقت نہیں ہے۔ (اس کتاب کا نہایت شستہ اور رواں اردو ترجمہ جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی کے نام سے منظر عام پر آیا جو معروف افسانہ نگار اور ''آنندی'' کے خالق غلام عباس کے زور قلم کا نتیجہ تھا۔)

بڑی کوششوں کے بعد انھوں نے ایک چھاپے خانے کے مالک کو کتاب چھاپنے کے لیے تیار کر لیا لیکن پریس کے مالک نے شرط یہ رکھی کہ کاغذ کا بندوبست مصنف خود کریں۔ اب موصوف کاغذ کی تلاش میں نکلے تو کاغذ فروشوں کا جواب بھی یہی تھا کہ کاغذ صدر ایوب کی کتاب کے لیے دستیاب

ہے، اس کے علاوہ کسی اور کتاب کے لیے کاغذ ناپید ہے۔ بڑی مشکل سے انھوں نے کاغذ کا بندوبست بھی کرلیا اور یوں کتاب چھپ گئی۔ چھپنے کے بعد انھوں نے جب کتب فروشوں سے کتاب کی فروخت کے لیے رابطہ کیا تو ان کا جواب بھی یہی تھا کہ ان کی دکان اس وقت صرف صدر ایوب کی کتاب سے بجی ہوئی ہے اور وہی فروخت ہو رہی ہے، کسی اور کتاب کی فروخت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

موصوف نے مایوس ہو کر تمام کتابیں اپنے چھوٹے سے گھر میں رکھ لیں۔ ان کی بیگم نے کچھ عرصے تک تو کتابوں کے انبار کو برداشت کیا لیکن کچھ عرصے بعد روز مطالبہ کرنا شروع کر دیا کہ ایک تو گھر پہلے ہی چھوٹا سا ہے اور اس میں بھی آدھی جگہ کتابوں نے گھیر رکھی ہے۔ روز روز کے جھنجھٹ سے تنگ آ کر آخر حضرت کتابیں لے کر پرانی کتابوں کے بازار ریگل چوک پہنچے۔ یہ ان کے لیے آخری صدمہ تھا جب پرانی کتابیں فروخت کرنے والوں نے بھی انکا سا جواب دیا کہ اس وقت وہ صرف صدر ایوب کی کتاب ردی میں بیچ رہے ہیں، کسی اور کتاب کی گنجائش نہیں ہے۔

اس طرح کی کتابوں کا یہی حشر ہوتا ہے۔ ہاں، تو ہم ذکر کر رہے تھے محمد علی جناح کی موت و حیات کے حوالے سے ان کی ہمشیرہ فاطمہ جناح نے ایک کتاب مائی برادر یعنی میرا بھائی لکھی، لیکن اشاعت سے قبل اس کے چند صفحے غائب ہو گئے۔ یہ کارنامہ قائداعظم اکادمی کے روح رواں جناب شریف المجاہد نے انجام دیا تھا۔

ہم نے جب شریف صاحب سے اس سلسلے میں بات کی تو انھوں نے کہا کہ چونکہ یہ صفحات نظریۂ پاکستان کے خلاف تھے اس لیے ہم نے کتاب سے حذف کر دیے، اور ان کو اپنے اس عمل پر نہ تب کوئی افسوس تھا، اور نہ ہی آج ہے!

جب ہم نے انھیں بتایا کہ یہ صفحات تو قدرت اللہ شہاب نے اپنی کتاب شہاب نامہ مطبوعہ 1988 میں چھاپ دیے ہیں، تو انھوں نے کہا کہ مواد حذف کروانے میں قدرت اللہ شہاب ہی نے بنیادی کردار ادا کیا تھا۔

آیئے اب ان صفحات پر نظر ڈالتے ہیں۔

پہلا واقعہ جولائی 1948 کا ہے، جب قائداعظم علالت کی وجہ سے علاج اور آرام کے لیے زیارت میں تشریف رکھتے تھے۔ محترمہ مس فاطمہ جناح نے لکھا ہے کہ جولائی کے آخر میں ایک روز

وزیراعظم نواب لیاقت علی خاں اور سیکرٹری جنرل مسٹر چودھری محمد علی اچانک زیارت پہنچ گئے۔ ان کے آنے کی پہلے سے کوئی اطلاع نہ تھی۔ وزیراعظم نے ڈاکٹر الٰہی بخش سے پوچھا کہ قائداعظم کی صحت کے متعلق ان کی تشخیص کیا ہے؟ ڈاکٹر نے کہا کہ انھیں مس فاطمہ جناح نے یہاں بلایا ہے، اس لیے وہ اپنے مریض کے متعلق کوئی بات صرف انھی کو بتا سکتے ہیں۔

نواب صاحب نے زور دیا، ''وزیراعظم کی حیثیت سے میں قائداعظم کی صحت کے متعلق متفکر ہوں۔''

ڈاکٹر نے ادب سے جواب دیا، ''جی ہاں، بے شک۔ لیکن میں اپنے مریض کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں بتا سکتا۔''

جب مس فاطمہ جناح نے قائداعظم کو وزیراعظم کی آمد کی اطلاع دی، تو وہ مسکرائے اور فرمایا:

''تم جانتی ہو وہ کیوں آئے ہیں؟ وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ میری بیماری کتنی شدید ہے اور میں کتنا عرصہ زندہ رہ سکتا ہوں۔ تم نیچے جاؤ اور پرائم منسٹر سے کہہ دو کہ میں انھیں ابھی ملوں گا۔''

مس فاطمہ جناح نے کہا، ''اب کافی دیر ہو گئی ہے۔ کل صبح ان سے مل لیں۔''

''نہیں،'' قائداعظم نے فرمایا۔ ''انھیں ابھی آنے دو، اور بچشم خود دیکھ لینے دو۔''

وزیراعظم آدھے گھنٹے کے قریب قائداعظم کے پاس رہے۔ اس کے بعد جب مس فاطمہ جناح اندر گئیں تو قائداعظم بے حد تھکے ہوئے تھے۔ انھوں نے کچھ جوس مانگا اور پھر چودھری محمد علی کو اپنے پاس بلایا۔ سیکرٹری جنرل پندرہ منٹ تک قائداعظم کے ساتھ رہے۔ اس کے بعد مس فاطمہ جناح دوبارہ قائداعظم کے کمرے میں گئیں اور پوچھا کہ کیا وہ جوس یا کافی پینا پسند کریں گے؟ قائداعظم نے جواب نہ دیا، کیونکہ وہ کسی سوچ میں محو تھے۔ اب ڈنر کا وقت آ گیا تھا۔ قائداعظم نے مس فاطمہ جناح سے فرمایا، ''بہتر ہے کہ تم نیچے چلی جاؤ اور ان کے ساتھ کھانا کھاؤ۔''

''نہیں،'' مس جناح نے اصرار کیا۔ ''میں آپ کے پاس ہی بیٹھوں گی اور یہیں پر کھانا کھا لوں گی۔''

''نہیں،'' قائداعظم نے کہا، ''یہ مناسب نہیں۔ وہ یہاں پر ہمارے مہمان ہیں۔ جاؤ اور ان کے ساتھ کھانا کھاؤ۔''

مس فاطمہ جناح لکھتی ہیں کہ کھانے کی میز پر انھوں نے وزیر اعظم کو بڑے خوشگوار موڈ میں پایا۔ وہ پُرمذاق باتیں کرتے رہے، جبکہ مس فاطمہ کا اپنا دل اپنے بھائی کے لیے خوف سے کانپ رہا تھا، جو اوپر کی منزل میں بستر علالت پر اکیلے پڑے تھے۔ کھانے کے دوران چودھری محمد علی چپ چاپ کسی سوچ میں گم رہے۔

کھانا ختم ہونے سے پہلے ہی مس فاطمہ جناح اوپر چلی گئیں۔ انھوں نے بڑے ضبط سے اپنے آنسوؤں کو روک رکھا تھا۔ قائداعظم انھیں دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا، ''فطی، تمھیں ہمت سے کام لینا چاہیے۔''

اس واقعے کے دو ڈھائی ہفتے بعد چودہ اگست کو پاکستان کی آزادی کی پہلی سالگرہ آئی۔ اپنی کمزوری صحت کے باوجود یوم پاکستان پر قائداعظم نے قوم کے نام بڑا ولولہ انگیز پیغام جاری کیا۔ مس جناح نے اپنے مسودے میں لکھا ہے کہ یوم پاکستان کے چند روز بعد وزیر خزانہ مسٹر غلام محمد قائداعظم سے ملنے کوئٹہ آئے۔ لنچ کے وقت جب مس فاطمہ جناح ان کے ساتھ اکیلی بیٹھی تھیں تو مسٹر غلام محمد نے کہا، ''مس جناح، میں ایک بات آپ کو ضرور بتانا چاہتا ہوں۔ یوم پاکستان پر قائداعظم نے قوم کے نام جو پیغام دیا تھا، اسے خاطر خواہ اہمیت اور تشہیر نہیں دی گئی۔ اس کے برعکس وزیر اعظم کے پیغام کے پوسٹر چھاپ کر انھیں نہ صرف شہر شہر دیواروں پر چسپاں کیا گیا ہے بلکہ ہوائی جہازوں کے ذریعے اسے بڑے بڑے شہروں پر پھینکا بھی گیا ہے۔''

مس جناح نے یہ بات خاموشی سے سن لی کیونکہ اس وقت انھیں اپنے بھائی کی صحت کی فکر تھی، پبلسٹی کی نہیں۔

یہ تھی ان گمشدہ اوراق کی کہانی جو محترمہ فاطمہ جناح کی کتاب میرا بھائی سے حذف کر دیے گئے تھے۔ پاکستان کی تاریخ میں ایسی بے شمار وارداتیں ہوئی ہیں اور ہماری کوشش ہے کہ ان تمام واقعات کو اصلی شکل میں آپ کی خدمت میں پیش کیا جائے، اگر آپ کے پاس بھی اس قسم کی کوئی معلومات ہوں تو ہمیں ضرور آگاہ کیجیے گا۔

فاطمہ جناح ہاؤس، قائداعظم ہاؤس میوزیم یا فلیگ اسٹاف ہاؤس؟

شاہراہ فیصل کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے، یہ ہمیں ٹھیک طرح سے معلوم نہیں۔ ہاں یہ ضرور جانتے ہیں کہ کسی وقت میں یہ سڑک تھمہ روڈ تھی، پھر ڈرگ روڈ ہوئی، اس کے بعد اس کا نام شاہراہ فیصل ہو گیا؛ کہیں کہیں یہ شارع فیصل بھی لکھا جاتا ہے۔

اس سڑک پر ملا لاغر نامی ایک بلوچ ایک مزار کے متولی تھے اور آتی جاتی گاڑیوں سے مزار کے لیے اتنا چندہ حاصل کر لیتے تھے جس سے ان کا گزارہ ہو جاتا تھا۔ بعد میں انھوں نے لالچ میں آ کر 500 روپے میں یہ مزار کسی صاحب کو فروخت کر دیا۔ اب اس مزار پر ایک عالی شان عمارت قائم ہے اور متولی کی آمدنی لاکھوں میں ہے۔

شاہراہ فیصل کا اختتام البتہ ہمیں معلوم ہے۔ یہ ختم ہوتی ہے میٹروپول ہوٹل کے چوراہے پر۔ میٹروپول ہوٹل بھی اب نہیں رہا، صرف خالی عمارت باقی ہے۔ میٹروپول ہوٹل کے قریب موجودہ فاطمہ جناح روڈ اور سابقہ بونس روڈ کے نکڑ پر ایک ٹریفک پولیس کی چوکی کے بالکل سامنے ایک قدیم سی عمارت ہے۔ شاہراہ فیصل پر مہران ہوٹل کراس کریں تو اس کے فوراً بعد یہ قدیم دو منزلہ بنگلہ ہے۔ رات کی تاریکی میں یہ جگہ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے جس کی وجہ سے یہ ایک پُر اسرار منظر پیش کر رہی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ کوئی احتیاطی، حفاظتی تدابیر نہیں ہیں بلکہ مقصود بجلی کا بل بچانا ہے۔

دن میں اگر آپ اس عمارت کو باہر سے دیکھیں تو اس پر "قائداعظم ہاؤس میوزیم" کا بورڈ لگا نظر آئے گا، لیکن اسے اس نام سے کراچی میں کوئی نہیں جانتا۔ عام طور پر یہ عمارت "فلیگ اسٹاف ہاؤس" کے نام سے جانی جاتی ہے۔

قائداعظم ہاؤس کے حوالے سے محکمۂ آثار قدیمہ، حکومت پاکستان، کراچی، کے مطبوعہ ایک کتابچے میں، جو قاسم علی قاسم کا تحریر کردہ ہے، لکھا ہے:

1922 تک اس عمارت کے مالک رام چند جی کچھی لوہانہ تھے۔ بعدازاں برطانوی فوج نے عمارت کرائے پر لے لی۔ ان کے مختلف جنرل اس عمارت میں مقیم رہے۔ آخری

جنرل جو یہاں مقیم رہے ان کا نام ڈگلس ڈی گریسی تھا، جو بعد میں رائل پاکستان آرمی کے چیف بھی رہے۔

1943 کے بعد اس عمارت میں رہائش پذیر کمانڈرز نئے مالک کے کرائے دار تھے۔ کرائے کی رسیدوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ قائداعظم کے نام پر ہیں۔ دستیاب دستاویزات کے مطابق جس وقت قائداعظم نے عمارت خریدی اس وقت اس کے مالک سر سہراب کاوس جی کٹرک اور ان کی بیوی خورشید اور پارین بائی تھے۔

قائداعظم کے انتقال کے بعد 13 ستمبر 1948 کو محترمہ فاطمہ جناح اس عمارت میں منتقل ہو گئیں۔ 11 ستمبر 1948 کو قائداعظم کا انتقال ہوا تھا۔ اگر قاسم علی قاسم کی اس بات کو درست تسلیم کیا جائے کہ محترمہ فاطمہ جناح 13 ستمبر 1948 کو فلیگ اسٹاف ہاؤس میں منتقل ہوئی تھیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسی کیا وجوہات تھیں جن کے سبب انھیں اپنے بھائی بانی پاکستان محمد علی جناح کے انتقال کے فقط دو دن بعد گورنر جنرل ہاؤس (موجودہ گورنر ہاؤس) خالی کرنا پڑا؟ اس کے اسباب جاننے کے لیے ایک بڑی مشقت اور تحقیق کی ضرورت ہے۔

1963 میں فاطمہ جناح اس عمارت سے موہٹہ پیلس منتقل ہو گئیں۔ مشہور کالم نگار جاوید چودھری نے روزنامہ ایکسپریس میں یکم جولائی 2014 کو اپنے کالم میں لکھا ہے کہ محترمہ فاطمہ جناح کا انتقال اس عمارت (فلیگ اسٹاف ہاؤس) میں ہوا تھا۔ یہ بات درست نہیں ہے۔ ان کا انتقال 9 جولائی 1967 کو موہٹہ پیلس میں ہوا تھا۔ حضرت یہ بھی لکھتے ہیں کہ قائداعظم میوزیم ہاؤس اسٹاف لائنز نامی سڑک پر واقع ہے۔ یہ بھی درست نہیں ہے، اس سڑک کا نام بونس روڈ تھا، بعد میں اس کا نام فاطمہ جناح روڈ رکھ دیا گیا تھا۔ اس کا ریکارڈ بلدیہ کراچی میں موجود ہے۔

جہاں تک محترمہ فاطمہ جناح کی ایوب خان کے خلاف صدارتی مہم قائداعظم میوزیم سے چلانے کا تعلق ہے تو بقول قاسم علی قاسم، 1963 میں محترمہ فاطمہ جناح موہٹہ پیلس منتقل ہو گئی تھیں، جبکہ صدارتی انتخابات جنوری 1965 میں منعقد ہوئے تھے۔ تو پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ انھوں نے صدارتی انتخابی مہم قائداعظم میوزیم ہاؤس سے چلائی ہو۔ غلطی کا امکان ہر وقت رہتا ہے، لیکن تحقیق کے سلسلے میں محتاط رہنا ضروری ہے۔ زبانی گفتگو ایک الگ بات ہے لیکن جب معاملہ تحریر کا ہو تو مختلف

ذرائع سے ان کی چھان بین ضروری ہے۔

جاوید چودھری نے اس عمارت کے نقشہ ساز کا نام لکھ دیا، اس کے لیے ان کا شکریہ، وجہ یہ کہ نام سے ہی ظاہر ہے کہ یہ شخص غیر مسلم تھا۔ لیکن جناب قاسم علی قاسم کے کتابچے میں نقشہ ساز کا نام نہیں دیا گیا؛ ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ رہی ہوگی کہ غالباً نقشہ ساز نہ صرف غیر مسلم تھا بلکہ یہودی بھی تھا۔ اس یہودی نقشہ ساز نے کراچی میں کچھ اور عمارتوں کے نقشے بھی بنائے تھے۔ کسی اور موقعے پر اس بارے میں معلومات کا تبادلہ کریں گے۔

ہاں تو ذکر ہو رہا تھا قائداعظم میوزیم ہاؤس یا فلیگ اسٹاف ہاؤس کا۔ تو جناب سرکاری کاغذات میں نہ تو یہ فلیگ اسٹاف ہاؤس ہے اور نہ ہی قائداعظم ہاؤس میوزیم۔ ہے نا حیرت کی بات؟ جی ہاں، اس عمارت کا نام "فاطمہ جناح ہاؤس" ہے۔ اگر آپ کو یقین نہ ہو تو کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن اور واٹر بورڈ کے بل دیکھ لیں۔ ان کے واجبات کی ادائیگی کی ذمے دار فاطمہ جناح ہیں۔ گزشتہ دنوں کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن نے جو اب کراچی الیکٹرک ہوگئی ہے، عمارت کی بجلی منقطع کرنے کا نوٹس بھی جاری کر دیا تھا۔

عمارت کے اخراجات کی ادائیگی کے لیے حکومت کی جانب سے ایک لاکھ پچاسی ہزار روپے سالانہ دیے جاتے ہیں، جو یقیناً ایک ناکافی رقم ہے۔ غالباً یہودی نقشہ ساز کو پہلے ہی سے اندازہ تھا کہ اس عمارت کے مالکان کو کبھی نہ کبھی بجلی کے بل کی عدم ادائیگی کا سامنا کرنا پڑے گا، اس لیے اس نے مرکزی عمارت کے چاروں اطراف میں اتنی کھڑکیاں بنا دیں کہ بجلی نہ ہونے کی صورت میں بھی ہوا کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ کراچی الیکٹرک کی جانب سے قائداعظم ہاؤس میوزیم کی بجلی منقطع کرنے کے لیے 4 لاکھ 23 ہزار 9 سو 24 روپے کا بل بھیجا گیا اور عدم ادائیگی کی صورت میں بجلی منقطع کرنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا گیا۔ بالکل اسی طرح کراچی واٹر بورڈ نے مرحومہ فاطمہ جناح کے نام سے 30 جون 2014 کو جاری کردہ بل کی ادائی کا مطالبہ کیا ہے، جس کی رقم تقریباً 273,012 روپے بنتی ہے۔

اس عمارت کے نقشہ ساز کا نام موزز جے سوماک (Moses J Somak) تھا اور وہ یہودی تھے۔ یقیناً وہ ایک دور اندیش انسان تھے جنھیں اس بات کا اندازہ تھا کہ برسوں بعد اس عمارت کی تعمیر کے حوالے سے ان کے کردار کو یکسر فراموش کر دیا جائے گا، اس لیے عمارت کے داخلی دروازے کے

بالکل اوپر چھت کے کونے پر ایک چھوٹی سی تختی چھوڑ گئے جس پر ان کا نام لکھا ہے۔ یہ تختی بغور دیکھنے پر ہی نظر آتی ہے۔

اس عمارت کا دورہ کرنے والے اگر گرمیوں میں جائیں تو پسینے میں شرابور ہو جائیں کیونکہ عمارت کے اندرونی حصے میں نہ تو پنکھے ہیں اور نہ ہی ایئر کنڈیشنر۔ عمارت سے متصل دفاتر کی چھتیں برسات میں ٹپکتی ہیں جس کے سبب اکثر و بیشتر کاغذات بھیگ کر ضائع ہو جاتے ہیں۔ عمارت میں موجود لائبریری میں گنی چنی چند ہی کتابیں رکھی ہیں، اور شاید ایک طویل عرصے سے اس لائبریری میں شاید ہی کسی نے کچھ پڑھا یا لکھا ہو۔

موہٹہ پیلس قصرِ فاطمہ نہ بن سکا

کراچی کا علاقہ کلفٹن شہر کے امرا کا مسکن کہلاتا ہے۔ آج ہی نہیں، تقسیم ہند سے پہلے بھی کلفٹن امیروں کا علاقہ تھا۔ بٹوارے کے بعد 1970 کی دہائی میں اس کی ایک بڑی وجۂ شہرت مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کی رہائش گاہ 70 کلفٹن تھی۔

اس علاقے میں آج بھی ایک محل نما عمارت اطراف میں بسنے اور وہاں سے گزرنے والوں کے لیے توجہ کا مرکز رہتی ہے۔ یہ عمارت ''موہٹہ پیلس'' ہے، جو آج کل ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ یہ عمارت کراچی کے ایک نامور تاجر اور مخیر شخصیت رائے بہادر شورتن موہٹہ نے تعمیر کرائی تھی۔

شِورتن نے موہٹہ پیلس کیوں بنوایا، یہ بھی ایک دلچسپ اور محبت بھری کہانی ہے؛ بالکل اُسی طرح کی کہانی جس طرح شاہ جہاں نے اپنی محبوب ملکہ ممتاز محل کی یاد میں تاج محل تعمیر کروایا تھا۔ شاہ جہاں نے تاج محل تعمیر کروایا تھا، لیکن ممتاز کے مرنے کے بعد، مگر موہٹہ نے یہ عمارت بیوی کو مرنے سے بچانے کے لیے بنوائی تھی۔ عثمان دموہی اپنی کتاب کراچی تاریخ کے آئینے میں لکھتے ہیں:

''یہ عمارت ایک ہندو مارواڑی تاجر رائے بہادر شورام موہٹہ نے 1933 میں تعمیر کروائی تھی۔ ہندوستان کے معروف نقشہ ساز آغا احمد حسین نے جے پور سے آکر اس کا ڈیزائن تیار کیا تھا۔ انھوں نے جے پور فن تعمیر کے زیر اثر اینگلو مغل انداز میں پیلے گوری اور گلابی جودھپوری پتھروں کے امتزاج سے یہ محل تعمیر کیا۔ اسے تعمیر کرنے کا مقصد کچھ اس طرح بتایا جاتا تھا کہ شیورام موہٹہ کی بیوی ایک مہلک بیماری میں مبتلا ہوگئی تھیں۔ ڈاکٹروں نے علاج یہ تجویز کیا کہ اگر مریضہ کو مسلسل سمندر کی تازہ ہوا میں رکھا جائے تو وہ بالکل صحت یاب ہوسکتی ہے۔ چنانچہ شیورام موہٹہ نے یہ قلعہ نما بنگلہ کلفٹن میں تعمیر کروایا تھا۔ گزشتہ صدی میں تعمیر کی جانے والی یہ خوبصورت اور دلکش عمارت ایک بہت بڑے رقبے پر محیط ہے۔''

قیام پاکستان کے بعد یہ پیلس قائداعظم کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح کو دے دیا گیا، ان کے انتقال کے بعد حکومت سندھ نے اسے تحویل میں لے لیا۔ تقسیم کے بعد موہٹہ کی ہندوستان ہجرت کے

حوالے سے متحدہ قومی موومنٹ کے رہنما کنور خالد یونس نے روزنامہ ڈان میں لیٹر ٹو ایڈیٹر میں لکھا ہے کہ 2004 میں جب وہ ایک سرکاری دورے پر دہلی گئے تھے تو ان کی ملاقات تقریباً 90 سالہ ایک بزرگ سے ہوئی تھی جنھوں نے موہٹہ کی ہجرت کی کہانی یوں بیان کی:

''موہٹہ نے یہ طے کیا تھا کہ وہ تقسیم کے بعد کراچی میں ہی رہیں گے۔ لیکن ایک روز ایک بااثر سیاسی شخصیت نے ان سے رابطہ کیا اور کہا کہ وہ موہٹہ پیلس خالی کر دیں کیونکہ یہ ایک سرکاری دفتر کے لیے مطلوب ہے۔'' بزرگ کے مطابق موہٹہ یہ سن کر سکتے میں آ گئے اور انھوں نے اسی رات پاکستان چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور اس کے اگلے دن وہ بمبئی منتقل ہو گئے۔ چابیاں اپنے منیجر کے حوالے کیں اور ایک تحریر بھی دی جس میں لکھا تھا کہ وہ یہ عمارت تحفتاً دے رہے ہیں۔ اس میں عمارت زبردستی خالی کرانے کا ذکر نہ تھا۔

کنور خالد یونس نے ٹیلی فون پر ہمیں اس حوالے سے مزید معلومات دیتے ہوئے بتایا کہ مذکورہ بزرگ سے ان کی ملاقات دہلی میں ایک تصویری نمائش کے دوران ہوئی تھی جس میں انھوں نے اس واقعے کا ذکر کیا تھا۔

موہٹہ پیلس کا کل رقبہ 18 ہزار اسکوائر فٹ پر مشتمل ہے۔ تقسیم ہند سے قبل اور بعد بھی کلفٹن کے علاقے میں اتنی وسیع وعریض عمارت نہیں ہے۔ یہ ممتاز عمارت دو منزلوں پر مشتمل ہے۔ دونوں منزلوں پر کل ملا کر 16 کمرے ہیں۔ پیلس میں داخل ہوتے وقت سب سے پہلے آپ کی نظر بیرونی رُخ پر پڑتی ہے جسے خوبصورت، رنگا رنگ اور نفیس کھڑکیوں، پتھر کی دیوار، محراب اور میناروں سے ترتیب دیا گیا ہے۔ منظر ایسا جاذب نظر ہے کہ کچھ ساعتوں کے لیے کوئی بھی شخص اسے دیکھ کر مبہوت ہو جاتا ہے۔ نچلی منزل پر کمرے آسائش اور رہائش کے حوالے سے اپنی مثال آپ ہیں۔ کمرے دیکھ کر یہ بالکل محسوس نہیں ہوتا کہ یہ فرد واحد کے لیے تعمیر کیے گئے تھے۔ یہ تو تھا گراؤنڈ فلور کا ذکر لیکن پہلی منزل بھی اپنی مثال آپ ہے۔ اگر آج بھی عمارت کی چھت پر جا کر مشاہدہ کریں تو شاید آپ کو سمندر کا کوئی نظارہ نظر آ جائے۔

گو بلند و بالا رہائشی عمارتوں نے موہٹہ پیلس کو چہار جانب سے گھیر لیا ہے، لیکن جس وقت یہ عمارت تعمیر ہوئی تھی، اس وقت اس کے مکین نہ صرف گرمیوں میں سمندر کی ٹھنڈی ہواؤں کا لطف

اٹھاتے تھے بلکہ چھت پر بیٹھ کر سمندر کی سرکش لہروں کا نظارہ بھی کرتے تھے۔

چھت پر تعمیر کیے گئے گنبد کے اردگرد بنایا جانے والا خوش منظر احاطہ مکینوں کو شدید دھوپ سے محفوظ رکھنے کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔ مرکزی گنبد کے علاوہ عمارت کے اطراف پانچ نفیس گنبد عمارت کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ عمارت کی چھتوں پر کیا جانے والا کام نقاشوں کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ نقاشی کے ذریعے خوبصورت بیل بوٹوں کو منفرد انداز میں ترتیب دیا گیا ہے۔ ان میں مختلف انداز کے رنگ استعمال کیے گئے ہیں، جس میں آبی رنگ بھی شامل ہے۔ عمارت کے اطراف ایک خوبصورت اور وسیع باغیچہ بھی موجود ہے۔

موہٹہ پیلس کی شاندار عمارت کئی حوالوں سے اہمیت کی حامل ہے۔ تقسیم ہند کے بعد اس عمارت میں وزارت خارجہ کا دفتر قائم کیا گیا۔ بٹوارے کے بعد ڈپٹی چیف پروٹوکول آفیسر آغا ہلالی موہٹہ پیلس میں قائم دفتر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''موہٹہ پیلس شہر سے خاصے فاصلے پر واقع تھا اور ملازمین کی وہاں تک رسائی ایک بڑا مسئلہ تھی۔ اس مسئلے کو ہم نے یوں حل کیا کہ ایمپریس مارکیٹ سے ملازمین کو موہٹہ پیلس لانے کے لیے بسوں کا بندوبست کیا گیا۔ اس وقت کلفٹن کے علاقے میں آبادی نہ ہونے کے برابر تھی۔ سمندر کا پانی تھا اور ریت ہی ریت۔ بعض اوقات تو کلفٹن کی سڑکوں پر 6 انچ کے قریب سمندری پانی کھڑا ہو جاتا تھا۔''

موہٹہ پیلس کی تصویر وزارت خارجہ کی جانب سے سال نو کے موقع پر چھپنے والے کارڈ پر سرکاری طور پر شائع کی جاتی تھی۔ جب موہٹہ پیلس محترمہ فاطمہ جناح کے نام کیا گیا تو وزارت خارجہ نے عمارت خالی کرنے کی پیشکش کی، لیکن محترمہ نے اس پر کوئی توجہ نہ دی، گو کمروں کی مکمل طور پر صفائی کروائی گئی اور پیلس کے اطراف میں لگائی جانے والی خاردار تاروں کی باڑ بھی ہٹادی گئی۔ اس کے ساتھ کبوتروں کے گھونسلے بھی صاف کردیے گئے تھے۔ محترمہ فاطمہ جناح نے موہٹہ پیلس کا انتخاب قائدِاعظم کی بمبئی والی رہائش گاہ کے بدلے کیا تھا۔

محترمہ فاطمہ جناح کی دوست بیگم اکرام اللہ نے روزنامہ ڈان کو دیے گئے انٹرویو میں موہٹہ پیلس کے حوالے سے اپنی یادداشتوں میں کہا:

''ایک دن شام کو محترمہ فاطمہ جناح مجھے اپنے ساتھ موہٹہ پیلس کی چھت پر لے گئیں۔ وہاں سے سمندر کا نظارہ بہت خوبصورت تھا۔ محترمہ جب پہلی بار رہائش کے لیے پیلس پہنچیں تو میں نے ان سے پوچھا کہ کیا یہ ایک بہت بڑی جگہ نہیں ہے۔ محترمہ نے جواباً کہا، نہیں، مجھے یہ جگہ پسند ہے۔ یہ جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب تھی۔ اس رات فاطمہ جناح نے موہٹہ پیلس میں کھانا کھایا۔ لیڈی ہدایت اللہ کے مطابق عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر قوالی کی محفل ہو رہی تھی۔ ہم تمام رات بیٹھ کر قوالی سنتے رہے۔''

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ ایوب خان کے خلاف تحریک کا مرکز بھی موہٹہ پیلس ہی تھا۔ اس عمارت سے محترمہ فاطمہ جناح نے ایوب خان کے خلاف صدارتی انتخابی مہم کا آغاز بھی کیا تھا۔ موہٹہ پیلس میں ایوب خان کے خلاف حکمتِ عملی ترتیب دینے کے لیے اجلاس بھی منعقد ہوتے تھے۔

محترمہ فاطمہ جناح کی وفات بھی اسی عمارت میں ہوئی، وہ ایک صبح اپنے کمرے میں پراسرار طور پر مردہ پائی گئیں۔ کچھ حلقے ان کی پراسرار موت کو ایوب خان کے خلاف ان کی سیاسی مہم سے بھی جوڑتے ہیں لیکن جیسا کہ ہمارے ملک میں روایت ہے، لیاقت علی خان سے لے کر محترمہ بے نظیر بھٹو تک جتنے بھی افراد کی سیاسی اموات ہوئیں، سب ایک معما ہی ثابت ہوئیں۔

جب تک محترمہ فاطمہ جناح حیات تھیں، ایوب خان کی انتظامیہ کی جانب سے موہٹہ پیلس کی کڑی نگرانی کی جاتی تھی۔ محترمہ فاطمہ جناح قائداعظم کی برسی موہٹہ پیلس میں مناتی تھیں۔ اس موقع پر پیلس کے باغیچے میں شامیانے لگا کر انتظامات کیے جاتے تھے اور ایک مخصوص بوہری سے بریانی کی دیگیں منگوائی جاتی تھیں۔

محترمہ کی وفات کے بعد ان کے ورثا میں موہٹہ پیلس کی ملکیت کا تنازع اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن ہائی کورٹ نے موہٹہ پیلس ان کی بہن شیریں جناح کے حوالے کیا جن کا انتقال 1980 میں ہوا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں یہ عمارت خیراتی کاموں کے لیے وقف کر دی تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ عمارت میں طالبات کے لیے ایک میڈیکل کالج قائم کیا جائے۔ شیریں جناح کے انتقال کے بعد ایک بار پھر ان کے ورثا میں عمارت کے حصول کے لیے مقدمے بازی شروع ہو گئی تھی، جس کے بعد عدالت نے عمارت کو سیل کرنے کے احکامات جاری کر دیے تھے، اور پھر عمارت سیل کر دی گئی تھی۔

1995 میں حکومت سندھ کی درخواست پر محترمہ بے نظیر بھٹو نے حکومتِ سندھ کے محکمۂ ثقافت کو یہ پیلس خریدنے اور اسے بحال کرکے میوزیم میں تبدیل کرنے کے لیے 70 لاکھ روپے دیے۔ محکمۂ ثقافت نے 61 لاکھ روپے عمارت خریدنے کے لیے ادا کیے جب کہ باقی رقم عمارت کی تزئین وآرائش پر صرف کی۔ پیلس دیکھ بھال کے لیے ایک خودمختار بورڈ آف ٹرسٹیز بھی بنایا گیا۔ عمارت کی بحالی کے دوران اسے اس کے اصلی رنگ میں ڈھالنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ طویل عرصے سے جمنے والی مٹی کی تہوں اور کالک کو صاف کیا گیا، تاکہ گلابی پتھر کا اصلی روپ نمایاں ہوسکے۔

موہٹہ پیلس کا سرکاری نام "قصرِ فاطمہ" ہے لیکن اس نام سے اس عمارت کو کوئی نہیں جانتا۔ یہ اب تک موہٹہ پیلس ہی ہے۔ عمارت کی آفیشل ویب سائٹ بھی موہٹہ پیلس میوزیم کے نام سے موجود ہے۔

سید ہاشم رضا نے اپنی کتاب ہماری منزل مطبوعہ 1991 کے صفحہ نمبر 96,97 پر یوں بیان کی ہے۔

راؤ بہادر شیوارتن موہٹہ بہت زیادہ خوش حال لوگوں میں سے ایک تھے۔ ان کے کراچی میں کئی گھر تھے لیکن وہ کلفٹن میں اپنی رہائش گاہ موہٹہ پیلس میں رہنا پسند فرماتے تھے۔ اس عمارت کا انتخاب ہمارے وزارت خارجہ کے لیے کیا گیا۔ 14 اگست کی شام کو اقلیتی برادری سے تعلق رکھنے والے نمایاں افراد کو گورنر جنرل ہاؤس میں مدعو کیا گیا تھا۔ شوارتن موہٹہ قائد کی جانب بڑھے اور انھیں گورنر جنرل پاکستان بننے کی مبارک باد دی۔ قائداعظم نے پرتپاک انداز میں شیورتن موہٹہ سے ہاتھ ملایا۔ موہٹہ یہ سمجھا کہ یہ بہترین موقع ہے کہ اپنے گھر موہٹہ پیلس کو سرکاری قبضے سے واگزار کروائے۔ میں قائد کے قریب کھڑا تھا۔ انھوں نے مجھے کہا کہ انھیں صورت حال سے آگاہ کروں کہ کیسے شیورتن موہٹہ کے گھر کا انتخاب کیا گیا ہے۔ میں نے انھیں بتایا کہ ہم نے صرف ان گھروں کا انتخاب کیا ہے جن گھروں کے مالکان کے پاس ایک سے زیادہ گھر ہیں۔ میں نے انھیں بتایا کہ موہٹہ کے پاس رہنے کے لیے کراچی میں ایک سے زیادہ گھر ہیں جہاں وہ منتقل ہوسکتے ہیں۔ موہٹہ نے جواباً کہا کہ موہٹہ پیلس ان کا پسندیدہ گھر ہے۔ انھوں نے قائداعظم سے درخواست کی کہ ان کے گھر کا قبضہ خالی کیا جائے۔ قائد نے جواباً کہا کہ شیورتن موہٹہ میں اس حوالے سے کوئی فیصلہ کن حیثیت نہیں رکھتا۔ میں

آپ کے گھر پر قبضہ ختم نہیں کروا سکتا آپ کو چاہیے کہ اس حوالے سے آپ ضرور فیصلہ کن حیثیت رکھنے والوں سے درخواست کریں۔

شیورتن موہٹہ قائد کے خیالات سننے ے بعد سکتے میں آگئے۔ کہ ریاست کا سربراہ اس بات کی حیثیت نہیں رکھتا کہ ان کا گھر خالی کروا سکے۔ اسے اس بات کا بالکل اندازہ نہ تھا کہ قائداعظم ایک عظیم آئین پرست تھے اور ہمیشہ برطانوی راج اور ہندوؤں کے خلاف جدوجہد کے لیے آئینی طریقہ کار کی پیروی کرتے تھے۔

عثمان دموہی اپنی کتاب کراچی کی کہانی میں موہٹہ پیلس کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''اس عمارت میں ایک زیرزمین سرنگ بھی موجود تھی جو عمارت سے شروع ہو کر کلفٹن پر واقع قدیم مندر پر ختم ہوتی تھی۔ اس سرنگ کے ذریعے موہٹہ کے اہل خانہ پوجا پاٹ کے لیے مندر جاتے تھے۔ بعدازاں یہ سرنگ اس لیے بند کردی گئی کہ موہٹہ کی بیٹی اپنے ایک عاشق سے ملنے کے لیے اس سرنگ کے ذریعے مندر تک جاتی تھی۔'' (ہم نے بڑی کوشش کی کہ دموہی صاحب کے سرنگ کے بارے میں کیے جانے والے دعوے بھی کسی اور ذریعے سے تصدیق کی جاسکے لیکن اس کی تصدیق نہ ہو سکی۔ ایک دن دموہی صاحب سے ملاقات کے دوران ہم نے ان کے اس دعوے کے بارے میں معلوم کیا تو انھوں نے بتایا کہ برسوں قبل انھوں نے جب اس عمارت پر لکھنے کے لیے اس کا دورہ کیا تھا تو وہاں موجود ایک شخص نے انھیں یہ واقعہ سنایا تھا۔ ہم نے ان سے دریافت کیا کہ وہ شخص کون تھا تو انھوں نے کہا بس ایک معمولی سا آدمی تھا اس لیے ہم نے اس کا نام بھی معلوم نہیں کیا)''

جہاں تک دموہی صاحب کی سرنگ اور موہٹہ کی بیٹی کی اپنے عاشق سے ملاقات اور اس کے نتیجے میں سرنگ بند کرنے کا انکشاف ہے تو ہم یہ بتائے دیتے ہیں کہ یہ سرنگ موہٹہ پیلس کے زیرزمین سوئمنگ پول کا پانی نکالنے کے لیے بنائی گئی تھی اور اس کا کل حجم چار فٹ ہے۔

قصہ فاطمہ جناح کی تدفین کا

محترمہ فاطمہ جناح بانی پاکستان محمد علی جناح کی نہ صرف خیال رکھنے والی مشفق بہن تھیں بلکہ وہ جناح صاحب کی سیاسی شریک کار بھی تھیں۔ جناح صاحب کی وفات کے بعد لوگ انھیں اسی قدر و منزلت سے دیکھتے تھے جس طرح جناح صاحب کو۔ لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جناح صاحب کی وفات کے بعد انھیں سیاست سے دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔

حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کی حکومت اور انتظامیہ کسی صورت بھی نہیں چاہتی تھی کہ فاطمہ جناح آزادی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں۔ اس کوشش میں وہ اس حد تک آگے بڑھ گئے تھے کہ ریڈیو پاکستان سے ان کی تقریر کے دوران کچھ مواقع پر نشریات روک دی گئیں۔ قدرت اللہ شہاب اپنی کتاب شہاب نامہ (مطبوعہ جنوری 1986) کے باب چہارم میں صفحہ 432 پر لکھتے ہیں:

> قائداعظم کی وفات کے بعد محترمہ مس فاطمہ جناح اور حکومت کے درمیان سرد مہری کا غبار چھایا، اور قائد کی دو برسیاں آئیں اور گزر گئیں، دونوں بار مس جناح نے برسی کے موقع پر قوم سے خطاب کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کی شرط یہ تھی کہ براڈکاسٹ سے پہلے وہ اپنی تقریر کا متن کسی کو نہیں دکھائیں گی، جبکہ حکومت یہ شرط ماننے پر آمادہ نہیں تھی۔ غالباً اسے خوف تھا کہ نہ جانے مس جناح اپنی تقریر میں حکومت پر کیا کچھ تنقید کر جائیں گی۔
>
> آخر خدا خدا کر کے قائداعظم کی تیسری برسی پر یہ طے پایا کہ محترمہ فاطمہ جناح اپنی تقریر پہلے سے سنسر کروائے بغیر ریڈیو سے براہ راست نشر کر سکتی ہیں۔ تقریر نشر ہو رہی تھی کہ ایک مقام پر پہنچ کر اچانک ٹرانسمیشن بند ہو گئی۔ کچھ لمحے ٹرانسمیشن بند رہی، اس کے بعد خود بخود جاری ہو گئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مس جناح کی تقریر میں کچھ فقرے ایسے تھے جن میں حکومت پر کچھ تنقید تھی۔ وہ تو بدستور ان فقروں کو مائک پر پڑھتی گئیں، لیکن ٹرانسمیشن بند ہو جانے کی وجہ سے وہ فقرے براڈکاسٹ نہ ہو سکے۔

اس بات پر بڑا شور شرابا ہوا۔ اخباروں میں بہت سے احتجاجی بیانات بھی آئے۔ اگرچہ ریڈیو پاکستان کا موقف یہی تھا کہ ٹرانسمیشن میں رکاوٹ کی وجہ اچانک بجلی فیل ہونا تھی، لیکن کوئی اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔ سب کا یہی خیال تھا کہ مس جناح کی تقریر میں ضرور کوئی ایسی بات تھی جسے حذف کرنے کے لیے یہ سارا ڈھونگ رچایا گیا ہے۔ اس ایک واقعے نے حکومت پر اعتماد کو جتنی ٹھیس پہنچائی اتنا نقصان مس فاطمہ جناح کے چند تنقیدی جملوں نے نہیں پہنچایا تھا۔

اب آیئے آگے کی طرف چلتے ہیں۔ 7 اکتوبر 1958 کو ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ کمانڈر انچیف جنرل (بعد میں خودساختہ فیلڈ مارشل) ایوب خان کو مارشل لا کا ناظم مقرر کر دیا گیا۔ حکمران اسکندر مرزا نے یہ سب اس لیے کیا تھا کہ وہ ملک کے حکمران ہوں گے۔ لیکن 24 اکتوبر 1958 کو ایوب خان نے اسکندر مرزا کے تمام اختیارات حاصل کر لیے اور ملک میں فوجی حکومت قائم کر دی۔ ان کے کچھ حاشیہ بردار انھیں مشورہ دے رہے تھے کہ وہ تاحیات صدر بن جائیں۔ حکمران کونشن مسلم لیگ کی جانب سے صدر ایوب کو صدارتی امیدوار نامزد کیا گیا۔ محترمہ ابتدا میں اس نامزدگی پر آمادہ نہ تھیں لیکن حزب مخالف کی سیاسی پارٹیوں کے اصرار پر انھوں نے ایوب خان کے خلاف صدارتی انتخاب لڑنے کی ہامی بھر لی۔

2 جنوری 1965ء کو انتخابات ہوئے۔ حزب مخالف کے سیاستدانوں کو اس بات کا مکمل یقین تھا کہ محترمہ کامیاب ہوں گی، لیکن الیکشن کمیشن کے مطابق صدر ایوب کامیاب قرار دیے گئے۔ غالباً حکومت اور محترمہ مس فاطمہ جناح کے درمیان انہی کشیدگیوں کی وجہ سے انتقال کے بعد مزار قائد کے احاطے میں دفن کیے جانے کی ان کی خواہش کے باوجود کوشش یہ ہوتی رہی کہ انھیں کراچی کے قدیم میوہ شاہ قبرستان میں دفن کیا جائے۔

اس حوالے سے آغا اشرف اپنی کتاب مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح (اشاعت اوّل 2000) کے صفحہ 184 پر لکھتے ہیں:

> محترمہ فاطمہ جناح نے اپنی زندگی میں یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ مرنے کے بعد انھیں قائداعظم کے پاس دفن کیا جائے۔ اب محترمہ فاطمہ جناح کی وفات کے بعد یہ مسئلہ پیش

آیا کہ انھیں کس جگہ دفن کیا جائے۔ بقول مرزا ابوالحسن اصفہانی صاحب، اس وقت کی حکومت محترمہ کو میوہ شاہ قبرستان میں دفنانا چاہتی تھی (ایم اے ایچ اصفہانی، انٹرویو، 14 جنوری 1976، کراچی) جس کی مخالفت کی گئی اور کمشنر کراچی کو متنبہ کیا گیا کہ اگر محترمہ فاطمہ جناح کو قائداعظم کے مزار کے قریب دفن نہ کیا گیا تو بلوہ ہوجائے گا۔

یہ فیصلہ تو ہوگیا کہ محترمہ فاطمہ جناح کو بلوے کے خدشے کے پیش نظر مزار قائد کے احاطے میں دفن کیا جائے، لیکن اس کے باوجود ان کی تدفین کے موقع پر بلوہ ہوا۔ بلوے میں کیا کیا ہوا اس کا ذکر آگے کریں گے۔ آغا اشرف اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

اس طرح انھیں قائداعظم کے مقبرے کے قریب دفن کرنے کے لیے کمشنر کراچی نے ان کے خاندان کے افراد اور بانی پاکستان کے پرانے ساتھیوں سے مشورہ کیا، اور پھر حکومت سے رابطہ قائم کیا۔ حکومت نے رات دیر گئے مادر ملت کو قائداعظم کے پاس دفن کرنے کا فیصلہ کیا۔ کمشنر کراچی نے اس فیصلے سے ایم اے ایچ اصفہانی کو آگاہ کردیا۔

مادر ملت کی قبر قائداعظم کے مزار سے ایک سو بیس فٹ دور بائیں جانب کھودی گئی۔ قبر ساڑھے چھ فٹ لمبی اور تین فٹ چوڑی تھی۔ زمین پتھریلی تھی اس لیے گورکنوں کو قبر کھودنے میں پورے بارہ گھنٹے لگے، جبکہ بعض اوقات انھیں بجلی سے چلنے والے اوزاروں سے زمین کھودنی پڑتی۔

بیس گورکنوں کی قیادت ساٹھ سالہ عبدالغنی کر رہا تھا، جس نے قائداعظم، لیاقت علی خاں اور سردار عبدالرب نشتر کی قبریں تیار کی تھیں۔ مرحومہ کی پہلی نماز جنازہ قصرِ فاطمہ میں ساڑھے آٹھ بجے مولانا ابن حسن جارچوی نے پڑھائی اور پھر جب ان کی میت پونے نو بجے قصرِ فاطمہ سے اٹھائی گئی تو لاکھوں آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔ قصرِ فاطمہ کے باہر دور دور تک انسانوں کا سمندر نظر آرہا تھا۔ میت کو کندھوں پر اٹھایا گیا تو ہجوم نے مادر ملت زندہ باد کے نعروں کے ساتھ آگے بڑھنا شروع کردیا۔

جنازے کے پیچھے مرکزی حکومت اور صدر ایوب کے نمائندے شمس الضحیٰ وزیر زراعت وخوراک، بحریہ کے کمانڈر انچیف ایڈمرل ایس ایم احسن، دونوں صوبوں کے گورنروں

کے ملٹری سیکرٹری، کراچی کے کمشنر، ڈی آئی جی کراچی، قومی وصوبائی اسمبلیوں کے اراکین اور تمام سیاسی جماعتوں کے رہنما سر جھکائے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ محترمہ فاطمہ جناح کی میت ایک کھلی مائیکرو وین میں رکھی گئی تھی۔ اس کے چاروں طرف مسلم لیگ کے نیشنل گارڈز کے چار سالار کھڑے تھے۔ ایک عالم دین بھی موجود تھے جو سورۂ یاسین کی تلاوت کر رہے تھے۔ غم واندوہ میں ڈوبا ہوا یہ جلوس جب ایک فرلانگ بڑھ گیا تو مسلم لیگ نیشنل گارڈز نے ایک قومی پرچم لا کر مرحومہ کے جسد خاکی پر ڈال دیا۔

لوگوں نے جب مادر ملت کو ستارہ وہلال کے سبز پرچم میں لپٹے ہوئے دیکھا تو پاکستان زندہ باد، مادر ملت زندہ باد کے نعروں سے خراج عقیدت پیش کیا۔ جلوس جوں جوں آگے بڑھتا رہا، لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ راستے میں چھتوں سے عورتیں مادر ملت کے جنازے پر پھول کی پتیاں نچھاور کر رہی تھیں۔ جلوس دس بجے پولو گراؤنڈ پہنچ گیا جہاں میونسپل کارپوریشن نے نماز جنازہ کا انتظام کیا تھا۔ وہاں جنازہ پہنچنے سے پہلے ہزاروں لوگ جمع ہو گئے تھے۔ دوسری نماز جنازہ مفتی محمد شفیع نے پڑھائی۔ نماز جنازہ کے بعد میت کو دوبارہ گاڑی میں رکھ دیا گیا۔ اب ہجوم لاکھوں تک پہنچ چکا تھا۔

قائداعظم کے مزار کے قریب محترمہ کا جنازہ میوزیکل فونٹین اور الفنسٹن اسٹریٹ [موجودہ زیب النسا اسٹریٹ] سے ہوتا ہوا جب آگے بڑھا تو ہجوم کی تعداد چار لاکھ تک پہنچ گئی اور پولیس کو جنازے کے لیے راستہ بنانا مشکل ہو گیا۔

عورتوں، بچوں اور مردوں کا ایک سیلاب تھا جو قائداعظم کے مزار کی جانب بڑھ رہا تھا۔ راستے میں میت پر پھول کی پتیاں نچھاور کی جاتی رہیں۔ لوگ کلمہ طیبہ، کلمہ شہادت اور آیات قرآنی کی تلاوت کر رہے تھے۔ جنازے کا جلوس جب مزار قائد کے احاطے میں داخل ہوا تو سب سے پہلے وزیر خارجہ شریف الدین پیرزادہ نے اسے کندھا دیا۔

اس وقت دوپہر کے بارہ بجے تھے اور لوگوں کی تعداد چھ لاکھ سے تجاوز کر چکی تھی، کیونکہ مادر ملت کی موت پر تمام دکانیں، تعلیمی ادارے، سرکاری دفاتر، سینما گھر وغیرہ بند تھے اور حکومت کی طرف سے عام تعطیل ہونے کے باعث اہل کراچی نے بانی پاکستان کی ہمشیرہ

کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ان کے لیے ان کے جنازے کے جلوس میں شرکت کی تھی۔ اس بے پناہ ہجوم کے باعث گڑبڑ یقینی تھی۔

اچانک کچھ لوگوں نے جنازے کے قریب آنے کی کوشش کی۔ پولیس نے پرامن طریقے سے انھیں پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی تو ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور پولیس کو لاٹھی چارج کرنا پڑا۔ آنسو گیس کا استعمال کیا۔ جوابی کارروائی میں پولیس پر پتھراؤ ہوا۔ پولیس کے کئی سپاہی زخمی ہوئے۔ ایک پیٹرول پمپ اور ڈبل ڈیکر کو آگ لگا دی گئی۔ ایک شخص اس حادثے کا شکار ہوا اور کئی بچے عورتیں اور مرد زخمی ہوئے۔

یہ سب کچھ عین اس وقت پر ہوا جب محترمہ سے ابدی جدائی کے غم میں ہر شخص سوگوار تھا۔ محترمہ فاطمہ جناح کی نماز جنازہ میں پانچ لاکھ افراد کا اجتماع زبردست خراج تحسین ہے۔ بارہ بج کر پینتیس منٹ پر کے ایچ خورشید اور ایم اے ایچ اصفہانی نے لرزتے ہاتھوں، کپکپاتے ہونٹوں اور بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ خاتونِ پاکستان کے جسد خاکی کو قبر میں اتارا۔ جونہی میت کو لحد میں اتارا گیا، ہجوم دہاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ تدفین کی آخری رسومات میں شیعہ عقیدے کے مطابق تلقین پڑھی گئی، جس میں فاطمہ بنت پونجا پکارا گیا۔ قبر کو آہستہ آہستہ بند کیے جانے لگا اور 12 بج کر 55 منٹ پر قبر ہموار کر دی گئی۔

یہ تو تھی محترمہ فاطمہ جناح کی موت اور تدفین کی کہانی، لیکن فاطمہ جناح کی موت پورے معاشرے کے لیے ایک عجب کہانی تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ محترمہ کی موت طبعی طریقے سے نہیں ہوئی بلکہ انھیں قتل کیا گیا تھا۔ جنوری 1972 میں غلام سرور نامی ایک شخص نے محترمہ فاطمہ جناح کی وفات کے حوالے سے عدالت میں ایک درخواست سماعت کے لیے دائر کی۔ اس درخواست کے بارے میں اخبارات میں شائع ہونے والی خبر کے مطابق ایڈیشنل سٹی مجسٹریٹ ممتاز محمد بیگ نے ایک شخص غلام سرور ملک کی دفعہ 176 ضابطہ فوجداری کے تحت درخواست کی سماعت کے لیے 17 جنوری کی تاریخ مقرر کی ہے۔

غلام سرور ملک نے اپنی درخواست میں کہا ہے کہ میں پاکستان کا ایک معزز شہری ہوں اور محترمہ فاطمہ جناح سے مجھے بے انتہا عقیدت ہے۔ مرحومہ قوم کی معمار اور عظیم قائد تھیں۔ انھوں نے تمام

زندگی جمہوریت اور قانون کی سربلندی کے لیے جدوجہد کی۔ 1964 میں جب انھوں نے صدارتی انتخابات میں حصہ لیا تو وہ عوام کی امیدوں کا مرکز بن گئیں۔ وہ اس ٹولے کی راہ میں جو ہر صورت اقتدار سے چمٹا رہنا چاہتا تھا، زبردست رکاوٹ تھیں اور یہ ٹولہ ہر قیمت پر ان سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

7 جولائی 1964 کو محترمہ فاطمہ جناح رات کے گیارہ بجے تک ایک شادی میں شریک تھیں اور وہ ہشاش بشاش تھیں جبکہ 9 جولائی کو اچانک یہ اعلان کر دیا گیا کہ وہ انتقال کر گئی ہیں۔ ان کی تجہیز و تکفین کے وقت عوام کو جنازے کے قریب نہیں جانے دیا گیا اور یہاں تک کہ انھیں سپرد خاک کرنے تک ان کے آخری دیدار کی اجازت بھی نہیں دی گئی تھی۔ اس دوران جو آخری دیدار کرنا چاہتے تھے ان پر لاٹھی چارج کیا گیا اور آنسو گیس پھینکی گئی۔

اس وقت بھی یہ افواہیں عام تھیں کہ محترمہ فاطمہ جناح کے جسم پر زخموں کے نشانات ہیں لیکن ان افواہوں کو دبا دیا گیا۔ غلام سرور ملک نے اپنی درخواست میں کہا کہ مجھے یہ تشویش رہی کہ محترمہ فاطمہ جناح کو کہیں قتل نہ کیا گیا ہو۔ بعدازاں حسن اے شیخ اور دیگر معزز ہستیوں نے اس سلسلے میں اپنے شک وشبہ کا اظہار بھی کیا تھا اور یہ معاملہ اخبارات میں نمایاں سرخیوں کے ساتھ شائع کیا گیا اور اداریے بھی لکھے گئے۔

2 اگست 1971 کو ایک مقامی اردو روزنامے میں یہ خبر شائع ہوئی کہ محترمہ فاطمہ جناح کو قتل کیا گیا ہے۔ اس خبر میں غسل دینے والوں کے بیانات بھی شائع ہوئے، جس میں ہدایت علی عرف کلو غسال نے یہ کہا تھا کہ محترمہ فاطمہ جناح کے جسم پر زخموں کے گہرے نشانات تھے اور ان کے پیٹ میں سوراخ بھی تھا جس سے خون اور پیپ بہہ رہی تھی۔ غسال نے کہا تھا کہ محترمہ کے خون آلود کپڑے اس کے پاس موجود ہیں، لیکن اس وقت کی حکومت نے نہ تو اس کی تردید کی اور نہ ہی اس معاملے میں انکوائری کی ہدایت کی گئی۔ اس کے علاوہ اس معاملے کی دیگر غسالوں نے بھی تصدیق کی تھی۔

غلام سرور ملک نے اس سلسلے میں اخبارات کی کاپیاں بھی ثبوت کے طور پر عدالت میں پیش کی ہیں۔ انھوں نے اپنی درخواست کے آخر میں عدالت سے درخواست کی ہے کہ وہ اپنے خصوصی اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں عدالتی تحقیقات کرے۔ اس مقدمے میں اختر علی محمود ایڈووکیٹ پیروی کر رہے ہیں۔

فاطمہ جناح مادرِ ملت ہیں، اور ان کے جنازے اور تدفین میں ہونے والی یہ بدمزگی ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے۔ کیونکہ یہ ایک حساس معاملہ ہے، اس لیے ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ اسے اپنی سابقہ روایت کو برقرار رکھتے ہوئے پڑھنے والوں کی خدمت میں مکمل تحقیق کے بعد تاریخی حوالوں کے ساتھ پیش کریں، تا کہ کوئی سقم باقی نہ رہ جائے۔

اس مضمون سے ہمارا مقصد کسی بھی شخص، فرد، یا ادارے پر انگلی اٹھانا نہیں۔ ہم نہ ہی یہ کہتے ہیں کہ خدانخواستہ انھیں قتل کیا گیا، اور نہ ہی یہ کہ اس ساری بدمزگی سے کسی نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ ہمارا مقصد صرف ان حقائق کو سامنے لانا تھا جن سے آج کے نوجوانوں کی بڑی تعداد لاعلم ہے۔ ہاں ایک اور سوالیہ نشان یہ ہے کہ جن تحقیقات کے وعدے کیے گئے تھے، وہ وعدے کیا ہوئے؟

نوٹ: محترمہ فاطمہ جناح کی تاریخ وفات 9 جولائی 1967 ہے، جبکہ وفات کی خبر 11 جولائی کے اخبارات میں شائع ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں تیز رفتار مواصلات کی عدم موجودگی کے سبب اخبارات دوسرے شہروں تک دیر سے پہنچا کرتے تھے، جس کی وجہ سے اخبار پر اگلے دن کی تاریخ شائع کی جاتی تھی۔ اس لیے اخبار کی لوح اور خبر میں موجود تاریخوں میں ایک کے بجائے دو دن کا فرق ہے، لہٰذا خبر کے ساتھ لکھی گئی تاریخ کو ہی درست تصور کیا جائے۔

فاطمہ جناح اور ریڈیو کے فرمانبردار ٹرانسمیٹر

فاطمہ جناح کی تدفین اور تقریر کے موضوع پر گزشتہ بلاگ میں پیش کیے جانے والے حقائق کے حوالے سے پڑھنے والوں نے بے شمار تبصرے کیے۔ ان تبصروں میں کچھ لوگوں کا خیال یہ تھا کہ ہم نے غالباً تاریخی حقائق مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان دوستوں کا خیال اپنی جگہ، لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ حالات اسی طرح ہیں جس طرح ہم نے بیان کیے ہیں۔

محترمہ فاطمہ جناح کی تقریر میں رکاوٹ ڈالنے کے حوالے سے ہم نے قدرت اللہ شہاب کی کتاب کا حوالہ دیا تھا۔ ہمارے کچھ دوستوں اور بلاگ پڑھنے والوں کی رائے یہ تھی کہ ایسا ممکن نہیں۔ ان کی تسلی کے لیے ایک بار پھر ہمیں ثبوت وشواہد پیش کرنے کی ضرورت ہوئی۔ اب ہم یہ مزید شواہد پڑھنے والوں کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ مذکورہ تقریر کے بعد محترمہ فاطمہ جناح اور زیڈ اے بخاری کے مابین ہونے والی خط وکتابت خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ محترمہ فاطمہ جناح نے ایوب خان کی جانب سے اسکندر مرزا کو معزول کرنے کے عمل پر اطمینان کا اظہار کیا تھا۔

جمیل احمد کی مرتب کردہ کتاب مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح: تقاریر پیغامات اور بیانات (1967-1947) کے صفحہ 59 اور 60 پر فاطمہ جناح اور زیڈ اے بخاری کے درمیان ہونے والی خط وکتابت کا متن کچھ یوں ہے۔

مس جناح کے نام کنٹرولر آف براڈ کاسٹنگ مسٹر زیڈ اے بخاری کے معذرت نامے کا متن:

"میں نہایت خلوص کے ساتھ گزشتہ رات آپ کی نشری تقریر میں بہت تھوڑے سے وقت کے لیے ایک مرتبہ گڑبڑ ہونے پر معذرت خواہ ہوں۔ گزشتہ ہفتے کے روز ہمارے جنریٹروں میں کچھ خرابی ہو گئی تھی اور ہم نے کل نیشنل ہک اپ کے دوران آٹھ بجے رات سے سوا نو بجے رات تک اپنے ٹرانسمیٹروں کو پوری بجلی فراہم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ مجھے نہایت افسوس ہے کہ ٹرانسمیٹروں کو پوری بجلی فراہم کرنے میں پوری طرح

کامیاب نہ ہو سکے اور نتیجتاً ہمارے سننے والوں اور ہمارے ٹرانسمیٹر مانیٹروں نے ہماری تیسری نشریات کے دوران میں کچھ خرابی محسوس کی۔ تاہم میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس خرابی نے آپ کی نشری تقریر کی روانی کو متاثر نہیں کیا جس کا اظہار ہمارے ریجنل اسٹیشنوں سے موصولہ رپورٹوں سے ہوتا ہے۔"

مس جناح کے جواب کا متن:

بحوالہ آپ کا مراسلہ نمبر پی یو جی 1(16)/ 51 مورخہ 12 ستمبر 1951۔ گیارہ ستمبر کو آپ نے میرے براڈ کاسٹ کی کاپی شام سات بجے منگوا بھیجی تھی اور آٹھ بجے شام آپ بنفس نفیس نہایت مشوش حالت میں میری رہائش گاہ پر تشریف لائے تھے اور آپ نے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ مجھ سے اپنی تقریر میں سے بعض جملے حذف کرنے کی استدعا کی تھی۔ میں نے جذبات سے بالاتر ہو کر آپ کو سمجھانے کی کوشش کی تھی اور آپ کو بتایا تھا کہ اگر ایک خود مختار جمہوری ملک میں کسی قسم کی آزادی اظہار نہیں ہے تو میں اپنی تقریر کو تبدیل کرنے کے بجائے اپنی تقریر سے دستبردار ہونے کو ترجیح دوں گی جو خود آپ کی فرمائش پر نشر کی جا رہی تھی۔

معمول کے مطابق براڈ کاسٹ کے ختم ہونے کے بعد آپ نے میری ریکارڈ شدہ تقریر مجھے سنوانے کے لیے کہا تھا۔ اس میں کسی قسم کی کوئی خرابی نہیں تھی۔ یہ کتنی حیران کن بات ہے کہ اس وقت نہ تو آپ نے اور نہ آپ کے عملے کے کسی رکن نے ٹرانسمیٹر وں میں کسی نقص یا خرابی کا ذکر تک کیا تھا۔ مجھے اپنے گھر واپسی پر اپنی تقریر کی براڈ کاسٹ میں خرابیوں کا پتہ چلا تھا اور یہ بات میرے لیے موجب حیرت تھی کہ یہ خرابیاں عین انھی جملوں کے وقت پیدا ہو گئی تھیں جن کو حذف کرنے کی آپ نے درخواست کی تھی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ٹرانسمیٹر نہایت مستعد اور فرماں بردار قسم کے ہیں جو آپ کی سہولت کے پیش نظر نقص پیدا کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔

جن لوگوں نے میری اصل براڈ کاسٹ میں رکاوٹ ڈالنے اور خرابی پیدا کرنے کی کوشش کی اور میری آواز کو لوگوں تک پہنچنے سے روکا اور جن جملوں کو انھوں نے ختم کرنے کی

کوشش کی، وہ دراصل ان کی اہمیت کو اجاگر کر گئے۔ آپ نے اپنے خط میں اپنے ریجنل اسٹیشنوں سے میری براڈ کاسٹ کی روانی کی رپورٹوں کا حوالہ دیا ہے، اگر آپ ان سے مطمئن ہوتے تو پھر کسی قسم کی معذرت کی ضرورت نہیں تھی۔ جہاں تک اس ضمن میں لوگوں کی شکایت کا تعلق ہے تو ان ناراض ہونے والوں کو معقول طور پر مطمئن کرنا آپ کا کام ہے۔ آپ کی وضاحت نہ تو تسلی بخش ہے اور نہ قائل کرنے والی۔ ایسی صورت میں معذرت اقبال جرم کا محض ایک ملائم سا انداز ہے۔"

زیڈ اے بخاری ایک مایہ ناز صداکار تو تھے ہی، اس کے علاوہ ایک سخت قسم کے منتظم بھی تھے۔ وہ اپنی شخصیت کے سوا کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ شاید اسی زعم میں یا حکومت وقت کی ہدایت پر انھوں نے محترمہ فاطمہ جناح کی تقریر کو سنسر کرنے کا کارنامہ انجام دیا تھا۔ ان کے مزاج کے حوالے سے نامور صحافی برہان الدین حسن اپنی کتاب پس پردہ کے صفحہ 36-35 پر لکھتے ہیں:

پاکستان کے ابتدائی دس برسوں کے دوران میں سیاسی رہنما اور ان کی جماعتیں اپنی ریشہ دوانیوں اور سازشوں میں اس قدر مصروف رہیں کہ وہ ریڈیو پر حکومتی پالیسیوں یا اپنی شخصیات کی تشہیر کرنے پر توجہ نہیں دے سکیں۔ ان دنوں وزارت اطلاعات کا سربراہ بھی ایک جونیئر سرکاری ملازم ہوتا تھا جس میں نہ تو اتنی صلاحیت ہوتی تھی نہ وہ اس قدر اثر ورسوخ کا مالک ہوتا تھا کہ زیڈ اے بخاری، محمد سرفراز یا غنی اعرابی جیسے پیشہ ور افراد کو قابو کر سکتا۔

ان دنوں یہ کہانی عام تھی کہ سندھ کے مشہور صحافی جنھیں کسی حکومت میں وزیر اطلاعات کے طور پر شامل کر لیا گیا تھا، ریڈیو پاکستان کے براڈ کاسٹنگ ہاؤس کے دورے پر آئے۔ جب وزیر ڈائریکٹر جنرل زیڈ اے بخاری سے ملاقات کر رہے تھے تو ایک چپراسی چائے کی ٹرے لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ بخاری صاحب نے اپنی سیٹ سے ایک دم اٹھ کر چپراسی کے ہاتھ سے ٹرے لی اور بڑے احترام سے وزیر کے سامنے رکھ دی۔ وزیر بخاری صاحب سے کہنے لگے، "ہم پرانے دوست ہیں۔ آپ کو یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ میں چونکہ وزیر بن گیا ہوں اس لیے میری خوشامد کی جائے۔" بخاری صاحب نے فوراً جواب دیا، ایسا

جواب صرف وہی دے سکتے تھے، ”سر، میں آپ کی خوشامد نہیں کر رہا بلکہ اپنے چپراسی کو خوش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کیونکہ مجھے یہ ڈر ہے کسی دن وہ میرا وزیر نہ بن جائے۔“

محترمہ فاطمہ جناح نے 1958 میں اسکندر مرزا کی حکومت کے خاتمے اور جنرل ایوب کے اقتدار سنبھالنے پر اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یقیناً ملک میں سیاسی عدم استحکام، اقربا پروری اور رشوت خوری تھی۔ ان معاملات کے سبب عوام معاشی و معاشرتی اور سماجی بدحالی کا شکار تھے۔ جمیل احمد کی کتاب مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح: تقاریر پیغامات اور بیانات (1967-1947) کے صفحہ 281-280 کے مطابق 1958 کو جاری کردہ ایک بیان میں محترمہ فاطمہ جناح نے اس وقت کی ملکی صورت حال اور اسکندر مرزا کی معزولی پر کچھ ان خیالات کا اظہار کیا:

158۔ میجر جنرل اسکندر مرزا کی معزولی پر اخبارات کو بیان۔ 1958:

سیاسی منظر سے میجر جنرل اسکندر مرزا کے چلے جانے سے پاکستانی عوام نے سکھ اور اطمینان کا سانس لیا ہے۔ گزشتہ تین سال کے دوران سربراہ مملکت کی حیثیت سے وہ ملک کا کوئی بھی مسئلہ حل نہ کر سکے۔ اس کے بجائے ملک میں انتشار اور افتراق کو فروغ حاصل ہوا اور ملک سیاسی اور اقتصادی تباہی کے دہانے پر پہنچ گیا۔ عوام کی حیثیت ایک خاموش تماشائی کی رہ گئی تھی۔ انھیں شدید مشکلات اور ہر طرح کی سماجی برائیوں کا سامنا تھا۔

جنرل ایوب خان کی حکومت میں ایک نئے عہد کا آغاز ہوا ہے۔ مسلح افواج نے سماجی برائیوں اور انتخابی بدعنوانیوں کے خاتمہ کا بیڑا اٹھایا ہے تاکہ عوام کے اندر اعتماد، تحفظ اور استحکام کی فضا پیدا ہو اور ملک میں صورتحال معمول پر آ سکے۔ مجھے امید ہے اور دعا ہے کہ خدا انھیں طاقت اور عقل دے کہ یہ لوگ اپنے نیک مقاصد میں کامیاب ہو سکیں۔ گزشتہ تین ہفتوں کے دوران لوگ سکون اور آرام سے رہے ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مطمئن ہیں اور صورتحال کو سمجھتے ہیں۔ ہمارے سامنے مقصد یہ ہے کہ ان تمام منفی قوتوں کو ختم کر دیں جو ملک پر مسلط ہیں اور ملک کو دوبارہ مستحکم حالت میں لے آئیں، تاکہ ہم صحیح جمہوریت کی طرف گامزن ہو سکیں۔ ہم سب کے سامنے یہ ماٹو ہونا چاہیے کہ خودغرضی اور ذاتی مفاد سے بالاتر رہ کر ملک کی خدمت کریں۔ اس کا زیادہ انحصار آپ پر اور آپ کے

جذبہ حب الوطنی پر ہے۔

خدا نے چاہا تو یہ تاریک دن جلد ہی ختم ہو جائیں گے اور پاکستان کو اقوام عالم میں ویسا ہی مقام حاصل ہوگا جیسا کہ قائداعظم نے سوچا تھا۔ آیئے ایمان، اتحاد اور تنظیم کے ساتھ ایک قوم کی حیثیت سے آگے بڑھیں۔

غالباً اس وقت محترمہ فاطمہ جناح کو قطعاً اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ چند برسوں بعد انھیں ایوب خان کے اقتدار کے خاتمے کے لیے چلائی جانے والی مہم کی قیادت کرنی ہوگی۔ ایوب خان کو بھی شاید اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ محترمہ فاطمہ جناح ان کے لیے کوئی بہت زیادہ مشکلات پیدا کر سکتی ہیں۔ انھیں اپنی کامیابی کا مکمل یقین تھا، اور ایسا ہی ہوا۔ وہ صدارتی انتخابات میں کامیاب تو ہو گئے لیکن انتخابی نتائج نے انھیں حواس باختہ کر دیا تھا۔ ان کی اس کیفیت کو برہان الدین حسن اپنی کتاب پس پردہ کے صفحہ 56-55 پر یوں بیان کرتے ہیں:

> 1965 کا صدارتی الیکشن: ایوب خان کے سیکرٹری اطلاعات اور ان کے سوانح نگار الطاف گوہر نے اس وقت کا نقشہ کھینچا ہے جب منتخب صدر اپنی کامیابی کے بعد تقریر ریکارڈ کرانے کی تیاریاں کر رہے تھے: ”ایوب خان کی تقریر رات کے 10 بجے نشر ہونی تھی لیکن شام کے 7 بجے ہی سے ایوب خان کو خوشامدیوں اور حاشیہ برداروں کے ہجوم نے گھیرا ہوا تھا جو سب اس بارے میں تجاویز پیش کر رہے تھے کہ صدر کو اپنی 'فاتحانہ' تقریر میں کیا کہنا چاہیے۔ سیکرٹری اطلاعات نے صدر کے لیے تقریر پہلے ہی تیار کر لی تھی۔ ایوب خان نے، جو ابھی تک حواس باختہ تھے، مائیکروفون پر کسی قسم کے جذبات کا اظہار کیے بغیر وہی تقریر پڑھی اور ان کے چہرے پر کئی گھنٹے تک پریشانی چھائی رہی۔
>
> یہ جان کر ان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی کہ وہ شکست سے بال بال بچے ہیں اور لوگوں نے ان کی نافذ کردہ آئینی اصلاحات کو تقریباً یکسر مسترد کر دیا ہے۔ کل 80 ہزار ارکان میں سے 49951 نے ایوب خان کے حق میں اور 38691 نے مادر ملت کے حق میں ووٹ دیا۔ تاہم مشرقی پاکستان میں یہ فرق بہت ہی معمولی تھا جہاں فاطمہ جناح نے 18434 ووٹ حاصل کیے اور ایوب خان کو 21012 ووٹ ملے۔ مغربی پاکستان کی

صورتحال قدرے مختلف تھی۔ یہاں کراچی کے سوا تمام ڈویژنوں اور اضلاع میں ایوب خان کا پلڑا بھاری رہا۔"

مذکورہ تمام معلومات تاریخی حقائق پر مبنی ہیں۔ تاریخ نویسی ایک بے رحم شعبہ ہے۔ یہ آپ کو ایسی معلومات فراہم کرتا ہے جو آپ کو چونکا دیتی ہے، ذہن کے بند دریچوں کو کھولنے پر مجبور کرتی ہے۔ سکہ بند اور درباری قسم کے تاریخ دان ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ اپنی سوچ کے دائرے کو محدود رکھیں۔ ایک مخصوص وقت تک تو وہ اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگ ایسے مخصوص دائروں سے باہر نکل آتے ہیں۔ وہ سوال کرتے ہیں، اور جب انھیں اپنے سوالوں کا جواب نہیں ملتا تو اس کے لیے کھوجنا شروع کرتے ہیں۔ یہ ایک مثبت عمل ہے اور جاری رہنا چاہیے۔ ہمیں تاریخ کو مسخ کرنے کے بجائے اس میں پوشیدہ تلخ حقائق منظرِعام پر لانے چاہییں تاکہ بحیثیت قوم اپنی درست سمت کا تعین کر سکیں۔

چودھری محمد علی: بااثر بیوروکریٹ یا معصوم وزیر اعظم؟

چودھری محمد علی تقسیم سے قبل برطانوی راج کے دور میں اکاؤنٹنٹ کے عہدے پر فائز تھے لیکن تقسیم کے بعد انھوں نے بڑی تیزی سے ترقی کی منازل طے کیں۔ وہ تقسیم ہند کے بعد متحدہ پاکستان کے چیف سیکرٹری بنے۔ وہ 1956 کے آئین کے خالق بھی تھے۔ ان کا شمار لیاقت علی خاں کے بہت قریبی ساتھیوں میں ہوتا ہے۔ قائد اعظم سے لیاقت علی خاں کی آخری ملاقات میں بھی وہ ان کے ہمراہ تھے۔ لیاقت علی خاں کے قتل کے بعد بنتی بدلتی حکومتوں کے عروج وزوال میں بھی شریک تھے۔

ان کی قائد اعظم سے آخری ملاقات کا ذکر محترمہ فاطمہ جناح نے اپنی کتاب مائی برادر میں بھی کیا ہے۔ اس کتاب میں فاطمہ جناح کے بقول چودھری محمد علی اور لیاقت علی خاں یہ دیکھنے آئے تھے کہ قائد اعظم مزید کتنے دن زندہ رہیں گے۔ قریب المرگ قائد سے اس ملاقات اور ان کی وفات کا ذکر چودھری محمد علی نے اپنی کتاب ظہورِ پاکستان میں کیا ہے۔ کتاب کے صفحہ 448 پر وہ لکھتے ہیں:

> ان (قائد اعظم) کے انتقال سے چند روز قبل کوئٹہ میں ان سے ملاقات کا موقع ملا۔ میں وہاں ان کی خدمت میں تنازع کشمیر کی تازہ ترین صورت حال پیش کرنے اور آئندہ پالیسی کے لیے ان کی ہدایات حاصل کرنے کے لیے گیا تھا۔ وہ بسترِ علالت پر تھے۔ ان کی توانائی آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی لیکن ان کی اصابتِ فکر پہلے کی طرح ہی تھی۔ ان کا عزم اسی طرح بلند تھا، ان کی آنکھوں میں وہی پرانی چمک تھی، اور اپنی قوم کے مقدر میں انھیں وہی پہلے کی طرح یقین تھا، جو ہمیشہ ان کا منفرد وصف رہا ہے۔

چودھری محمد علی وزیر اعظم لیاقت علی خاں کے ہمراہ قائد اعظم سے اہم معاملات پر ہدایات لینے کراچی سے کوئٹہ پہنچے تھے۔ جناح صاحب نے اپنا آخری وقت زیارت ریذیڈنسی میں گزارا تھا۔ تعجب کی بات ہے کہ چودھری محمد علی پاکستان کے سیکرٹری جنرل تھے اور زیارت اور کوئٹہ کے درمیان فرق ہی محسوس نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے اس ملاقات کے متعلق جناح صاحب کے کسی بھی جملے کا حوالہ دینا مناسب نہیں سمجھا جس سے اندازہ ہوتا کہ جناح صاحب کے پاکستان کے مستقبل کے حوالے سے کیا خیالات

تھے۔ انھوں نے ایسے شخص کی، جس کی توانائی آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی، آنکھوں کی چمک سے اس کے خیالات کا اندازہ کر لیا۔ یہ سلسلہ صرف یہیں ختم نہیں ہوا، بلکہ جناح صاحب کی وفات کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

11 ستمبر 1948 کو انھیں (قائداعظم) کراچی لایا گیا اور اسی دن شام کو انھوں نے 72 سال کی عمر میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

چودھری صاحب جو کہ پاکستان کے سیکرٹری جنرل تھے، اس بات سے بھی ناواقف تھے کہ محمد علی جناح کو جب پرواز تشویش ناک حالت میں لے کر کراچی پہنچی تو ایئر پورٹ پر کوئی سرکاری اہلکار (بشمول چودھری صاحب کے) موجود نہ تھا۔ جناح صاحب کو لینے کے لیے ایک ہی ایمبولینس بھیجی گئی تھی جو کہ راستے میں قائداعظم سے پہلے ہی دم توڑ گئی۔ اس طرح کے اور بھی کئی سوالات ہیں جو ان کی معصومیت کو مزید یقینی بناتے ہیں۔

پیر علی محمد راشدی نے اپنی کتاب رودادِ چمن میں چودھری محمد علی کی اس دروں بینی کا ذکر کیا ہے کہ انھیں جناح صاحب کی وفات کے بعد اندازہ ہو گیا تھا کہ جناح صاحب کا منظورِ نظر جوگندر ناتھ منڈل کس قدر "ملک دشمن" تھا۔ چودھری محمد علی ظہورِ پاکستان کے صفحہ 439 پر اس حوالے سے لکھتے ہیں:

مرکزی کابینہ کو صرف ایک دھچکا لگا، جب وزیرِ محنت جوگندر ناتھ منڈل بھاگ کر ہندوستان چلا گیا۔ بنگال کے ہندو اچھوتوں کے رہنما کی حیثیت سے اس نے پاکستان کی جدوجہد میں قائداعظم کا بڑی وفاداری سے ساتھ دیا تھا۔ قائداعظم کی وفات کے بعد اس کا رویہ بتدریج تبدیل ہوتا گیا۔ پاکستان کی آئین ساز اسمبلی میں اعلیٰ ذات کے ہندوؤں نے اس پر ڈورے ڈالنے شروع کیے اور اسے آمادہ کرنے لگے کہ وہ ان کی قیادت بھی سنبھال لے۔

اس کے ساتھ ساتھ ہندوستانی ہائی کمیشن اور منڈل کے مابین بھی رشتے استوار ہونے لگے۔ لیاقت علی خاں اس صورت حال سے باخبر تھے اور میں بھی احتیاطی تدابیر سے کام لے رہا تھا کہ زیادہ راز دار دستاویزات اس کے ہاتھ نہ لگیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ منڈل کو بھی

پتہ چل گیا تھا کہ اس کی نگرانی کی جارہی ہے۔ وہ ڈر گیا اور بھاگ کر ہندوستان چلا گیا۔
جوگندر ناتھ منڈل کا محب وطن ہونا یا نہ ہونا اپنی جگہ، انھیں تو قائداعظم کی 11 ستمبر والی تقریر پر بھی شکوک وشبہات تھے۔ انھیں یہ گمان تھا کہ جناح صاحب نے جوشِ جذبات اور جوشِ خطابت میں جس طرح مسلمانوں اور ہندوؤں کو برابر قرار دیا تھا، وہ مناسب نہ تھا۔ لہٰذا تقریر ختم ہوتے ہی نوکرشاہی متحرک ہو گئی اور تقریر کا پورا متن اخبارات میں شائع ہونے سے روکنے کے لیے کوششیں شروع ہو گئیں۔

ان تمام افراد کی بدنصیبی یہ تھی کہ اس بات کا علم روزنامہ ڈان کے ایڈیٹر الطاف حسین کو ہو گیا۔ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ آخر یہ سب کس کے حکم پر ہو رہا ہے۔ کیا یہ جناح صاحب کے اپنے حکم پر کیا جارہا ہے یا پھر کسی اور کی ہدایات سے ہو رہا ہے؟ معروف صحافی ضمیر نیازی نے اپنی کتاب صحافت پابندِ سلاسل کے صفحہ 152 اور 153 پر اس واقعے کو ڈان کے صحافی ایم اے زبیری کے خط کے حوالے سے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ زبیری کے بیان کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

الطاف حسین یہ جاننا چاہتے تھے کہ کون شخص یہ عبارت حذف کروانا چاہتا ہے۔ مجھے مجید ملک کو تلاش کرنے کی ذمے داری سونپی گئی۔ میں نے انھیں الطاف حسین کا پیغام پہنچایا۔ ملک صاحب نے چودھری محمد علی کو فون کیا، جو اس وقت کیبنٹ ڈویژن کے سیکرٹری تھے۔ ان سے گفتگو پوری کرنے کے بعد ملک نے مجھے فون پر کہا کہ "یہ کوئی ایڈوائس نہیں بلکہ صرف ایک رائے ہے۔ قائد کی تقریر کو سنسر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" اور کہا کہ ''ایسا فیصلہ کون شخص کرسکتا ہے؟''

جب میں واپس دفتر آیا اور یہ سب الطاف حسین کو بتایا تو یقین کیجیے کہ وہ میز پر ہاتھ مار مار کر ہنسنے لگے۔

ضمیر نیازی چودھری صاحب کے بارے میں مزید لکھتے ہیں:

1949 سے 1958 تک کے نام نہاد جمہوری دور میں بھی سیاست دان ملک کا انتظام چلانے میں آزاد نہیں رہے۔ جو شخص اس وقت بیوروکریسی کی مشینری کا انچارج تھا، وہ چودھری محمد علی تھے۔

چودھری محمد علی کی صلاحیتیں اپنی جگہ، مگر اس بات سے انکار ممکن نہیں ہے کہ وہ پاکستان میں حکومتیں تبدیل

کرنے میں شریک ہوں یا نہ ہوں، ان واقعات کے عینی گواہ ضرور تھے۔ ڈاکٹر صفدر محمود اپنی کتاب مسلم لیگ کا دورِ حکومت کے صفحہ 244 پر لکھتے ہیں:

علاوہ ازیں، چودھری محمد علی نے مصنف کو ایک ذاتی ملاقات میں مزید بتایا کہ جب بوگرا کو غلام محمد کے سامنے لایا گیا تو غلام محمد نے تکیے کے نیچے سے ریوالور نکال لیا اور جب تک بوگرا نے اس کی تجویز سے اتفاق نہ کر لیا، گورنر جنرل اسے قتل کرنے کی دھمکیاں دیتا رہا۔ انھوں نے مزید بتایا کہ جب یہ کارروائی ہو رہی تھی تو ایوب خان ریوالور ہاتھ میں پکڑے پس پردہ کھڑے تھے۔

چودھری محمد علی ایک با اثر بیوروکریٹ تھے۔ لیاقت علی خاں سے لے کر غلام محمد کے دور تک ان کا شمار فیصلہ ساز ٹولے کے اہم ارکان میں ہوتا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنی وزارتِ عظمیٰ کے دور میں ملک کو آئین کا تحفہ دیں تا کہ ان کا نام تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے۔ ان کے آئین میں صدر کا عہدہ سب سے اعلیٰ تھا لیکن اس دستور میں ایک قومی اسمبلی کی گنجائش بھی تھی۔ 2 مارچ 1956 کو گورنر جنرل اسکندر مرزا نے اس آئین کی منظوری دی اور 23 مارچ کو خود صدر مملکت کے عہدے کا حلف اٹھا لیا۔ اسکندر مرزا کے صدر بنتے ہی محمد علی کو یہ احساس ہو گیا کہ ان کے دن تھوڑے رہ گئے ہیں۔ آخر کار ستمبر 1956 میں ہی چودھری محمد علی نے استعفیٰ دے دیا۔ ایوب خان اپنی کتاب فرینڈز ناٹ ماسٹرز کے صفحہ 91 اور 92 پر لکھتے ہیں:

چودھری محمد علی نے جیسے تیسے آئین تیار کر لیا جو 23 مارچ 1956 کو نافذ کیا گیا۔ یہ بڑی مایوس کن دستاویز تھی۔ وزیر اعظم نے، جو اس امر کے سخت متمنی تھے کہ انھیں تاریخ میں آئین کے مصنف کی حیثیت سے یاد رکھا جائے، اپنی کوشش کو کامیاب بنانے کے لیے ہر قسم کے نظریات کو اس آئین میں سمو لیا تھا۔ آئین کیا تھا، بس چوں چوں کا مربہ تھا۔

یہ آئین جس طرح کا بھی تھا، ایوب خان کو بنیادی اعتراض ایک بات پر تھا کہ اس آئین میں واضح طور پر اختیارات کی تقسیم کر دی گئی تھی۔ اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

اس آئین نے اقتدار کو صدر، وزیر اعظم اور اس کی کابینہ، اور صوبوں میں تقسیم کر کے اس کی مرکزیت ہی کو نیست و نابود کر دیا تھا، اور کسی کو صاحبِ اختیار نہیں رہنے دیا تھا۔ قدرت کی

ستم ظریفی دیکھیے کہ جس شخص نے آئین بنایا وہی اس کا پہلا شکار بنا۔

اس زمانے میں ایک دفعہ میں نے انھیں بڑی بے بسی کی حالت میں ان کے دفتر میں دیکھا۔ چونکہ وہ وزارتِ دفاع کا قلم دان بھی خود سنبھالے ہوئے تھے، اس لیے مجھے ایک دفاعی سلسلے میں ان سے ملنے کے لیے جانا پڑا۔ انھوں نے مجھ سے کہا، ''میری جماعت نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ بس اب معاملہ ختم ہے۔'' میں نے ان کی ہمت بندھانے کے لیے چند الفاظ کہے مگر ان کی تشفی نہ ہوئی۔ ''نہیں نہیں۔ یہ معاملہ بہت سنجیدہ صورت اختیار کر گیا ہے۔ تم یہ کام کیوں نہیں سنبھال لیتے، اور مجھے اس سے چھٹکارا کیوں نہیں دلا دیتے؟'' میں نے کہا، ''دیکھیے، ان باتوں کا ذکر مجھ سے نہیں، اپنے صدر سے کیجیے اور اس الجھن سے نکلنے کا کوئی مناسب طریقہ سوچیے۔''

سیاست دان اور بیوروکریٹ میں ایک نمایاں فرق جو پاکستان کی سیاسی تاریخ میں بہت واضح ہے، وہ ہے عوامی اور غیر عوامی ہونے کا۔ سیاست دان عوامی ہوتا ہے اور بیوروکریٹ غیر عوامی۔ ایم ایس وینکٹے رامانی کی کتاب پاکستان میں امریکا کا کردار (جس کا اردو ترجمہ قاضی جاوید نے کیا ہے) میں ایوب خان اور چودھری محمد علی کی اس ملاقات کے بارے میں ایک معنی خیز جملہ ہے:

اگر ایوب خان کا بیان درست ہے تو پھر جمہوریت سے چودھری محمد علی کی وابستگی کا پول بھی کھل جاتا ہے۔

چودھری محمد علی اپنی کتاب ظہورِ پاکستان کے صفحہ 453 پر انتہائی انکساری کے ساتھ آئین کی منظوری کے بارے میں لکھتے ہیں:

آئین سازی کا کام لشتم پشتم چلتا رہا، حتیٰ کہ اکتوبر 1954 میں آئین ساز اسمبلی ہی توڑ دی گئی۔ اگلے سال ایک نئی آئین ساز اسمبلی کا انتخاب عمل میں لایا گیا، جس نے ہمت کے ساتھ اس کام کا بیڑا اٹھایا اور 6 ماہ کے اندر اسے مکمل کر دیا۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا آئین اسی قرارداد (قراردادِ مقاصد) پر مبنی تھا، جسے لیاقت علی خاں نے پیش کیا تھا۔ اس آئین کا نفاذ 23 مارچ 1956 سے عمل میں لایا گیا۔ اس آئین کا سنگِ بنیاد، جسے وزیر اعظم کے طور پر مجھے ملک کے اندر پیش کرنے کی عزت حاصل ہوئی، ہر شعبے، انتظامی،

اقتصادی اور سیاسی میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے مابین مساوی شراکت تھا۔

ان کے یہ خیالات اپنی جگہ بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ چودھری صاحب کا کمال یہ تھا کہ انھوں نے کمال دلیری کے ساتھ حکومتیں توڑنے اور بنوانے میں نوکر شاہی کا ساتھ دیا۔ وہ حکمرانوں کے اقدامات کا ہر صورت میں ساتھ دیتے تھے۔ وہ ایک عوامی سیاستدان نہیں تھے اور نہ ہی انھیں اس بات کا تجربہ تھا کہ عوام کے احتجاج سے کس طرح نمٹا جاتا ہے۔ ایسے ہی ایک عوامی احتجاج سے گھبرا کر انھوں نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ اس واقعے کی کہانی نعیم احمد نے اپنی کتاب پاکستان کے پہلے سات وزرائے اعظم کے صفحہ 100 اور 101 پر یوں بیان کی ہے:

> وزیراعظم جس نے کرسی چھوڑ دی: آپ (چودھری محمد علی) نے جس صبح کو وزیراعظم کے عہدے سے استعفیٰ دیا، اس سے ایک رات پہلے ایک جلوس وزیراعظم ہاؤس آیا۔ وہ جلوس کراچی کے آئی جی پولیس گریس کے خلاف تھا۔ گریس کے خلاف لوگ نعرے لگا رہے تھے۔ رات کا وقت تھا۔ جلوس بے قابو ہوتا جا رہا تھا۔ سیکیورٹی افسر نے مجھ سے (جو اتفاق سے اس وقت رات کی ڈیوٹی پر تھا) کہا کہ جلوس کے بارے میں وزیراعظم کو اطلاع کر دی جائے۔ وزیراعظم صاحب اس وقت تک اپنے کمرے کا دروازہ بند کر چکے تھے۔ بجائے اس کے کہ سیکیورٹی افسر وزیرِ اعظم کو مطلع کرنے خود جاتے، انھوں نے مجھ پر ذمہ داری ڈال دی کہ چودھری صاحب کو جلوس کے بارے میں اطلاع دو۔

وزارت عظمیٰ سے فراغت کے بعد چودھری صاحب نے ''نظام اسلام پارٹی'' تشکیل دی۔ انھوں نے ایوب خان اور محترمہ فاطمہ جناح کے مابین صدارتی انتخابات میں محترمہ فاطمہ جناح کا ساتھ دیا اور اس دوران جلسے جلوسوں میں بھی شرکت کرتے تھے۔ ایک بار کرنل مجید ملک نے، جو مرکزی اردو بورڈ لاہور کے ڈائرکٹر تھے، جب چودھری صاحب سے یہ سوال کیا کہ انھوں نے وزارت عظمیٰ بڑی آسانی سے چھوڑ دی، اب جلوسوں میں کیوں شرکت کرتے ہیں؟ پاکستان کے پہلے سات وزرائے اعظم کے صفحہ 102 پر درج ہے کہ چودھری صاحب نے اس سوال کا جواب کچھ یوں دیا:

''مجھے ڈر ہے کہ اگر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پوچھا کہ محمد علی، میں نے تمھیں پاکستان میں کیا مقام دیا تھا، لیکن تم نے میرے پاکستانی بندوں کے لیے کیا کیا؟'' چودھری

صاحب نے فرمایا، ''یہ سوچ کر مجھے خوف آتا ہے لہٰذا میں ان جلسے جلوسوں کی قیادت اللہ تعالیٰ کے سامنے قیامت کے روز جواب دینے کے لیے کر رہا ہوں تا کہ کہہ سکوں کہ اے اللہ! میں نے تو مقدور بھر کی کوشش کی ہے کہ پاکستان میں جمہوریت بحال ہو جائے۔ باقی آئندہ کیا ہوگا تو غیب کا علم تُو ہی جانتا ہے۔''

پاک امریکا دوستی، وزیر اعظم انجن ڈرائیور

محمد علی بوگرا وہ شخصیت تھی جنھیں جب وزیر اعظم پاکستان نامزد کیا گیا تو وہ اس وقت امریکا میں پاکستان کے سفیر تھے۔ گورنر جنرل غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کی برطرفی کے بعد انھیں وزیر اعظم نامزد کیا تھا۔ ان کی نامزدگی کے بارے میں مشہور تھا کہ انھیں امریکا کی پشت پناہی حاصل تھی۔ محمد علی بوگرا غلام محمد سے کس قدر عقیدت رکھتے تھے، اس کا اظہار نعیم احمد کی مرتبہ کتاب پاکستان کے پہلے سات وزرائے اعظم کے صفحہ 73 پر درج ہے۔ مولف ''پاک امریکا دوستی، وزیر اعظم انجن ڈرائیور'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

> امریکا نے ایک دفعہ پاکستان کو دوستی کے تحت ریلوے کے چند انجن دیے۔ ان انجنوں کے وصول کرنے کی رسم ادا کرنی تھی۔ دراصل گورنر جنرل کو یہ انجن وصول کرنے تھے۔ لہٰذا گورنر جنرل صاحب باقاعدہ اپنی گاڑی میں اس مقام کی طرف روانہ ہوئے۔ لیکن بوگرا صاحب ایک فوجی کی موٹر سائیکل کو خود چلانے لگے اور گورنر جنرل کی گاڑی کے آگے آگے پائلٹ کا کردار ادا کیا۔ جب ریلوے اسٹیشن جہاں پر انجن کھڑے تھے، وہاں پہنچے تو انجن کے اندر پہنچ گئے۔ انجن کے ڈرائیور کی ٹوپی لے کر اپنے سر پر پہن لی اور انجن چلانا شروع کر دیا۔

خواجہ ناظم الدین کی برطرفی کے بعد بوگرا کی نامزدگی میں ان کی جو قابلیت ہوگی سو ہوگی، سفیر سے وزیر اعظم تک ان کی ترقی کا یہ پہلو بھی خاص حیثیت رکھتا ہے۔ امریکا میں دوران سفارت کاری ان کا ایک کارنامہ یہ بھی تھا کہ ان کے ہمراہ ایک لبنانی لڑکی بھی تھی جس کا خاندان کینیڈا میں آباد تھا۔ بوگرا صاحب کی اس سے شناسائی کینیڈا میں ہوگئی تھی۔ اس لڑکی کا نام عالیہ تھا اور وہ ان کی اسٹینوگرافر تھی۔ بعد ازاں جب بوگرا صاحب کو امریکا میں سفیر مقرر کیا گیا تو وہ اس لڑکی کو اپنے ہمراہ نیویارک لے آئے۔

عالیہ بیگم سے شناسائی کا سفر یہیں ختم نہیں ہوا بلکہ جب بوگرا صاحب کا تقرر وزیر اعظم پاکستان کی حیثیت سے ہوا تو پاکستان آنے کے بعد عالیہ بیگم کی تقرری وزیر اعظم کی سوشل سیکرٹری کی حیثیت

سے ہوئی۔ وزیر اعظم محمد علی بوگرا کے پاس جو بھی فائلیں آتیں، ان کا معائنہ عالیہ بیگم وزیر اعظم کے کمرے میں گھنٹوں بیٹھ کر کرتیں۔ عالیہ بیگم کی اس محنت کا پھل ان کو اس صورت میں ملا کہ وہ بوگرا سے شادی کے بعد پاکستان کی خاتونِ اول بن گئیں۔

وزیر اعظم ہاؤس کے چپراسی مجید کے مطابق بوگرا صاحب کی پہلی بیگم حمیدہ اکثر اس کو اپنے پاس بٹھا لیتیں اور باتیں کرتی رہتیں۔ وہ اکثر کہا کرتیں کہ ہم نے تو اس کو (یعنی دوسری بیگم کو) نوکر رکھا تھا، آج اس نے ہمارے ساتھ کیا کیا!

عالیہ بیگم اور بوگرا صاحب کے اس اقدام کو مقتدر حلقوں کی خواتین کی جانب سے اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ خواتین کو خطرہ یہ تھا کہ بوگرا کی پیروی کرتے ہوئے اگر دوسرے مقتدر حضرات نے بھی ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کا عمل شروع کر دیا تو ان کا مستقبل کیا ہوگا؟ رفیعہ ذکریا اپنی کتاب The Upstairs Wife کے صفحہ 45 پر لکھتی ہیں:

> ان خواتین نے ایسی تمام سرکاری تقریبات کا بائیکاٹ شروع کر دیا جس میں خاتونِ اول مدعو ہوتیں۔ ان تقریبات میں غیر ملکی سفیروں کے اعزاز میں عشائیے، نیشنل یونیورسٹی کا افتتاح، پاکستان سیکریٹریٹ میں نئی شاخ کا آغاز اور ایسی تمام تقریبات میں نئی مسز بوگرا کی موجودگی کے معنی مقتدر خواتین اور ان کی بیٹیوں کی غیر حاضری ہوتی تھی۔ یہ خواتین اشرافیہ کی جانب سے منعقدہ تقریبات کی میزبان ہوتی تھیں، اور انھوں نے بالکل صحیح اندازہ لگایا تھا کہ ان کے سوا مرد کی حیثیت اس گاڑی کی طرح ہے جو تیل اور گریس کے بغیر چل رہی ہو۔ ان کی روایتی گفتگو اور لطیفوں کے دوران دبی دبی ہنسی سے اس بات کا اظہار ہوتا تھا کہ اگر وہ مسز بوگرا کے اس غلط قدم کو تسلیم کر لیں تو وہ ایک حد تک محدود نہیں رہے گا۔ ایک سے زیادہ شادیوں کے خلاف سوشل بائیکاٹ ان کا اس سلسلے میں پہلا قدم تھا۔

محمد علی بوگرا اور غلام محمد کے تعلقات میں کیا بگاڑ پیدا ہوا کہ بوگرا صاحب جو غلام محمد کی محبت میں ان کی گاڑی کے پائلٹ اور انجن ڈرائیور تک کا فریضہ فخریہ انجام دے چکے تھے، ان سے زبردستی استعفیٰ لیا گیا؟ مرحوم فوجی آمر، خود ساختہ (بقول شیخ عبدالمجید سندھی کے "بغیر کوئی جنگ لڑے") فیلڈ مارشل، اپنی کتاب جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی کے صفحہ 84 پر لکھتے ہیں:

محمد علی بوگرا نے غلام محمد کے منظور نظر کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ جب ان کے قدم ذرا جمے تو انھوں نے خود کو گورنر جنرل کے بندھنوں سے آزاد کرنا چاہا۔ اُدھر فضل الرحمان، ہاشم گزدر، اور عبدالستار پیرزادہ جیسے لوگ ان کے کان بھر رہے تھے کہ یاد رکھو، اگر تم نے احتیاط نہ کی تو تمھارا بھی وہی حشر ہوگا جو تمھارے پیشرو کا ہو چکا ہے۔ ان کے خیال میں اس کا بس ایک ہی علاج تھا، وہ یہ کہ انڈین انڈی پینڈنس ایکٹ 1947 میں ترمیم کر کے گورنر جنرل کے اختیارات محدود کر دیے جائیں۔

ایسا ہی ہوا۔ وزیر اعظم محمد علی بوگرا اور ان کے رفقائے کار نے ایک منصوبہ ترتیب دیا کہ اسمبلی کے اجلاس میں اس طرز کی قرارداد منظور کروائی جائے۔ اس حکمت عملی کے پیش نظر دستور ساز اسمبلی کے اجلاس سے قبل قرارداد تمام اراکینِ اسمبلی کی ڈیسکوں پر نیم شب کو رکھ دی گئیں۔ قرارداد کے مطابق انڈیا ایکٹ کی دفعات 9، 10، 10 الف، 10 ب اور 17 منسوخ کر دی گئیں۔ اس قرارداد کی منظوری میں تقریباً دس منٹ کا وقت لگا۔ (غالباً اسی روایت کی پیروی کرتے ہوئے پاکستان کی 67 سالہ تاریخ میں قرارداد اور قوانین اسمبلی میں اسی تیزی سے منظور کیے جاتے رہے ہیں۔)

یہ گورنر جنرل غلام محمد کے لیے محمد علی بوگرا اور ان کے ساتھیوں کی جانب سے ایک واضح اشارہ تھا کہ اب وہ اس قدر با اختیار نہیں رہے کہ اپنے آئینی اختیارات کی بنیاد پر کسی بھی حکومت کو ایک لمحے میں برطرف کر دیں۔ یہ قرارداد منظور ہونے کے بعد مطمئن اور خوش وزیر اعظم محمد علی بوگرا، ایوب خان، سر ظفر اللہ خان اور چودھری محمد علی کے ہمراہ، امریکا کے دورے پر روانہ ہو گئے۔ امریکا کے علاوہ انھیں کینیڈا کا بھی دورہ کرنا تھا۔ دورے کے دوران انھیں گورنر جنرل غلام محمد کا پیغام ملا کہ وہ فوراً وطن واپس لوٹ آئیں۔ اس پیغام نے محمد علی بوگرا کو پریشان کر دیا۔ ایوب خان اپنی کتاب کے صفحہ 8-86 پر لکھتے ہیں:

> لندن ایر پورٹ پر گورنر جنرل نے مجھے ٹیلیفون پر بلوایا۔ لیکن ان کی بات میری سمجھ میں مطلق نہیں آئی۔ میں نے ٹیلیفون اسکندر مرزا کو دے دیا۔ ہمیں بس اسی قدر معلوم ہو سکا کہ وہ مجھے فوراً پاکستان بلانا چاہتے ہیں۔ انھیں دوسروں سے غرض نہ تھی۔ وزیر اعظم کو اس بات سے بڑی تشویش تھی کہ واپسی پر ان کا حشر کیا ہوگا۔ میں نے بڑی مشکل سے انھیں سمجھا بجھا کر اپنے ساتھ وطن چلنے پر تیار کر لیا۔ راستے میں میں نے اسکندر مرزا اور چودھری محمد علی

سے کہا کہ کراچی پہنچتے ہی وزیر اعظم کو گورنر جنرل کے پاس لے جانا سخت خلاف مصلحت ہو گا۔ ایسا آمنا سامنا بدمزگی کا موجب ہو سکتا ہے۔ وزیر اعظم اپنے بنگلے پر جائیں اور ہمارے اشارے کے منتظر رہیں۔

محمد علی بوگرانے ظاہر میں تو بڑی جرأت کا اظہار کیا مگر میرا خیال ہے کہ وہ دل میں بڑے خائف تھے۔ انھوں نے لندن سے پیغام بھیجا تھا کہ کراچی پہنچنے پر ان کے لیے فوجی حفاظت کا انتظام کیا جائے۔ اسکندر مرزا، چودھری محمد علی اور میں، ہم تینوں تو گورنر جنرل کی کوٹھی پر پہنچے۔ وہ غصے سے آگ بگولہ ہو رہے تھے، اور گالیوں کی بوچھاڑ تھی کہ تھمنے کا نام نہ لیتی تھی۔ لیکن خوش قسمتی سے یہ گالیاں کسی کی سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ چودھری محمد علی نے جرأت کر کے کچھ کہا، اس کے جواب میں ان پر بوچھاڑ پڑی۔ اس کے بعد اسکندر مرزا کچھ بولے، ان پر بھی بوچھاڑ پڑی۔ ہم ان کی خدمت میں یہ گزارش کرنا چاہتے تھے کہ آپ محمد علی کو ایک موقع اور دیں۔ اس کے جواب میں غصے میں انھوں نے غرا کر کہا: "جاؤ، جاؤ، دور ہو جاؤ۔" ان کی زبان سے بار بار "نہیں، نہیں" کے الفاظ نکلتے۔ وہ بس ہم کو بھگا دینا چاہتے تھے۔

ہم ایک کے پیچھے ایک ان کی خوابگاہ سے نکلے۔ آگے آگے اسکندر مرزا، ان کے پیچھے محمد علی اور سب سے پیچھے میں۔ میں کمرے سے قدم باہر رکھنے ہی کو تھا کہ ان کی نرس نے، جو کہ ان کی خدمت پر مامور تھی، میرا کوٹ پکڑ کر کھینچا، میں پلٹا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ میں ایک بالکل مختلف آدمی سے دوچار ہوں۔ یہی ہمارے بوڑھے اور بیمار گورنر جنرل جو تھوڑی دیر پہلے غصے سے دیوانے ہو رہے تھے، اب ان کا چہرہ مسرت سے کھل اُٹھا تھا اور وہ قہقہے لگا رہے تھے۔ میں نے دل میں کہا: "آپ بھی بڑے حضرت ہیں۔" انھوں نے ایک خاص مسرت کی چمک آنکھوں میں لیے مجھے اشارہ کیا، "مسہری پر بیٹھ جاؤ۔"

اس کے بعد انھوں نے تکیے کے نیچے سے دو دستاویزیں نکالیں۔ ان میں سے ایک پر کچھ اس قسم کی عبارت تھی کہ "میں غلام محمد فلاں فلاں وجوہ کی بنا پر فلاں فلاں اختیارات جنرل ایوب خان کو سونپتا ہوں اور انھیں حکم دیتا ہوں کہ وہ تین مہینے کے اندر اندر آئین تیار

کریں۔" میں نے اس کاغذ پر نظر ڈالی اور دل میں کہا: "خدا آپ کو سمجھے۔ پچھلے 8 برس تو آپ کو ہوش نہ آیا اور اب چاہتے ہیں کہ میں تین مہینے میں دستور بنا کے پیش کر دوں۔"

دوسری دستاویز اس مضمون کی تھی کہ میں نے اس پیشکش کو قبول کر لیا ہے۔ لمحہ بھر کے لیے میں ان تاریخی دستاویزوں کو اپنے ہاتھ میں تھامے رہا۔ جیسے ہی میں نے ان کاغذوں پر نظر ڈالی، میرا تن بدن پکار اٹھا کہ: "نہیں، ہرگز نہیں۔" میں نے ان سے کہا، "آپ جلد بازی سے کام لے رہے ہیں۔ اس سے ملک کو سخت نقصان پہنچے گا۔ میں فوج کی تعمیر میں مصروف ہوں۔"

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ایوب خان نے اپنی کتاب میں جا بجا اور برملا طور پر اس بات کا اظہار کیا ہے کہ انھیں گورنر جنرل کی بات سمجھ نہیں آتی تھی، لیکن جو باتیں ان کے مقصد کی ہوتی تھیں وہ بڑی آسانی سے سمجھ جاتے تھے۔ محمد علی بوگرا کی انھوں نے گورنر جنرل سے ملاقات بھی کروائی، لیکن اس ملاقات کے دوران کیا ہوا، اس حوالے سے ان کا قلم خاموش ہے۔ ظاہر ہے، خاموش رہنا بھی چاہیے، کیونکہ یہ ایسی تلخ حقیقت ہے جو ان کے بیان سے باہر ہے۔

پیر محمد علی راشدی کے کالموں پر مشتمل کتاب رودادِ چمن کے صفحہ 127 پر یہ واقعہ مرحلہ وار بیان کیا گیا ہے:

(الف) 1954 میں جب غلام محمد مرحوم اور بوگرا مرحوم کے مابین جھگڑا ہوا تھا اور بوگرا مرحوم امریکا کے دورے پر نکل گئے تھے تو غلام محمد نے ایوب خان کو امریکا تک اس کے پیچھے لگایا ہوا تھا۔

(ب) بوگرا مرحوم کے امریکا سے واپسی والے سفر میں ایوب خان اس کے ساتھ چپکے رہے اور کراچی اترتے ہی ان کو ایرپورٹ سے سیدھا غلام محمد کے پاس لے گئے۔

(ج) جس وقت غلام محمد مرحوم پستول دکھا کر بوگرا سے آئین ساز اسمبلی تڑوا رہے تھے تو اس وقت بھی (چودھری محمد علی کے علاوہ) ایوب خان اس "محفل" میں موجود رہے۔

(د) غلام محمد نے آئین ساز اسمبلی کو تڑوانے کے ساتھ بوگرا مرحوم سے مرکزی کابینہ میں ایوب خان کو وزیرِ دفاع بنوایا۔ (ساتھ ہی انھوں نے فوج کی کمانڈر ان چیفی بھی نہیں

چھوڑ ی)۔

پاکستان کی سیاسی تاریخ کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو ایک بات بالکل واضح نظر آتی ہے کہ اکثر جمہوری حکمران آمروں یا بیوروکریسی کی حمایت سے حکومت میں آئے، مگر اقتدار میں آنے کے بعد جلد ہی انھیں اس بات کا اندازہ ہو جاتا کہ وہ آمروں کی من مانیاں پوری نہیں کر سکتے۔ اس بنا پر جب وہ آمروں کی ہدایات کو نظر انداز کرتے تو فوراً ہی انھیں بدعنوان، موقع پرست اور ملک دشمن قرار دے دیا جاتا، اور ان کا سیاسی دوران کی معزولی یا برطرفی پر ختم ہوتا۔ محمد علی بوگرا کے ساتھ بھی شاید یہی ہوا اور ملک غلام محمد کے اختیارات محدود کرنے کی کوشش میں وہ اپنے اختیارات سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔

جوگندر ناتھ منڈل: اچھوت اچھوت ہی رہا

جوگندر ناتھ منڈل ایک ایسی شخصیت تھے جن کا انتخاب جناح صاحب نے تقسیم ہند سے قبل بھی مشترکہ انڈیا میں بحیثیت وزیر مسلم لیگ کی جانب سے کیا تھا اور وہ مشترکہ ہندوستان کے صوبے بنگال میں وزیر قانون تھے۔ تقسیم کے بعد 10 اگست کو جب جناح صاحب نے پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے حلف اٹھایا تو آئین ساز اسمبلی کے اس اجلاس کی صدارت کا اعزاز بھی جوگندر ناتھ منڈل کے حصے میں آیا۔

جوگندر ناتھ کا تعلق ہندو مذہب کے اس طبقے سے تھا جسے اچھوت سمجھا جاتا تھا۔ ڈاکٹر مبارک علی کے مطابق تقسیم ہند کے بعد انھوں نے اپنے لیے لفظ ''دلت'' کا انتخاب کیا۔ گاندھی جی نے اچھوتوں کو ''ہریجن'' کا لقب دیا تھا لیکن وہ اس نام کو قبول کرنے کے لیے قطعاً تیار نہیں تھے۔ مشترکہ ہندوستان کے معروف اچھوت رہنما ڈاکٹر امبیڈکر کا خیال تھا کہ گاندھی جی ہریجن کا لقب دے کر یہ کوشش کر رہے ہیں کہ اچھوتوں کو ہندو مذہب میں شامل رکھا جائے۔ وہ سمجھتے تھے کہ گاندھی جی اچھوتوں سے دھوکا کر رہے ہیں۔ اسی وجہ سے انھوں نے اپنے 3000 ساتھیوں سمیت بدھ مذہب اختیار کیا۔

تقسیم سے قبل مشترکہ ہندوستان اور اس کے بعد انڈیا پاکستان میں بسنے والے دلتوں کی معاشی اور سماجی صورت حال میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی لیکن ایک طویل عرصے بعد انھیں اپنے حقوق کا ادراک بھی ہوا ہے اور وہ اسے منوانے کے لیے جدوجہد بھی کر رہے ہیں۔ بہر حال، ہم بات کر رہے تھے جناب منڈل کی جو پاکستان کے پہلے وزیر قانون بنے۔

10 اگست 1947 کو جب جناح صاحب نے گورنر جنرل کا حلف اٹھانا تھا تو ان کی خواہش تھی کہ اس اجلاس کی صدارت ایک اچھوت اقلیتی رکن اسمبلی جوگندر ناتھ منڈل کریں۔ ان کے اس فیصلے سے اس بات کا اظہار ہوتا تھا کہ جناح صاحب نئی مملکت میں اقلیتوں کو کتنی اہمیت دیتے ہیں۔ لیاقت علی خاں نے اجلاس کی صدارت کے لیے جوگندر ناتھ کا نام تجویز کیا، جبکہ اس کی تائید خواجہ ناظم الدین نے کی۔ جوگندر ناتھ نے بحیثیت صدر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اس امید کا اظہار کیا کہ جناح صاحب کی

قیادت میں ملک مزید ترقی کرے گا۔ احمد سلیم اپنی کتاب پاکستان اور اقلیتیں کے صفحہ 104 پر اس حوالے سے لکھتے ہیں:

اقلیتی فرقے کے ارکان میں سے صدر کا انتخاب نئی مملکت کی روشن خیالی کا غماز اور ایک اچھا شگون ہے۔ پاکستان کا وجود بجائے خود برصغیر کی ایک اقلیت کے پیہم اصرار اور مساعی کی بدولت عمل میں آیا۔ میں یہ نکتہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ نہ صرف پاکستان اور ہندوستان بلکہ تمام دنیا کے باشندوں کی نظریں پاکستان کی مجلس دستور ساز پر لگی ہوئی ہیں۔ مسلمان اپنے لیے الگ مملکت کے طالب تھے۔ اب دنیا یہ دیکھنا چاہتی ہے کہ مسلمان اقلیتی فرقے کے ساتھ دریا دلی کے ساتھ پیش آتے ہیں کہ نہیں۔ مسلم لیگ کے لیڈروں اور خاص طور پر قائداعظم نے اقلیتوں کو یقین دلایا کہ پاکستان کی اقلیتوں کے ساتھ نہ صرف انصاف اور رواداری بلکہ فراخ دلانہ سلوک روا رکھا جائے گا۔ اقلیتوں کا بھی فرض ہے کہ وہ مملکت کے وفادار رہیں اور ذمہ داری کے ساتھ کام کریں۔

1946 میں ہندوستان میں برطانوی راج کے دوران مقامی نمائندوں پر مشتمل جو عبوری کابینہ مقرر کی گئی تھی، اس کے لیے مسلم لیگ کی جانب سے جوگندر ناتھ منڈل کو نامزد کیا گیا تھا۔ یہ ایک بہت بڑی بات تھی کہ ایک جماعت جو مسلمانوں کے حقوق کی بات کر رہی ہے، وہ کابینہ کے لیے ایک ہندو اچھوت کو اپنا وزیر نامزد کرے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ کانگریس کی جانب سے بھی وزارت کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد کو نامزد کیا گیا تھا۔ زاہد چودھری اپنی کتاب پاکستان کی سیاسی تاریخ (جلد 2) کے صفحہ 47 پر لکھتے ہیں:

لیگ (مسلم لیگ) کی طرف سے اچھوت کو شامل کرنے پر کانگریسی رہنماؤں کا جو ردعمل تھا سو تھا، لندن میں لیبر حکومت کو اس بات کی تشویش لاحق ہوگئی کہ کہیں کانگریس ناراض نہ ہو جائے اور حکومت سے دستبردار نہ ہو جائے۔ چنانچہ 14 اکتوبر کو لارڈ پیتھک لارنس نے (گورنر جنرل) لارڈ ویول کو لکھا: ”ہمیں اس صورت حال کا سامنا ہو سکتا ہے کہ کانگریس عبوری حکومت میں شامل رہنے سے اس بنا پر انکار کر دے کہ اچھوت کو مسلم لیگ کا نمائندہ تصور نہیں کیا جا سکتا۔“ اور جب 15 اکتوبر کو ویول نے لیگ کے پانچ نام شاہ برطانیہ کی

منظوری حاصل کرنے کے لیے لندن روانہ کیے تو اسی روز پیتھک لارنس نے جواب میں لکھا: ''مجھے افسوس ہے کہ میں واقعی یہ سمجھتا ہوں کہ شاہی منظوری حاصل کرنا اس وقت تک ممکن نہ ہوگا جب تک آپ یہ نام نہرو پر ظاہر نہ کر دیں۔ کانگریس کو اچھوت کی شمولیت پر سخت اعتراض ہو سکتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہ حکومت سے دستبردار بھی ہو سکتی ہے۔ اس مرحلے پر شاہِ برطانیہ کو ملوث کرنا مناسب نہ ہوگا۔''

مارچ 1949 میں جوگندر ناتھ منڈل نے قراردادِ مقاصد کی حمایت کی۔ (یہ وہی قراردادِ مقاصد ہے جو آج تک پاکستان کی سیاست کا موضوع ہے۔ ترقی پسندوں کا خیال یہ ہے کہ اس قرارداد کے ذریعے جناح صاحب کے ''سیکولر پاکستان'' کو ایک مذہبی ریاست کا درجہ دے دیا گیا)۔ اچھوتوں کے لیے جداگانہ انتخابات کے حق کو منوا کر انھوں نے ہندو اقلیت کے اثر کو کم کرنے کی کوشش میں بھی حکومت کا ساتھ دیا۔ اپنی ان وزارتی خدمات کے صلے میں وہ 1950 میں اپنے وزارتی عہدے سے فارغ کر دیے گئے، جس کا انھیں بے حد رنج ہوا۔ رنج ہونا بھی چاہیے تھا۔ سندھی میں ایک مثل مشہور ہے ''جنھ لائے مواسیں، سے کاندھے نہ تھیا'' (جن کے لیے مرے تھے، انھوں نے کاندھا تک نہ دیا)۔

قیامِ پاکستان کے بعد نوکر شاہی کی گرفت جس طرح اقتدار کے ایوانوں میں زور پکڑتی جا رہی تھی، اس کو مزید مضبوط کرنے کے لیے ہندوؤں کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنا ضروری تھا۔ تاثر یہ دیا جاتا تھا کہ یہ اکثریتی مسلمانوں کی خواہش ہے کہ غیر مسلموں کے کردار کو محدود کیا جائے کیونکہ ان کی نئی مملکت سے وفاداری مشکوک ہے۔ یہ مفاد پرست نوکر شاہی کی جانب سے غیر مسلموں اور خصوصاً ہندوؤں کے لیے ایک واضح اشارہ تھا کہ حکومتِ وقت کی حمایت اور تائید سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اور ان کے لیے پاکستان میں اب کوئی گنجائش نہیں ہے۔

کتنے معصوم تھے جوگندر ناتھ منڈل۔ انھیں اس بات کا اندازہ ہی نہیں تھا کہ کچھ عرصے بعد انھیں پاکستان چھوڑنا پڑے گا۔ دستور ساز اسمبلی کے اجلاس میں جب جناح صاحب کو قائداعظم کا لقب دینے کی قرارداد پیش کی گئی، تو تقریباً تمام ہی اقلیتی ارکان نے اس کی مخالفت کی لیکن جوگندر ناتھ منڈل نے اس کی حمایت کی۔ اور جب جناح کا انتقال ہوا تو انھوں نے ان خیالات کا اظہار کیا: ''تقدیر کے ظالم ہاتھوں نے قائداعظم کو اس وقت ہم سے چھین لیا جب ان کی اشد ضرورت تھی۔''

جناح صاحب کے انتقال کے کچھ عرصے بعد ہی جوگندر ناتھ منڈل پاکستان سے دوبارہ انڈیا منتقل ہو گئے۔ اس کی کیا وجوہات تھیں؟ اس حوالے سے احمد سلیم اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

> پاکستان کے پہلے وزیر قانون اور اچھوت رہنما جوگندر ناتھ منڈل نے قدم قدم پر حکومت پاکستان کی تائید وحمایت کی تھی۔ انھیں کچلے ہوئے عوام کا ہیرو ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ 1940 سے جب وہ کلکتہ کارپوریشن میں منتخب ہوئے، وہ مسلم عوام کا ساتھ دے رہے تھے۔ انھوں نے اے کے فضل الحق وزارت اور خواجہ ناظم الدین وزارت (45-1943) کے ساتھ تعاون کیا اور (47-1946) میں مسلم لیگ کے اس وقت کام آئے جب قائداعظم کو متحدہ ہندوستان کی عبوری وزارت کے لیے اپنے پانچ وزیروں کے نام درکار تھے۔
>
> قائداعظم منڈل کو مسلم لیگ کی جانب سے وزیر نامزد کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے قائداعظم کی یہ پیشکش قبول کر کے قائد کی اس حکمتِ عملی کو کامیاب بنایا کہ اگر کانگریس ابوالکلام کو ایک مسلمان وزیر کے طور پر نامزد کر سکتی ہے تو مسلم لیگ بھی ایک اچھوت کو اپنا وزیر مقرر کر سکتی ہے۔ پھر 3 جون 1947 کا اعلان ہوا تو ضلع سلہٹ کے باشندوں کو یہ طے کرنا تھا کہ آیا ان کا ضلع آسام میں شامل رہے گا یا پاکستان کا جزو بنے گا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ووٹوں کی تعداد میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا، اور اچھوت اقوام کے کافی ووٹ تھے جو استصواب کے نتائج پر اثر انداز ہو سکتے تھے۔ قائداعظم کی ہدایت پر مسٹر منڈل استصواب کے سلسلے میں سلہٹ پہنچے اور فیصلہ پاکستان کے حق میں کروا کر لوٹے۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، تقسیم ہند کے بعد پاکستان کی سیاست میں بیوروکریسی کا عمل دخل بہت زیادہ تھا۔ وہ بلا لحاظ مذہب وملت کسی بھی ایسے شخص کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھی جس کے سامنے اسے جوابدہ ہونا پڑے، اس لیے انھوں نے ایسے تمام افراد کے پَر مختلف حیلوں بہانوں سے کترنا شروع کیے۔ جوگندر ناتھ منڈل بھی اس کا شکار ہوئے۔ غالباً وہ پاکستان کی پہلی کابینہ کے واحد وزیر تھے جنھیں ایک بیوروکریٹ نے اس حد تک مجبور کیا کہ وہ نہ صرف وزارت چھوڑنے پر تیار ہوئے، بلکہ ملک ہی چھوڑ گئے۔ اس حوالے سے پیر علی محمد راشدی اپنی کتاب رودادِ چمن میں لکھتے ہیں کہ:

چودھری محمد علی مرحوم و مغفور اپنی زندگی کا بیشتر حصہ انگریز کی ملازمت میں بسر کرنے کے بعد اب دہلی سے پاکستان تشریف لے آئے تھے اور آتے ہی بحیثیت سیکرٹری جنرل مرکز پاکستان میں نوکر شاہی کے معمار اور امام مانے جانے لگے۔ ابھی وہ کابینہ میں محض سیکرٹری تھے (ہنوز وہ سیکرٹری خزانہ، وزیرِ خزانہ، نہ وزیر اعظم بنے تھے، ان کی ترقی درجات کا اہتمام بعد میں ہوتا رہا)۔ ان پر (بقول خود) یکا یک یہ انکشاف ہوا کہ منڈل کی ملک سے وفاداری مشکوک ہے، جس کے معنی یہ ہوتے تھے کہ چودھری صاحب مرحوم مردم شناسی اور وفاداری پرکھنے کے معاملے میں قائد سے بھی زیادہ تیز نظر رکھتے تھے۔

چنانچہ انھوں نے وزیر منڈل سے کابینہ کے اہم کاغذات چھپانے کی کوشش شروع کر دی۔ یہ بات منڈل سے برداشت نہ ہو سکی۔ وہ خوددار اور انا پرست ہندو سیاستدان تھا۔ تحریک آزادی کے دوران بڑی قربانیاں دے کر اور شدید مشقتیں برداشت کر کے خصوصاً آڑے وقت میں اپنی قوم کے خلاف ہمارے قائد کا ساتھ دے کر وزارت کے اس منصب تک پہنچا تھا، اب وہ کیونکر یہ توہین برداشت کر سکتا تھا کہ کابینہ کا اپنا ملازم اس کے سیاسی کیرکٹر اور وفاداریوں کے بارے میں جج بن کر بیٹھے؟ وہ فوراً وزارت چھوڑ چھاڑ کر واپس کلکتہ چلا گیا اور بقیہ عمر وہاں ہندوؤں کے طعنے برداشت کرتا رہا۔

جوگندر ناتھ منڈل کی قربانیاں، مسلمانوں سے محبت، مسلم لیگ سے وفاداری سب اپنی جگہ، لیکن اس عظیم شخص کے ساتھ ایک بیوروکریٹ نے جو کچھ کیا، وہ اب غالباً تاریخ کا حصہ بن گیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں اب بھی پاکستان میں بے شمار جوگندر موجود ہیں جو اس وطن سے اپنی دوستی کا ثبوت دیتے دیتے تھک گئے ہیں لیکن کوئی بھی اسے ماننے کے لیے تیار نہیں۔ کیا اچھوتوں کو ماننے کے لیے اور اقلیتوں کی قربانیوں کا اعتراف کرنے کے لیے پاکستان میں ایک اور جناح کی ضرورت ہے؟

انتقامی سیاست کے شکار حسین شہید سہروردی

10 ڈاؤننگ اسٹریٹ اور 10 وکٹوریہ روڈ، یہ پتے ہیں دو گھروں کے جن میں سے ایک میں اب بھی وزیراعظم رہتا ہے جبکہ دوسرے کا درجہ اب ایک ریاستی مہمان خانے (اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس) کا ہے۔ 10 وکٹوریہ روڈ (حالیہ عبداللہ ہارون روڈ) کراچی میں ہے جو تقسیم ہند کے بعد وزرائے اعظم کی سرکاری رہائش گاہ تھی۔ ان دونوں رہائش گاہوں میں 10 کا حرف مشترکہ ہے۔ یہ حسنِ اتفاق ہے یا کچھ اور، اس پر تحقیق ہو سکتی ہے۔ لیکن فی الحال ہمارا موضوع 10 وکٹوریہ روڈ ہے جہاں پاکستان کے وزرائے اعظم نے اپنے دورِ اقتدار کے شب و روز گزارے۔ ہم نے اپنے اس بلاگ کا آغاز 10 وکٹوریہ روڈ میں رہائش پذیر حسین شہید سہروردی سے کیا ہے۔ دیگر وزرائے اعظم کا ذکر بعد میں کریں گے۔

حسین شہید سہروردی ایک مختصر عرصے تک پاکستان کے وزیراعظم رہے۔ گو کہ اُس وقت کے صدر پاکستان میجر جنرل اسکندر مرزا ان کے سخت خلاف تھے لیکن چونکہ سیاست میں کوئی بات حتمی نہیں ہوتی، اس لیے صدر کو یہ کڑوی گولی نگلنی پڑی۔ بیگم شائستہ سہروردی اکرام اللہ اپنے بھائی حسین شہید سہروردی کی سوانح عمری میں رقمطراز ہیں کہ چودھری محمد علی کی وزارت کے خاتمے کے بعد صدر کو مجبور کیا گیا کہ وہ شہید کو وزیراعظم کی حیثیت سے قبول کریں، گو کہ اس سے قبل صدر اس بات کا اظہار کر چکے تھے کہ ایسا صرف ان کی لاش پر ہی ممکن ہے۔ لیکن حالات نے انھیں اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور کیا۔ شائستہ سہروردی اکرام اللہ نے اپنی کتاب میں ایسے بے شمار انکشافات کیے ہیں جو سہروردی صاحب کی ذاتی اور سیاسی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں، جن سے تقسیم ہند اور پاکستان کے سیاسی میدان میں اکھاڑ پچھاڑ اور انتقامی کارروائیوں سے آگہی ہوتی ہے۔

بیگم شائستہ کی بات یقیناً درست ہوگی لیکن وزیراعظم بننے کے بعد سہروردی اور اسکندر مرزا کے تعلقات کتنے خوشگوار ہو گئے تھے، اس کا اندازہ نعیم احمد خان، محمد ادریس، اور عبدالستار کی یادداشتوں پر مرتب کتاب پاکستان کے پہلے سات وزرائے اعظم کے صفحہ 4-83 پر درج اس متن سے ہوتا ہے:

سہروردی صاحب کھلانے پلانے کے بہت شوقین تھے۔ ان کے دور میں وزیراعظم ہاؤس میں بہت زیادہ دعوتیں ہوتی تھیں۔ ان دعوتوں میں اکثر ڈیڑھ سو، دو سو کے قریب لوگ شامل ہوتے تھے۔ ان پارٹیوں میں شراب بے دریغ استعمال کی جاتی تھی، لیکن سہروردی صاحب جب تک وزیراعظم کی حیثیت سے وزیراعظم ہاؤس میں رہے، انھوں نے شراب نہیں پی۔ سنا تھا کہ وہ بہت شراب پیتے تھے، لیکن کسی بیماری کی وجہ سے ڈاکٹروں کے مشورے پر شراب پینا بند کر دی تھی۔ سہروردی صاحب اکثر بیگم اسکندر مرزا کے ساتھ ڈانس کرتے تھے۔

یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ اتنے اچھے اور دوستانہ تعلقات ہونے کے باوجود اسکندر مرزا نے سہروردی صاحب کو استعفیٰ دینے پر کیوں مجبور کیا۔ ان کے دوستانہ تعلقات کی وسعت کے بارے میں کتاب کے مرتبین وزیراعظم ہاؤس کے چپڑاسی مجید کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں کہ ایک رات تو یہ رنگ جما کہ ناچتے ناچتے رات کے دو بج گئے، اور شراب کے دور پر دور چلتے رہے۔ بالآخر اسکندر مرزا اپنی گاڑی میں بیٹھ کر گورنر جنرل ہاؤس چلے گئے، اور دوسرے مہمان بھی چلے گئے۔

سہروردی صاحب اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔ جب مجید چپڑاسی نے ہال سے متصل کمرے کا پردہ اٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا، ایک عورت صوفے پر بے ہوش پڑی ہے۔ مجید چپڑاسی آگے گیا تو پہچان گیا کہ یہ اسکندر مرزا کی بیگم ہیں۔ اس نے سہروردی صاحب کو جا کر اطلاع دی کہ حضور، بیگم اسکندر مرزا تو یہیں رہ گئی ہیں۔ سہروردی صاحب آئے، اور کسی طرح بیگم اسکندر مرزا کو خود تھام کر گاڑی تک لے آئے، اور پھر خود ہی گاڑی چلا کر بیگم اسکندر مرزا کو گورنر جنرل ہاؤس چھوڑ آئے۔

حسین سہروردی ایک بڑے زیرک سیاستدان تھے۔ جناح صاحب خود چاہتے تھے کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہوں اور مشترکہ ہندوستان کے صوبے بنگال میں مسلم لیگ کی قیادت سنبھالیں۔ وہ جناح صاحب کی توقعات پر پورا اترے۔ سیاسی میدان میں مصروفیات کے ساتھ وہ ایک خوش مزاج اور بذلہ سنج انسان بھی تھے۔ مشترکہ ہندوستان اور بعد ازاں پاکستان کے معروف فلمی ستارے کمال نے اپنی سوانح عمری داستانِ کمال میں لکھا ہے:

کراچی میں پہلے اور شاید آخری صدارتی ایوارڈ کا اعلان ہوا۔ کراچی اسٹیشن پر بھی ہمارا

زبردست استقبال ہوا۔ ہم سب لوگ میٹروپول ہوٹل میں ٹھہرائے گئے۔ اگلے روز سب کو ایوانِ صدر میں بلایا گیا۔ اس وقت کے وزیراعظم سہروردی مرحوم نے فلم والوں سے بہت اچھی طرح ملاقات کی۔ انھیں فوٹوگرافی کا بہت شوق تھا۔ انھوں نے خود اپنے کیمرے سے فلم اسٹارز کی تصویریں بنائیں۔

حسین شہید سہروردی ایک انتہائی قابل وکیل تھے۔ مقدمات کے دوران وہ صرف دلائل سے ہی کام نہیں لیتے تھے، بلکہ اشعار سے بھی کام لیتے تھے۔ ایسا ایک واقعہ اس وقت پیش آیا جب ان کے خلاف ایبڈو کے تحت قائم کیے جانے والے ایک مقدمے میں وہ اپنی پیروی خود کر رہے تھے۔ شائستہ سہروردی اپنی کتاب میں لکھتی ہیں:

عدالتوں میں ان کی کارکردگی مثالی ہوتی تھی۔ جن مقدمات کی سماعت میں وہ پیش ہوتے تھے، لوگ عموماً ان کے دلائل سننے کے لیے عدالت آتے تھے۔ ایسا ہی ایک واقعہ اس وقت پیش آیا جب وہ اپنے خلاف ایبڈو کے تحت مقدمے کی پیروی کر رہے تھے۔ وکیل استغاثہ چودھری نذیر احمد وقت بے وقت اور بلاوجہ انھیں پریشان کر رہے تھے۔ سہروردی ان کی ان حرکتوں کو نظرانداز کر رہے تھے۔ ایک موقعے پر اچانک انھوں نے کہا:

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تُو کیا ہے
تمھی کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

سہروردی صاحب ایک ماہر قانون دان تھے۔ سیاست ان کا پیشہ نہ تھا۔ روزگار کے لیے وکالت کرتے تھے۔ لیکن پاکستان کی انتقامی سیاست نے ہر دور میں ایک نئی تاریخ رقم کی ہے۔ عموماً سب سے پہلے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ معتوب فرد کے اثاثوں کو نشانہ بنایا جائے اور اسے اس حد تک مجبور کیا جائے کہ اس کی روزی روٹی کا حصول اس کے لیے مسئلہ بن جائے۔ سہروردی صاحب کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ بیگم شائستہ سہروردی کی سوانح عمری کے صفحہ 74 پر لکھتی ہیں:

انھوں نے اپنی وکالت دوبارہ سے شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ حکومت نے انھیں روکنے کے لیے اپنی سازشوں میں اضافہ کر دیا۔ کراچی اور لاہور کی عدالتوں کو یہ ہدایات جاری کی گئیں کہ وہ وکیل کی حیثیت سے انھیں رجسٹر نہ کریں۔ یہ منٹگمری [ایک چھوٹا سا شہر جسے اب

ساہیوال کے نام سے جانا جاتا ہے] کی ایک عدالت تھی جس نے حسین شہید سہروردی کو وکیل کی حیثیت سے قبول کیا۔

سہروردی صاحب سے زبردستی استعفیٰ لینے کے بعد سرکاری افسران میں ایک ایسا طبقہ بھی تھا جو اس عمل کے خلاف تھا، اور ان کی ہمدردیاں مکمل طور پر حسین شہید کے ساتھ تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ کسی طور یہ معاملہ عوامی عدالت تک پہنچایا جائے۔ حالانکہ بیوروکریسی میں آج بھی ایسے لوگ ہیں جو کسی نہ کسی حکومت کے وفادار ہوتے ہیں، لیکن حکمرانوں پر براوقت آتے ہی وعدہ معاف گواہ بن جاتے ہیں یا سیاسی وفاداریاں تبدیل کر لیتے ہیں۔ معروف سیاستدان اور کاروباری شخصیت بیگم سلمیٰ احمد اپنی خودنوشت سوانح عمری میں اس حوالے سے لکھتی ہیں:

> آفتاب احمد خاں (ماموں صاحب) حسین شہید سہروردی کے پرنسپل سیکرٹری تھے۔ جب ایوب خان نے عنانِ اقتدار سنبھالنے کے بعد مارشل لا نافذ کیا تو سول سروس کے ایک گروہ نے ایک دوسرے سے رابطے استوار کیے اور طے کیا کہ مارشل لا کے نفاذ کے خلاف عوامی رائے بنائی جائے۔ انھوں نے اس حوالے سے پوسٹرز بھی چھپوائے جو پورے کراچی میں لگائے جانے تھے۔ لیکن اس سے قبل کہ وہ یہ عمل انجام دیتے، راز فاش ہو گیا۔ پوسٹرز قبضے میں لے لیے گئے۔ منصوبہ سازوں کو گرفتار کیا گیا۔ ان میں نمایاں انکل آفتاب تھے۔ ان کی جیل سے رہائی کے لیے بارہا کوششیں کی گئیں۔

حسین شہید سہروردی پر ان کے مخالفین کا سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ انھوں نے بنگال میں فسادات کے دوران گاندھی جی سے ہاتھ ملایا اور کلکتہ میں گاندھی جی کے ساتھ رہائش اختیار کی، جبکہ گاندھی جی چاہتے تھے کہ وہ مشترکہ بنگال کے شورش زدہ علاقے نواکھلی کا دورہ کریں جہاں اس وقت کے بدترین ہندو مسلم فسادات ہوئے تھے۔ سہروردی کا خیال تھا کہ گاندھی جی کا نواکھلی کا دورہ ان فسادات کو مزید بڑھاوا دے گا، اور اگر وہ اس کے بجائے کلکتہ میں رہیں اور فسادات ختم کرنے کی کوشش کریں تو یہ زیادہ بہتر ہو گا۔ سہروردی نے جب اپنا یہ منصوبہ گاندھی جی کو پیش کیا تو گاندھی جی کا موقف تھا کہ وہ اس شرط پر کلکتہ ٹھہر سکتے ہیں کہ سہروردی بھی ان کے ساتھ وہاں رہیں۔ سہروردی نے اس سے اتفاق کیا اور پھر آہستہ آہستہ ان دونوں رہنماؤں کی کوششوں سے ہندو مسلم فسادات ختم ہو گئے۔

بیگم شائستہ لکھتی ہیں کہ جب انھوں نے حسین شہید سہروردی سے سوال کیا کہ یہ تجربہ کیسا رہا؟ تو ان کا جواب تھا: ''یہ سب ٹھیک تھا لیکن کھانا بہت بدذائقہ تھا۔ لیکن اس دورانیے نے خطرات کو کم کیا۔ آہستہ آہستہ ماحول تبدیل ہوتا گیا اور یہ معجزہ ایک مختصر عرصے میں برپا ہو گیا۔ کلکتہ کے مسلمان اور ہندو، گو کہ مختصر عرصے کے لیے، یکجا ہو گئے اور 15 اگست کو آزادی کا سورج ایک پُرامن ماحول میں طلوع ہوا۔''

حسین شہید سہروردی کی پاکستان میں آئین ساز اسمبلی کی نشست اس بنیاد پر خالی کر دی گئی کہ جو شخص تقسیمِ ہند کے بعد چھ ماہ کے اندر اندر پاکستان کے کسی علاقے میں رہائش اختیار نہیں کر پاتا وہ اپنی نشست پر برقرار نہیں رہ سکتا۔ اس قرارداد کے تحت شہید سہروردی نے کوشش کی کہ مشرقی پاکستان میں انھیں کوئی رہائش گاہ مل جائے۔ شائستہ اکرام اللہ کے مطابق وہ جون 1948 میں ڈھاکہ گئے لیکن ان کی آمد کے 24 گھنٹوں کے بعد انھیں ڈھاکہ بدری کا نوٹس دیا گیا۔ یہ نوٹس آئی جی ذاکر حسین کی ہدایات پر سٹی مجسٹریٹ نے ان سے وصول کروایا۔ یہ نہ صرف ڈھاکہ بدر کیے جانے کا نوٹس تھا بلکہ اس میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ آئندہ چھ ماہ کے لیے مشرقی پاکستان داخل نہیں ہو سکتے۔

پیر علی محمد راشدی اپنی کتاب رودادِ چمن کے صفحہ 51 پر اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> شہید سہروردی مرحوم وہ شخص تھا جو بضد مشرقی پاکستان کو بنگال میں شامل کروانے کے لیے لڑ جھگڑ کر، لیجسلیٹرز کونشن سے قرارداد منظور کروا کر مشرقی پاکستان کو بنگال میں لے آیا۔ بحیثیت وزیرِ اعلیٰ متحدہ بنگال اس نے فرقہ وارانہ فسادات کے دوران مسلمانوں کی اتنی خدمت اور حمایت کی تھی کہ وہاں کے ہندو آخر تک یہ زخم فراموش نہیں کر سکے۔ نہ صرف یہ، بلکہ پاکستان تحریک کے زمانے میں وہ سارا عرصہ مسلم لیگ بنگال کا جنرل سیکرٹری اور مسلم لیگ پارٹی کا روحِ رواں رہا۔

اس شخص کا کیا حال بنا؟ پہلے ''غدارِ پاکستان'' کے خطاب سے نوازا گیا، مسلم لیگ سے نکالا گیا، اور ایسا ماحول پیدا کیا گیا کہ وہ پاکستان میں داخل ہونے ہی نہ پائے۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ یہاں کی نوکر شاہی کے نامزد گورنر جنرل مرحوم غلام محمد کو اپنے جوڑ توڑ کو مقبولِ عام بنانے کے لیے اسی سہروردی کے تعاون کی شدید ضرورت محسوس ہوئی، چنانچہ

اس کو جنیوا سے بلا کر پاکستان کا وزیر قانون بنایا گیا، اور ایک اور چکر میں اس کو کچھ مہینوں کے لیے وزیر اعظم بھی بننے دیا گیا۔ آخر میں ایوب خان کا دور آیا اور اسی وزیر اعظم کو جیل میں ڈال دیا گیا اور "ایبڈو" کے تحت سیاست کے لیے نا اہل قرار دے دیا گیا۔

اس قدر بے آبروئی کے بعد وہ غریب جان چھڑا کر ملک سے ہی باہر نکل گیا اور وہیں جا کر مرنا بھی منظور کر لیا۔ (حال ہی میں ان کی بیٹی بیگم اختر سلیمان کا اخباری انٹرویو شائع ہوا ہے جس میں یہ راز کھولا گیا ہے کہ سہروردی مرحوم طبعی موت نہیں مرے تھے، مگر ان کو نوکر شاہی نے مروایا تھا)۔

حسین شہید سہروردی کا انتقال 5 دسمبر 1963 کو جلاوطنی کے دوران بیروت کے ایک ہوٹل میں پراسرار حالت میں ہوا۔ ان کی موت کے حوالے سے کئی افواہیں زیرِ گردش رہیں، جبکہ سرکاری موقف یہی رہا کہ دل کے دورے کے باعث ان کی جان گئی ہے۔ پاکستانی سیاست کے لاتعداد رازوں کی طرح ان کی موت کا عقدہ بھی اب صرف متنازع اور ایک راز ہے، جو ہمیشہ کے لیے دفن ہو چکا ہے۔

پاکستان کا پہلا جلاوطن: حشمت ٹھلرام کیول رامانی

ہمارے دوست سلام دھاریجو نے دیارام گدومل پر ہمارا بلاگ پڑھتے ہی حکم صادر کیا کہ حشو کے بارے میں کچھ لکھیں۔ یوں تو پاکستان کی سیاسی تاریخ جلاوطنیوں سے بھری پڑی ہے لیکن ان میں اکثریت خودساختہ جلاوطنیوں کی ہے۔ حشمت ٹھلرام، جنھیں پیار سے حشو پکارا جاتا تھا، پاکستان کے غالباً وہ پہلے سیاسی کارکن تھے جنھیں 1949 میں زبردستی جلاوطن کیا گیا۔ شیخ ایاز اپنی کتاب ساہیوال جیل کی ڈائری میں لکھتے ہیں:

جب میں 1963 میں دہلی سے رخصت ہو رہا تھا تو مجھے حشو نے الوداعی ملاقات میں کہا تھا:

”ایاز ایک بات ہرگز نہ بھولنا، اگر تم نے پاکستان میں کسی رفیوجی (مہاجر) پر ہاتھ اٹھایا تو سمجھنا کہ مجھ پر ہاتھ اٹھایا کیونکہ میں بھی ہندوستان میں رفیوجی (شرنارتھی) ہوں۔“

حشو حقیقتاً ایک نابغۂ روزگار شخص تھے۔ ان کا مطالعہ انتہائی وسیع تھا۔ حشو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے برطانیہ بھی گئے مگر بغیر کوئی ڈگری لیے واپس کراچی لوٹ آئے۔ اس کے بعد انھوں نے عملی سیاست کا آغاز کر دیا۔ وہ لندن میں اندرا گاندھی کے ہم جماعت تھے۔ تقسیم ہند سے قبل انھوں نے سامراج دشمن سیاست میں اہم کردار ادا کیا۔ حشو کے ساتھیوں میں کامریڈ سوبھو گیانچندانی، ابراہیم جویو اور شیخ ایاز بھی شامل تھے۔ سائیں جی ایم سید حشو سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ جی ایم سید آغاز میں کانگریس کی سیاست کرتے تھے۔ بعدازاں مسلم لیگ میں شامل ہوئے۔ پھر ان کے قائداعظم سے اختلافات ہو گئے اور انھوں نے مسلم لیگ چھوڑ دی۔ کانگریس کی سیاست مشترکہ ہندوستان میں مذہب سے بالاتر سیاست کی علمبردار تھی جبکہ مسلم لیگ کی سیاست کا محور یہ تھا کہ ”مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ“۔ ان دونوں پارٹیوں کی سیاست کو رد کرنے کے بعد جی ایم سید اس شش و پنج کا شکار تھے کہ ان کی سیاست کی بنیاد کیا ہونی چاہیے۔ جی ایم سید اپنی کتاب جنب گذاریم جن سیں کے صفحہ 217 پر لکھتے ہیں:

اس وقت حشو کی محبت اور گفتگو میرے لیے روشنی کی کرن ثابت ہوئی۔ اس نے ”مسئلہ

قومیت" کی بنیادی روح سے مجھے متعارف کیا۔ اس حوالے سے میں نے پوری صورتحال کو ایک نئے نقطۂ نظر سے پڑھنا شروع کیا۔ کانگریس کا نظریہ یہ تھا کہ ہندوستان میں بلاتفریق مذہب ایک قوم بستی ہے۔ دوسری جانب مسلمانوں کا جداگانہ نظریہ دنیا کے دیگر نظریوں کے مقابلے میں فرسودہ، غلط فہمی پر مبنی، اور جذباتی لگ رہا تھا۔ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے سندھ کی جداگانہ قومیت ہی حقیقی شے نظر آئی۔ اس کے بعد مجھے مستقبل کا راستہ صاف اور واضح نظر آنے لگا۔

جی ایم سید کے مطابق دہلی میں حشو نے "سندھو سماج" کو قائم کرنے کے لیے کوششیں کیں۔ ابتدا میں "سندھی بولی کنونشن" منعقد کیا گیا جس میں اس وقت ہندوستان کے صدر رادھا کرشنن کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ معروف ادیب لچھمن کومل اپنی خودنوشت سوانح عمری وہی کھاتے جا پنّا (بہی کھاتے کے ورق) کے صفحہ 75 پر شیخ ایاز اور حشو کے تعلقات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

حشو کے گھر رم کے دو چار پیگ لگانے کے بعد ایاز بے حد جذباتی ہو گیا۔ وہ عدالت میں وکیلوں کی طرح اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک ہی سانس میں بولتے ہوئے جھک کر حشو کے پیر چھونے لگا۔ پھر کھڑے ہو کر انگریزی میں تقریر کرنے لگا: I owe half my existence to Hashu. (میرا نصف وجود حشو کی وجہ سے ہے۔)

حشو جواباً بولا: ?Why half Ayaz? Why not full (نصف کیوں ایاز؟ مکمل کیوں نہیں؟)

ایاز بولا: "مکمل نہیں حشو، صرف نصف۔"

حشو انگریز سامراج کے سخت خلاف تھے اور چاہتے تھے کہ جتنی جلد ہو سکے، متحدہ ہندوستان کو برطانوی راج سے چھٹکارا حاصل ہو۔ شیخ ایاز اپنی کتاب ساہیوال جیل کی ڈائری کے صفحہ 597 پر حشو کی سامراج دشمنی کو یوں بیان کرتے ہیں:

حشو نے انگریز سامراج کے خلاف پوسٹر چھاپا، جس میں ہندوستان کے نقشے پر لانگ بوٹ بنا ہوا تھا اور لکھا تھا: Stop this march of imperialism۔ یہ پوسٹر چھاپنے پر انگریزوں نے اسے دو سال کی سزا دی تھی مگر وہ ڈیڑھ سال کے بعد اکتوبر 1941 میں رہا

ہو گیا تھا۔

شیخ ایاز مزید لکھتے ہیں کہ وہ اکثر کسی کا قول دہراتا تھا:

I shall live for comunism, I shall die for communism, but I shall not live under communism.

(میں کمیونزم کے لیے جیوں گا، میں کمیونزم کے لیے مروں گا، لیکن کمیونزم کے تحت نہیں جی سکتا۔)

حشو سوبھو کو بھی کہتا تھا:

You will always be used by communists and supply with your life and bones the foundation of a new building.

(تمھیں کمیونسٹ ہمیشہ استعمال کریں گے۔ وہ تمھاری زندگی اور ہڈیاں ایک نئی تعمیر کی بنیادوں میں کام لائیں گے۔)

حشو سندھ کو اپنا وطن مانتے تھے اور کسی بھی صورت میں یہاں سے ہجرت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد بھی انھوں نے پاکستان نہ چھوڑا۔ 1947 میں انھیں کراچی میں نظر بند کر دیا گیا۔ شیخ ایاز کے بقول، اس وقت وہ دن رات اپنے فلیٹ میں بند جی ایم سید کی کتاب نئے سندھ کے لیے جدوجہد) کا انگریزی ترجمہ ***My Struggle for New Sindh*** کے عنوان سے کر رہے تھے۔

تقسیم کے بعد جی ایم سید کے نظریات حکمرانوں کے لیے قابل قبول نہ تھے۔ تقسیم سے قبل حشو برطانوی راج کا نشانہ بنے اور پاکستان بننے کے بعد پاکستانی بیوروکریسی کا۔ پولیس نے حشو کو مسعود کھدر پوش کی عدالت میں پیش کیا جو اس وقت کراچی کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ (مسعود کھدر پوش وہ شخصیت ہیں جنھوں نے سندھ کے ہاریوں کی حالت زار جاننے کے لیے کمیشن میں اختلافی نوٹ لکھا تھا جو بعدازاں ''ہاری رپورٹ'' کے نام سے شائع ہوا۔) مسعود کھدر پوش حشو کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ شیخ ایاز اپنی کتاب ساہیوال جیل کی ڈائری کے صفحہ 550 پر لکھتے ہیں:

دورانِ گفتگو مسعود نے حشو سے کہا، ''حشو تم ہندوستان کیوں نہیں چلے جاتے؟''

حشو نے ٹکا کر جواب دیا، ''مسعود، یہ میرا وطن ہے، میں ہندوستان کیوں جاؤں؟''

مسعود نے اپنے انگوٹھے سے برابر والے کمشنر کے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"You Sindhis will be decimated like Red Indians ."

(تم سندھی ریڈ انڈینز کی طرح ملیامیٹ کر دیے جاؤ گے۔)

پھر مسعود نے سر جھکا کر حشو کی نظر بندی کی معیاد بڑھانے کا آرڈر لکھا اور جب تک ہم ان کے کمرے سے نکل نہیں گئے، اس نے ہمیں آنکھیں اوپر اٹھا کر نہیں دیکھا۔

میں مسعود کے الفاظ سن کر حیرت زدہ رہ گیا۔ حشو کی رہائی کے کچھ عرصے بعد انھیں ملک بدر کیا گیا۔ ہم انھیں سائیں جی ایم سید کے گھر سے ایرپورٹ چھوڑ آئے تھے۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، حشو تقسیم کے بعد بھی ہندوستان منتقل ہونے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھے۔ 1963 میں ہندوستان میں 15 برس گزارنے کے بعد بھی وہ خود کو وہاں شرنارتھی (مہاجر) سمجھتے تھے۔ انھیں شاید وطن سے دوری کے کرب کا مکمل اندازہ تھا۔

جلاوطنی کے بعد ہندوستان میں ان کی جو حالت ہوئی اسے معروف سندھی ہندو صحافی پھمن کومل اپنی خودنوشت کے صفحہ 4-73 پر یوں بیان کرتے ہیں:

ایک رات میں بمبئی میں کیرت بابانی کے گھر بیٹھا تھا۔ ابھی ہم نے پہلا ہی پیگ بنایا تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ کیرت کی بیوی سوبتا نے دروازہ کھولا تو حشو اندر داخل ہوئے۔ پھٹی ہوئی قمیض اور ملگجی پینٹ، مہینے بھر کی بڑھی ہوئی سپید داڑھی، سر پر سیاہ رنگ کا پرانا پچکا ہوا فیلٹ ہیٹ، جھریوں بھرا چہرہ، اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے۔

''ارے پھمن تم؟'' وہ مجھ سے بغل گیر ہو کر چپ چاپ صوفے پر بیٹھ گئے۔ کیرت نے بے نیازی سے ان کے لیے ایک پیگ بنایا۔ وہ پورا گلاس ایک ہی گھونٹ میں پی گئے۔ کیرت مجھے وہاں سے اٹھا کر اندر کمرے میں لے آیا اور کہنے لگا: ''یہ آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑیں گے، تم انھیں 5 روپے دے کر جان چھڑاؤ۔ میں دے دے کر تھک گیا ہوں۔ پیسے ملتے ہی وہ یکدم چلے جائیں گے۔'' میں نے آنسو بھری آنکھوں سے حشو کو صوفے سے اٹھایا۔ وہ ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے بوتل تلاش کر رہے تھے جو کیرت نے الماری میں رکھ دی تھی۔

میں نے جیب سے 10 کا نوٹ نکال کر چپ چاپ حشو کی ہتھیلی پر رکھ کر ان کی مٹھی بند کر دی۔ پیسے ملتے ہی حشو فوراً دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ میں دروازے کی اوٹ سے سندھ کے اس عظیم دانشور، اعلیٰ مفکر، انگریزی صحافت کی دنیا میں آبرودار رتبہ رکھنے والے حشو کیولرامانی کو آخری بار بڑے بڑے قدم اٹھاتے ہوئے اندھیرے میں گم ہوتے دیکھتا رہا۔

واپس اندر آ کر میں نے کیرت سے کہا کہ کھانا مت منگوانا، آج میں ایک لقمہ بھی نہیں نگل پاؤں گا۔

حشو کتنے عظیم انسان تھے، ان کی عظمت کو ایک بلاگ میں بیان نہیں کیا جا سکتا، اس کے لیے ایک مکمل کتاب کی ضرورت ہے۔ انھوں نے جلاوطن ہونا پسند کیا، لیکن اپنے خیالات پر اور اپنی جدوجہد پر سمجھوتہ کرنے کے لیے کبھی رضامند نہیں ہوئے۔ پاکستان سے جلاوطنی کے بعد بھی انھیں پاکستان ہجرت کرنے والوں کا خیال تھا کہ کہیں ان کے ساتھ زیادتی نہ ہو، صرف اس وجہ سے کہ انھوں نے ترکِ وطن کیا تھا اور وہ ترکِ وطن کی تکلیف سے اچھی طرح واقف تھے۔

بیچارہ ریڈیو پاکستان

''چن! (چاند) میں نے کراچی میں تین نغمے آج ہی ریکارڈ کروائے ہیں۔ تسی رات کو آٹھ بجے ریڈیو پر سن لینا۔''

یہ الفاظ پاکستان کی نامور گلوکارہ ملکۂ ترنم نور جہاں کے تھے، جو کہ پاکستان کے اس وقت کے صدر جنرل یحییٰ خان سے ٹیلیفون پر بہت ہی بے تکلفی سے بات کر رہی تھیں۔ اس واقعے کے راوی جمیل زبیری صاحب ہیں، جنھوں نے ریڈیو پاکستان کے ساتھ ایک طویل عرصہ گزارا۔ یہ تمام صورتحال انھوں نے اپنی کتاب یاد خزانہ: ریڈیو پاکستان میں 25 سال کے صفحہ 222 پر بیان کی ہے۔ وہ اس حوالے سے مزید لکھتے ہیں:

[1971 میں جس وقت پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جنگ ہو رہی تھی] لڑائی جاری تھی اور ہم لوگ نغمے وغیرہ تیار کرنے میں مصروف تھے۔ کسی طرح مادام نور جہاں ایک روز لندن سے کراچی پہنچ گئیں اور نغمے ریکارڈ کروانے ریڈیو پاکستان کراچی اسٹیشن آئیں۔ ریڈیو نے ان کی موجودگی سے فائدہ اٹھایا، اور اسی وقت انتظامات کر کے ان کی آواز میں تین نغمے ریکارڈ کر لیے۔

نغمے ریکارڈ کر کے وہ اسٹوڈیو سے نکلیں اور اسٹیشن ڈائریکٹر طاہر شاہ کے کمرے میں آ کر ان سے کہنے لگیں کہ ٹیلیفون یحییٰ خان سے ملوائیں، اور میری بات کروائیں۔ کچھ بھی ہو، یحییٰ خان بہر حال صدر تھے۔ وہ ذرا گھبرائے۔ وہ کہنے لگیں، آپ ڈریں نہیں، رنگ کریں اور ٹیلیفون مجھے دے دیں۔ جب وہ کسی طرح نہیں مانیں تو طاہر شاہ مجبور ہو گئے۔ اس وقت میں بھی ان کے کمرے میں موجود تھا۔ میں اس واقعے کا چشم دید گواہ ہوں۔ چنانچہ فون ملایا گیا۔ شاید پہلے ان کے سیکرٹری بولے ہوں گے، پھر وہ خود فون پر آ گئے۔ تب مادام نور جہاں نے ان سے یہ الفاظ کہے تھے۔

ہم لوگوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ مادام نور جہاں نے خود ہی نغمے نشر ہونے کا وقت بھی

مقرر کر دیا اور صدر کو بتا دیا۔ پریشانی یہ تھی کہ اس وقت خبریں نشر ہوتی تھیں۔ جنگ ہو رہی تھی اور نغموں کے لیے خبروں کا وقت تبدیل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مادام نور جہاں کو کھانے کے لیے دوسرے کمرے میں بھیج دیا گیا اور طاہر شاہ نے پریشانی میں ڈائرکٹر جنرل کو اسلام آباد فون کر کے سب بتا دیا۔ ڈائرکٹر جنرل نے کہا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں صدر کے سیکرٹری سے بات کر لوں گا۔ یہ نغمے خبروں پر تبصرے کے بعد نشر کر دیے جائیں۔

ریڈیو پاکستان اپنے آغاز سے لے کر اب تک حکومتی ترجمان کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ ریڈیو کو چلانے والے افسران کا انتخاب حکمرانوں کی پسند اور ناپسند سے ہوتا تھا۔ زیڈ اے بخاری مارشل لا کے نفاذ سے پہلے نوکر شاہی کے بہت قریب اور اس کی سازشوں میں شریک رہے تھے، اس حوالے سے مارشل لا حکومت کا پہلا شکار بنے۔ برہان الدین حسن اپنی کتاب پس پردہ کے صفحہ 38 پر اس حوالے سے لکھتے ہیں:

جب ایوب خان قوم سے پہلے خطاب کے لیے براڈ کاسٹنگ ہاؤس آئے تو انھوں نے فوری طور پر زیڈ اے بخاری کے بارے میں ناپسندیدگی کا تاثر دیا۔ ممکن ہے انھوں نے بخاری کو ضرورت سے زیادہ پر اعتماد پایا ہو، یا ان سے تھوڑی بہت گستاخی سرزد ہو گئی ہو۔ بخاری صاحب اس کے تھوڑے عرصے بعد ریٹائر کر دیے گئے۔ ان کے پرانے ساتھی سید رشید احمد بھی، جنھیں ان کا جانشین مقرر کیا گیا، زیادہ عرصہ اپنے عہدے پر نہیں رہ سکے اور ریڈیو پاکستان کا کنٹرول سرکاری افسروں کے ہاتھ میں چلا گیا جو اسے حکومت کی منشا کے عین مطابق چلانے کا فن خوب جانتے تھے۔

اس طرح ریڈیو پاکستان جو کہ ثقافت اور آرٹ کی تخلیق کا مرکز تھا، محض وزارت اطلاعات کا ایک ماتحت دفتر بن کر رہ گیا۔ ریڈیو کی خبروں کو بھی تقریروں، بیانات اور پی آئی ڈی کے جاری کردہ پریس نوٹس کا ملغوبہ بنا دیا گیا۔ مجھے ایک سینئر سرکاری افسر کی بات یاد ہے جسے ریڈیو پاکستان کا ڈی جی مقرر کیا گیا۔ یہ موصوف پہلی بار براڈ کاسٹنگ ہاؤس کے سرکاری دورے پر آئے۔ اس سے پہلے انھوں نے نہ تو ریڈیو اسٹیشن کی شکل دیکھی تھی

نہ ہی زندگی میں کبھی مائیکروفون سے واسطہ پڑا تھا۔ اس لیے وہ ریڈیو پاکستان کو بار بار "دی ریڈیو پاکستان" کہہ رہے تھے۔

ریڈیو پاکستان کے ملازمین کی نوکری ہمیشہ داؤ پر لگی رہتی تھی۔ خصوصاً آمرانہ دورِ حکومت میں کسی بھی ایسے لفظ پر جو حکمران یا اس کے حواریوں کو ناگوار گزرے، نہ صرف افسران کی طلبی ہوتی تھی، بلکہ اظہارِ وجوہ کے نوٹس بھی جاری کیے جاتے تھے۔ وہ بھی اس صورت میں جب وہ فرد باقاعدہ ملازم ہو۔ اگر ملازم نہیں، بلکہ لکھاری یا دانشور ہوتا، تو اس کا نام سیاہ فہرست (بلیک لسٹ) میں ڈال دیا جاتا تھا اور اس کے بعد ان کے ریڈیو میں داخلے پر پابندی لگا دی جاتی تھی۔ بعض اوقات صورتِ حال انتہائی مضحکہ خیز ہو جاتی۔ جمیل زبیری جنرل ضیا کے دور کی ایسی ہی ایک صورتِ حال کا ذکر اپنی کتاب کے صفحہ 287 پر یوں کرتے ہیں:

اس زمانے میں ہم عالمی سروس سے ایک پروگرام "کلام شاعر بہ زبانِ شاعر" نشر کیا کرتے تھے۔ ایک روز ایک شاعر اپنا کلام میرے پاس لے کر آئے۔ ان کا نام ضیاء الحق تھا۔ میں نے غزل دیکھی، ٹھیک ٹھاک اور قابلِ نشر تھی۔ انھیں اوپر اسٹوڈیو میں بھیج دیا۔ میری خوش قسمتی کہ اس وقت ڈیوٹی پر آغا جان جیسا سمجھدار ڈیوٹی افسر موجود تھا۔ ذرا ہی دیر میں میرے پاس ان کا فون آیا۔ بولے: زبیری صاحب، ایک شاعر اپنا کلام نشر کروانے آئے ہیں اور اپنا پورا نام مع تخلص کے نشر کرنا چاہتے ہیں۔ ضیاء الحق فتنہ۔

میں نے پریشان ہو کر کہا کہ انھیں روکیں، فوراً روکیں۔ وہ کیوں مجھے اور آپ کو ملازمت سے نکلوانا چاہتے ہیں؟ بہر حال، میں نے آغا جان سے کہا کہ انھیں کہیں کہ وہ نیچے آ کر اپنا کلام ریکارڈ کروائیں، ہم بعد میں نشر کر دیں گے۔ (ریڈیو پاکستان کراچی میں ایک دفتر نیچے بھی بنا ہوا ہے)۔ چنانچہ وہاں ان کی ریکارڈنگ کی گئی اور ان سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنا مقطع نہ پڑھیں۔

جب پاکستان میں ایف ایم ریڈیو کا آغاز ہوا تو اس نے اے ایم ریڈیو کے روایتی طریقۂ کار کو تقریباً تباہ کر دیا۔ یہ عوامی ریڈیو تھا جو عوام کی زبان میں بات کرتا تھا۔ اس سے متاثر ہو کر پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن نے بھی ایف ایم ریڈیو کا آغاز کیا۔ اسی طرح کا ایک ایف ایم اسٹیشن حیدرآباد

میں قائم کیا گیا۔ ابتدا میں میرے دوستوں احمد رضا اور جنید نصیر فاروقی کا انتخاب بحیثیت میزبان کے کیا گیا۔ ان دونوں دوستوں نے ایف ایم 101 حیدرآباد کے حوالے سے بہت شہرت کمائی۔ احمد رضا آج کل بی بی سی میں پروڈیوسر کے حوالے سے خدمات انجام دے رہے ہیں، جبکہ جنید نصیر فاروقی کراچی میں مختلف ایف ایم ریڈیوز پر میزبانی کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ ان دونوں حضرات نے ہمیں راغب کیا کہ ہم بھی ایف ایم میزبانی کے لیے آڈیشن دیں اور ان دونوں کی رہنمائی کی وجہ سے 45 لوگوں میں سے جو تین لوگ منتخب ہوئے، ان میں ہم بھی شامل تھے۔

ایک دن عالمی یوم خواتین تھا۔ یہ جنرل پرویز مشرف کے دور کی بات ہے۔ ہم نے اس موقع پر ایک گانا ''ہم مائیں، ہم بہنیں، ہم بیٹیاں، قوموں کی عزت ہم سے ہے'' نشر کیا۔ یہ گانا ابھی آدھا ہی نشر ہوا تھا کہ ڈیوٹی افسر مجاہد عزیز ہانپتے کانپتے اسٹوڈیو میں داخل ہوئے اور ساؤنڈ انجینئر کو عجیب وغریب اشارے کرنے لگے۔ ہم ان کے اشارے سمجھ نہ پائے۔ اردو میں ایک مثال مشہور ہے کہ گونگے کی بولی گونگے کی ماں ہی سمجھے۔ اچانک بیک گراؤنڈ میوزک چلنا شروع ہو گیا۔ ہم حیران پریشان۔ انھوں نے کہا کہ دوسرا گانا نشر کرو۔ اس کے بعد ہم نے نئے سرے سے تمہید باندھی، فنی خرابی کا ذکر کیا، اور نیا نغمہ نشر کر دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ایف ایم انچارج نے اس بات پر اعتراض کیا تھا کہ یہ نغمہ محترمہ بےنظیر بھٹو کے دورِ حکومت میں نشر ہوا تھا۔ وہ اب جلاوطن ہیں، اور ملک میں مشرف کی حکومت ہے۔ سارے پروگرام مانیٹر ہوتے ہیں۔

انھوں نے عملے کو کہا کہ یہ شخص ہماری نوکریوں کے پیچھے پڑا ہے، اب اسے پتا لگے گا۔ پتا کیا لگنا تھا! کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہم یہ سمجھتے تھے کہ یہ سب کچھ ہمیں آف ایئر کرنے کے لیے کیا گیا۔ لیکن 2015 میں جب جمیل زبیری صاحب کی کتاب پڑھی تو اندازہ ہوا کہ ان کی بات سچ تھی۔ جمیل زبیری نے اپنی کتاب کے صفحہ 287 پر ایسے ہی ایک واقعے کو یوں بیان کیا ہے:

> پیپلز پارٹی نے اگلے سال بھٹو کی سالگرہ منانے کا فیصلہ کیا۔ عالمی سروس سے ان دنوں فرمائشی پروگرام نشر کیا جاتا تھا۔ اتفاق سے وہ وہی دن تھا۔ ایک فلمی گانا ''سالگرہ کا دن آیا ہے'' بہت مقبول ہوا تھا اور ہمارے پاس اسے نشر کرنے کی فرمائش کے کئی خط آئے تھے۔ سالگرہ کے دن اس خط کو غیر ارادی طور پر فرمائش میں شامل کر کے مجھے بھیج دیا گیا۔

میں نے بھی اسے کوئی خاص اہمیت نہ دی، اور وہ گانا نشر ہو گیا۔ اور چونکہ وہ گانا بہت پسند کیا جا رہا تھا، لہٰذا کراچی اسٹیشن کے اناؤنسر نے ہماری سروس سے یہ ریکارڈ لے کر کراچی اسٹیشن سے بھی نشر کر دیا۔ اس کا نشر ہونا تھا کہ قیامت سی آ گئی۔ کراچی سے اسلام آباد تک ٹیلیفون کھڑکنے لگے اور انکوائری شروع ہو گئی کہ یہ گانا بھٹو کی سالگرہ کے دن کیسے اور کیوں نشر کیا گیا۔

وہ مزید لکھتے ہیں کہ جماعت اسلامی کے روزنامہ جسارت نے اگلے دن نہ صرف اس خبر کو موٹا موٹا چھاپا، بلکہ ساتھ یہ بھی اضافہ کیا گیا کہ "عالمی سروس سے نہ صرف یہ گانا نشر کیا گیا ہے، بلکہ یہ بھی سنا گیا ہے کہ اس کے ایک کمرے میں بھٹو کی سالگرہ کا کیک بھی کاٹا گیا ہے۔"

بہر حال اس خبر کے بعد مجھے وارننگ کا ایک خط ملا۔ کراچی اسٹیشن کے پروڈیوسر کی دو سال کے لیے ترقی بند ہوئی، اور کراچی اسٹیشن کا اناؤنسر معطل کیا گیا۔ بعد میں ان دونوں کو معافی مل گئی تھی اور میری وارننگ بھی فائل سے خارج کر دی گئی تھی۔ چند روز بعد ڈپٹی کنٹرولر بدر عالم کا تبادلہ ہو گیا اور ان کی جگہ مجید فاروقی آ گئے۔

ریڈیو پاکستان کی تاریخ ایسے بے شمار واقعات سے پُر ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ اس کی تقریباً سات دہائیوں پر مشتمل تاریخ سے چند واقعات آپ کی نذر کیے جائیں۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اگر اس ادارے کو آزادانہ طور پر کام کرنے دیا جاتا تو یہ بلاشبہ دنیا کی نامور ریڈیو سروسز میں شمار ہوتا۔

لیکن ان سب واقعات کے باوجود اس بات سے انکار کرنا ممکن نہیں ہے کہ ریڈیو پاکستان اب بھی ایک بہت ہی معیاری ادارہ ہے، اور میڈیا کی ترقی کے اس دور میں جہاں زبان و بیان کے بخیے ادھیڑے جاتے ہیں، وہاں ریڈیو پاکستان میں اب بھی تلفظ میں زیر زبر پیش کا خیال رکھا جاتا ہے۔ پاکستانی فلمی انڈسٹری اور صحافت کے بڑے بڑے ناموں نے اپنے کریئر کا آغاز ریڈیو پاکستان سے کیا، اور یہیں سے حاصل کی گئی تربیت کے بل بوتے پر اپنا آپ منوایا ہے۔

سندھ کے عوامی سیاستدان: عبدالمجید جیٹھانند سندھی

گزشتہ دنوں ہمارے بلاگ ''بیچارہ ریڈیو پاکستان'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک ہم دم دیرینہ ولی محمد صاحب نے فرمایا کہ ہم لکھتے تو ٹھیک ہیں، لیکن کبھی دائیں بازو کی نامور شخصیات کے بارے میں نہیں لکھا۔ گزارش یہ ہے کہ تقسیم سے قبل دائیں اور بائیں کی سیاست تو ضرور ہوتی تھی لیکن اس میں نمایاں بات سیاہ اور سفید کی ہوتی تھی۔ کوئی مذہبی شخصیت ہو یا سیکولر، اس کا کردار دیکھا جاتا تھا نہ کہ نظریات۔ شیخ عبدالمجید سندھی بھی ان ہی میں سے ایک تھے۔

پیر علی محمد راشدی 1980 کی دہائی میں شائع ہونے والے اپنے کالموں کے مجموعے رودادِ چمن (مطبوعہ 2002) کے صفحہ 69 پر لکھتے ہیں:

شیخ صاحب مرحوم کو پاکستان کی خدمت کا موقع نہیں دیا گیا۔ جیسے ہی نوکر شاہی کے تعاون سے ایوب خان نے اقتدار پر قبضہ کیا تو اس کو 85 سال کی عمر میں اس گناہ کی پاداش میں جیل میں ڈال دیا گیا کہ اس نے ایک کاغذی عرضداشت یا **Petition of Rights** بصورت قرارداد مرتب کی تھی جس کا مفہوم یہ تھا:

''اے سلطان ابن سلطان، فی الحال شہنشاہ پاکستان، جنرل ایوب خان، فیلڈ مارشل (بغیر کوئی جنگ لڑے) زمین وزمان، خالقِ شوشۂ بنیادی جمہوریان، اللہ تعالیٰ آپ کو فتح پاکستان اور اس پر آپ کا شخصی راج مبارک کرے کیونکہ شروع میں یہ ملک آپ ہی نے اپنی تلوارِ آبدار سے انگریز اور ہندو دونوں کو میدانِ جنگ میں شکست دے کر حاصل فرمایا تھا (جب سیاست دان اور ہندوستان کے مسلمان و دیگر محض بکواس کرتے پھرتے تھے)۔

''اس وقت ہم سوختہ ساماں، بندگانِ درگاہ، بندوق پایئگاہ کی التجا صرف اتنی ہے کہ پاکستان میں بسنے والے ان بے زبان، انسان نما کیڑوں مکوڑوں کو (جن کو عرفِ عام میں عوام کہا جاتا ہے)، ان کے پیدائشی، جمہوری، اور انسانی حقوق سے مزید وقت محروم نہ رکھا جائے، اور شعبدہ بازیوں اور جھوٹی زبانی طفل تسلیوں کو چھوڑ کر ان کی طرف انسانی جمہوری

حقوق کا ٹکڑا پھینک کر، ان کو اقوام عالم کے سامنے مستقلاً بے آبرو ہو کر رہنے سے بچا لیا جائے۔"

اس 85 سال کے بوڑھے بیمار کی تب جا کر ایوبی عتاب سے جان چھوٹی جب اللہ تعالیٰ نے خود ایوب خان کو ہٹانے کا انتظام فرمایا۔ عوام کو حقوق پھر بھی نہیں ملے، صرف اتنا ہوا کہ ایوب خان کی جگہ یحییٰ خان آ گیا۔ یعنی یک نہ شد دو شد۔

شیخ صاحب کے اجداد سیہون شریف سے ہجرت کر کے ٹھٹھہ میں آباد ہوئے۔ ان کے خاندان کا تعلق قانون کی مہارت رکھنے والے ہندو عاملوں کی شاخ نویانی سے تھا۔ سائیں جی ایم سید اپنی کتاب جنب گذاریم جن سیں (میرے ہم دم، میرے رفیق) میں لکھتے ہیں:

شیخ صاحب کا نام جیٹھانند تھا۔ وہ 7 جولائی 1889ء، 8 ذوالقعدہ 1306 ہجری کو اتوار کے دن پیدا ہوئے۔ 10 فروری 1908 کو انھوں نے مسلمان ہونے کا فیصلہ کیا۔ ان کا اسلامی نام عبدالمجید رکھا گیا۔ ہندوؤں کے احتجاج پر انھیں کچھ عرصے کے لیے لدھیانہ بھیج دیا گیا، جہاں سے وہ جلد کراچی لوٹ آئے۔ کراچی کے حالات سازگار نہ پا کر وہ حیدرآباد منتقل ہو گئے۔

شیخ صاحب نہ صرف سندھ اور انڈیا، بلکہ بین الاقوامی سیاست پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کی سیاسی پیشن گوئیاں ہمیشہ سچ ثابت ہوتی تھیں۔ اس حوالے سے ان کا مطالعہ اتنا وسیع تھا کہ سندھ کے نامور سیاستدان ان کو اپنا رہنما مانتے تھے۔ وہ انتخابی سیاست کی روح سے بھی بخوبی واقف تھے اور ان کے انتخابی فیصلے ہمیشہ کامیاب ہوتے تھے۔

انھوں نے ایسا ہی ایک فیصلہ کیا اور وہ سر شاہنواز بھٹو کے خلاف انتخابات میں حصہ لینا تھا۔ لاڑکانہ میں سر شاہنواز بھٹو کے خلاف انتخابات لڑنا ایک انقلابی فیصلہ تھا۔ شیخ صاحب کا تعلق عوام سے تھا، اور ان کا انداز بھی عوامی تھا۔ ان کی انتخابی مہم بیل گاڑیوں پر چلائی گئی، جبکہ سر شاہنواز بھٹو کے حمایتی ان کی مہم جیپوں پر چلا رہے تھے۔ پیر علی محمد راشدی اپنی کتاب اُہے ڈینھ اُہے شینھ (وہ دن وہ لوگ) کے صفحہ 162 پر لکھتے ہیں:

وہ سر شاہنواز بھٹو مرحوم کے حلقے سے امیدوار ہو کر سر صاحب کو شکست دے کر سندھ اسمبلی

کے ممبر منتخب ہوے۔ سر شاہنواز سندھ کی سیاست سے ہمیشہ کے لیے خارج ہو گئے۔
بعدازاں انھوں نے بمبئی میں ایک سرکاری عہدہ حاصل کیا۔

سر شاہنواز بھٹو کی پڑپوتی فاطمہ بھٹو اپنی کتاب **Songs of Blood and Sword** (ترانہ ہائے خنجر و خون) کے صفحہ 43 پر اس تمام واقعے کو اپنے منفرد انداز میں پیش کرتی ہیں۔ اپنے پڑدادا سر شاہنواز بھٹو کی عظمت کو بیان کرتے ہوے ان کے مقابلے میں انتخابات میں حصہ لینے والے شیخ عبدالمجید سندھی کو وہ ایک غیر معروف اور غیر مقامی شخصیت قرار دیتی ہیں۔ کاش وہ یہ سطور لکھنے سے پہلے شیخ عبدالمجید سندھی کے بارے میں کچھ مطالعہ کر لیتیں، تو مجھے یقین ہے یا تو ان کے یہ خیالات کتاب میں شامل نہ ہوتے، اور اگر ہوتے تو طرزِ تحریر کچھ الگ ہوتا۔ فاطمہ بھٹو نے جو لکھا ہے، ہم اُسے من و عن بیان کرتے ہیں:

> 1935 میں برطانوی راج نے انڈیا ایکٹ کے تحت مختلف صوبوں میں کونسلیں قائم کیں اور اکتوبر 1937 میں انتخابات ہوے۔ چونکہ ان دنوں سندھ صوبے میں کوئی سیاسی جماعت نہیں تھی، اس لیے یہ انتخابات بہت غیر معمولی تصور کیے جا رہے تھے۔ سر شاہنواز بھٹو جو کہ زہر مار کرنے والے غلام مرتضیٰ کے بیٹے تھے اور برطانوی راج کی طرف سے متنازع قرار دیے گئے تھے، اپنے علاقے لاڑکانہ سے انتخابات میں حصہ لینے کے لیے کھڑے ہوے۔
>
> وہ ایک زمیندار، معزز اور وہاں کے مقامی شخص تھے اور کافی اثر و رسوخ رکھتے تھے، لیکن پھر بھی ہار گئے۔ ایک نہایت غیر معروف اور غیر مقامی شخص شیخ عبدالمجید سندھی نے سر شاہنواز بھٹو کو ان انتخابات میں شکست دے دی۔ بعد میں یہ افواہ بھی سُننے میں آئی کہ شیخ کو بھٹو قبیلے کے کچھ افراد کی درپردہ مدد حاصل تھی تا کہ سر شاہنواز بھٹو کو مقامی سیاست سے فارغ کیا جا سکے۔

وہ مزید لکھتی ہیں: ''سر شاہنواز پرانے خیالات کے آدمی تھے۔ انھوں نے انتخابات میں شیخ عبدالمجید سندھی کی اس خودکار جیت اور اپنی شکست کو دھوکا جانا لیکن اس معاملے کو آگے نہیں بڑھایا۔ انھوں نے اپنے خاندان کے ساتھ سندھ چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور 1938 میں بمبئی منتقل ہو گئے۔''

ہمیں نہیں معلوم کہ فاطمہ بھٹو نے انھیں غیر معروف شخصیت کس طرح قرار دیا ہے، یا ان کے نزدیک کسی شخص کے معروف ہونے کا معیار کیا ہے۔ شیخ صاحب کی صلاحیتوں سے اس زمانے میں سب بخوبی واقف تھے۔ وہ ہندوستان کی سیاست میں پیش پیش رہے، اور انھیں آل پارٹیز کانفرنس کا صدر بھی بنایا گیا۔ ہندوستان کی سیاسی قوتوں اور جملہ قوموں کو بھی ان کی صلاحیتوں کو تسلیم کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ شیخ عبدالمجید سندھی نے سندھ کی صوبائی سیاست میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ وہ بمبئی کونسل کے ممبر رہے۔ اس کے بعد انھوں نے سندھ اسمبلی کی رکنیت بھی حاصل کی۔ سیاست کے علاوہ وہ صحافت سے بھی کافی عرصہ وابستہ رہے۔ انھوں نے سندھ میں مسلمانوں کے واحد روزنامے الوحید کی ادارت بھی کی۔ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کرنے کی تحریک میں بھی انھوں نے بھرپور حصہ لیا۔

شیخ صاحب انتہائی سادہ قسم کے انسان تھے۔ مسلم لیگ سے ان کا بے حد لگاؤ تھا، اور وہ مسلم لیگ کو منظم کرنا چاہتے تھے۔ اس حوالے سے انھوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کی سندھ میں ایک شاخ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کام کے لیے انھوں نے کچھ سیاسی شخصیات کو مشاورت کے لیے اپنے گھر مدعو کیا۔ اس مشاورت کا احوال جی الانا نے شیخ صاحب پر خان محمد پنہور کی لکھی ہوئی کتاب شیخ عبدالمجید سندھی، زندگی اور کامیابیاں کے ابتدائیے میں یوں بیان کیا ہے:

> میں اس وقت شیخ صاحب کی طرف سے دی گئی دعوت میں شریک تھا۔ قریب 12 افراد نے وہاں شرکت کی تھی۔ شیخ صاحب کے گھر میں اتنی کرسیاں نہیں تھیں لہٰذا ہم سب نیچے فرش پر بیٹھ گئے۔ شیخ صاحب نے ہمیں آل انڈیا مسلم لیگ کی سندھ میں شاخ قائم کرنے کے حوالے سے آگاہی فراہم کی۔ انھوں نے اس کی اہمیت بھی بتائی، اور اس حوالے سے انھوں نے بہت پختہ دلائل دیے۔ ہم سب ان کی اس تجویز پر متفق ہو گئے۔ ہم نے متفقہ طور پر شیخ صاحب کو اس نئی قائم ہونے والی سندھ مسلم لیگ کا صدر منتخب کیا۔ اب سوال یہ اٹھا کہ اس پارٹی کا سیکرٹری جنرل کسے بنایا جائے؟ اس بات پر بھی ہم سب نے متفقہ رائے قائم کی اور فیصلہ شیخ صاحب پر چھوڑ دیا۔

پیر علی محمد راشدی اپنی کتاب اُہے ڈینہ اُہے شینہ (وہ دن، وہ لوگ) میں لکھتے ہیں کہ 1938 میں منعقد ہونے والی کراچی مسلم لیگ کانفرنس میں شیخ صاحب نے تاریخی قرارداد پیش کی جس نے

تحریک تقسیم برصغیر و قیام پاکستان کی بنیاد ڈالی۔

قیام پاکستان کے بعد شیخ صاحب سیاسی طور پر معتوب ٹھہرے۔ وہ شخص جس نے ہندو سے مسلمان ہونے کے بعد جس جوش و جذبے سے ہندوستانی مسلمانوں کے حقوق کے لیے نہ صرف آواز اٹھائی، بلکہ عملی طور پر بھی جدوجہد کی، ان کی ان تمام خدمات کا صلہ دینے کے بجائے انھیں سیاسی اچھوت قرار دے دیا گیا۔

ان کا کردار مثالی تھا اور ان کی شخصیت اتنی وسیع اور کثیرالجہت تھی کہ ایک بلاگ میں اس کا احاطہ ممکن نہیں۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ اس حوالے سے ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کر سکیں، لیکن یہ بحرِ بیکراں ہے، جو بلاگ جیسے کوزے میں نہیں سما سکتا۔

قائد اعظم کے چہیتوں کی در بدری

فیضی رحمین اور عطیہ بیگم کی محبت ایک لازوال داستان ہے۔ فیضی رحمین ایک یہودی تھے اور عطیہ مسلمان۔ دونوں کی شادی کی بنیادی وجہ ان کے مابین فنونِ لطیفہ سے دلچسپی تھی۔ فیضی رحمین اور عطیہ بیگم کی محبت بعد میں شادی میں تبدیل ہوگئی۔ عطیہ سے شادی کرنے سے قبل فیضی رحمین نے اسلام قبول کیا۔ ڈاکٹر محمد یامین کے پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے کے مطابق فیضی رحمین 19 دسمبر 1880 کو ہندوستانی شہر پونا میں پیدا ہوئے۔ وہ پیدائشی یہودی تھے۔ ان کا پیدائشی نام سیمول رحمین تھا۔

عطیہ فیضی کا تعلق ایک امیر و کبیر گھرانے سے تھا۔ عطیہ ترکی میں پیدا ہوئیں۔ اس زمانے میں بچیوں کی تعلیم کا تصور نہ تھا اور پردے کی پابندی تھی۔ عطیہ نے نہ صرف تعلیم حاصل کی بلکہ یورپ کی سیاحت بھی کی۔ سفرِ یورپ کے دوران ان کی مغربی دانشوروں سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ ماہر القادری اپنی کتاب یادِ رفتگاں کے صفحہ نمبر 146 پر لکھتے ہیں: ''اس سفر نے 'نسوانی آزادی' کے جذبے کو اور زیادہ افرنگ زدہ بنا دیا۔'' ان کے مطابق مہاتما گاندھی جب پہلی بار گول میز کانفرنس میں شرکت کے بعد بحری جہاز سے ہندوستان واپس آرہے تھے تو عطیہ بھی اسی جہاز میں تھیں۔ انھوں نے اصرار کر کے گاندھی جی کی انگلی میں آل پن چبھوئی اور گاندھی جی نے اپنی انگلی کے خون کا نشان عطیہ فیضی کی آٹوگراف بک پر ثبت کر کے دستخط کیے۔

فیضی اور عطیہ بیگم کی شادی 1912 میں ہوئی اور یہ ساتھ 1964 میں فیضی کی وفات تک برقرار رہا۔ مارجری حسین کا مضمون روزنامہ ڈان کراچی میں 29 اکتوبر تا 3 نومبر 1996 کو شائع ہوا تھا۔ مضمون کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ اجمل کمال نے اپنی مرتبہ کتاب کراچی کی کہانی میں کیا ہے۔ اس کے مطابق:

''1947 میں فیضی اور عطیہ بیگم قائد اعظم محمد علی جناح کی درخواست پر ممبئی چھوڑ کر کراچی میں آباد ہو گئے۔ انھوں نے بمبئی کے 'ایوانِ رفعت' کو کراچی میں دوبارہ قائم کرنے کے کام کا آغاز کیا۔ قائد اعظم نے انھیں برنس روڈ پر ایک بڑا قطعہ زمین عطا کیا جس پر انھوں نے 30 لاکھ روپے کے ذاتی خرچ

سے عمارت بنوائی۔ یہ عمارت دو الگ الگ مکانوں پر مشتمل تھی جو نفاست سے لینڈ اسکیپ کیے ہوئے باغ کے درمیان واقع تھے۔ ایک ان کی رہائش گاہ تھی اور دوسرے میں آرٹ میوزیم واقع تھا۔

''مصور لیلیٰ شہزادہ کو معمر میاں بیوی کی شفقت ہمیشہ یاد رہے گی۔ جب وہ بہت نوعمر تھیں، ان کو جمعے کی شام اپنی تصویریں دکھانے کے لیے بلایا گیا (یہ ان کے کام کی پہلی پبلک نمائش تھی)۔ حوصلہ افزائی کے طور پر فیضی صاحب نے اپنی بنائی ہوئی ایک ڈرائنگ انھیں عنایت کی۔

''یہ بات ناقابل یقین لگتی ہے کہ قائدِ اعظم کی خواہش کو ان کی وفات کے صرف دس برس بعد کس طرح بے دردی سے پامال کر دیا گیا۔ پاکستان کی پہلی مارشل لا حکومت کے دنوں میں کراچی کے اس وقت کے کمشنر نے فیضی رحمین اور عطیہ بیگم کو نہایت سفاکی سے ان کے گھر سے بے دخل کر دیا۔

''اپنی موت تک ان ممتاز میاں بیوی کو بے انتہا توہین اور دشواری جھیلنی پڑی تھی۔ گھر سے نکال دیے جانے کے بعد ان کے جمع کیے ہوئے نوادرات اور تصویریں تھیلوں اور صندوقوں میں بند ہو گئیں۔ کوئی چارہ نہ پا کر یہ میاں بیوی پڑوس کے ایک تنگ و تاریک ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لے کر رہنے لگے۔ ان کا سامان اسی چھوٹے سے کمرے میں ایک ڈھیر کی شکل میں پڑا رہتا۔ عطیہ بیگم نے ایک ایک کر کے اپنے جواہرات کو بیچنا شروع کر دیا تاکہ زندگی کے اخراجات پورے کر سکیں۔

''آرٹ کے مقامی رجحانات نئے اور معاصر خطوط پر استوار ہو رہے تھے۔ نئے آرٹسٹ شہرت پا رہے تھے۔ فیضی رحمین کو کوئی کام نہ ملتا تھا اور ان کی بے بہا تصویروں کو بیچنے والا بھی کوئی نہ تھا۔

''معمر میاں بیوی اکثر ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کراچی آرٹس کونسل کی طرف پیدل جاتے ہوئے دیکھے جاتے اور نمائشوں کی افتتاحی تقریبوں اور چائے کی دعوتوں میں بلائے جانے پر ممنون ہوتے۔ لیلیٰ شہزادہ نے ایسے ہی ایک موقعے پر ایک اذیت ناک نظارہ دیکھا کہ عطیہ بیگم کچھ بسکٹ پلیٹ سے چوری چھپے اٹھا کر اپنے بیگ میں رکھ رہی ہیں تاکہ بعد میں کھانے کے کام آ سکیں۔''

منیر احمد اپنی کتاب پاکستان، سیاسی جوار بھاٹا کے صفحہ نمبر 159 پر سید امجد علی کے انٹرویو میں عطیہ فیضی اور ان کے شوہر فیضی رحمین کے ساتھ ہونے والے سلوک کا حال یوں بیان کرتے ہیں:

''س: عطیہ فیضی کا مکان مالابار ہل پر تھا۔ قائداعظم کے گھر کے قریب ہی۔

ج: ایریا وہی تھا۔ یہ مجھے یاد نہیں کہ قائداعظم کے قریب تھا یا نہیں۔ لیکن کشادہ مکان تھا۔ بڑا اچھا۔

س: علامہ کا عطیہ کے ساتھ کوئی شادی کا بھی پروگرام تھا؟

ج: ناں ناں، لیکن شبلی کے بڑے شعر ان کے بارے میں ہیں۔ مجھے بڑا دکھ ہوا عطیہ کا۔ وہ بیچاری یہاں رُل کر مر گئی۔ دونوں میاں بیوی چل سکتے نہیں تھے۔ غریب تھے۔ پیسے ان کے پاس رکھنے کے لیے نہیں ہوتے تھے۔

س: کسی نے ہیلپ نہیں کی حالانکہ بوہرا تھے اور کراچی میں بوہرے تجارت میں اچھے خاصے ہیں۔

ج: نہیں، کسی نے ہیلپ نہیں کی۔ مجھے بڑا دکھ ہوا بڑا رونا آیا جس وقت میں نے انھیں کراچی میں دیکھا، دونوں میاں بیوی کو۔ غلام محمد صاحب چونکہ اس کے واقف تھے، عطیہ کو جانتے تھے۔ کراچی میں انھوں نے اسے کچھ زمین دی۔ اس میں انھوں نے ایک چھوٹا سا ادارہ بنوایا کہ ان کے مرنے کے بعد میوزیم بن جائے گا۔ وہاں وہ رہتے تھے۔ غلام محمد صاحب مر گئے۔ این ایم خان کمشنر کراچی میرا دوست تھا۔ خدا بخشے، لیکن بڑا ضدی آدمی تھا۔ اس نے انھیں نکال دیا۔ رُل گئے، صحیح معنوں میں رُل گئے۔ عطیہ اور اس کا خاوند۔

س: آپ نے بھی کچھ نہیں کیا؟

ج: پریزیڈنٹ ایوب سے میں نے کہا کہ انھوں نے بڑی خدمت کی ہے۔ بڑے بڑے علما کی یہ واقف تھی۔ علامہ کی واقف تھی۔ اوروں کی بھی واقف تھی۔ یہ رُل گئی ہے۔ اس کا وظیفہ مقرر کریں۔ نہیں کیا انھوں نے کچھ۔ مجھے ان کا بڑا دکھ ہوا۔"

ماہر القادری عطیہ بیگم کے مزاج اور رویوں کے بارے میں اپنی کتاب یادِ رفتگاں میں یوں رقم طراز ہیں:

"کوئی کتنا بڑا آدمی کیوں نہ ہو، عطیہ بیگم اس پر طنز کرنے اور ٹوکنے، بعض اوقات ڈانٹنے ڈپٹنے سے بھی نہ چوکتیں، اس لیے ان کے جاننے والے محفلوں اور پارٹیوں میں عطیہ فیضی کے قریب آنے سے کتراتے تھے۔"

فیضی رحمین اور عطیہ فیضی دو انتہائی معصوم میاں بیوی تھے جنھیں تقسیم کے بعد ایک قطعہ اراضی الاٹ کیا گیا لیکن انھوں نے اس بات کی زحمت ہی نہیں کی کہ اس زمین کے ٹکڑے کو اپنے نام کروا لیتے۔ معروف محقق اور ادیب حمزہ فاروقی کے مطابق عطیہ فیضی نے اپنا جو گھر بنایا تھا اس کے ساتھ ایک آرٹ گیلری بھی تھی۔ ایک دن کمشنر کراچی نیاز محمد عرف این ایم خان وہاں پہنچا اور اس نے مختلف نوادرات کو بے دردی کے ساتھ الٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کیا جس پر عطیہ فیضی کو غصہ آ گیا اور انھوں نے اسے بہت سخت سست کہا۔

این ایم خان اس وقت تو خاموشی سے وہاں سے چلا گیا لیکن یہ بات اس کے دل میں رہی اور کچھ ہی عرصے بعد اس نے انھیں وہاں سے نکالنے کے لیے کارروائی کا آغاز کر دیا۔ آخر کار وہ اپنے اس مشن میں کامیاب ہو گیا۔ وہ گھر اور آرٹ گیلری جو تقسیم کے بعد 30 لاکھ کی خطیر رقم سے تعمیر کیا گیا تھا، انھیں خالی کرنا پڑا۔ دونوں میاں بیوی فٹ پاتھ پر آ گئے۔ ان سے ایک چھوٹی سی غلطی ہو گئی تھی کہ یہ زمین ان کے نام نہ تھی۔ زمین اپنے نام کرنے کے لیے تقسیم کے بعد لوگوں نے کیا گل کھلائے، قدرت اللہ شہاب اپنی سوانح عمری شہاب نامہ میں اس کا ذکر یوں کرتے ہیں:

"امرتسر سے لے کر دہلی، لکھنؤ اور پٹنہ کے جتنے صنعتی ادارے و سینما گھر تھے، وہ زیادہ تر مسلمانوں کی ملکیت تھے۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ مطالبے ضرور جائز حقوق پر مبنی ہوں گے لیکن، بہت سے کلیم صریحاً جھوٹ فریب اور جعل سازی کی پیداوار تھے۔ ایک صاحب نے اپنی درخواست میں لکھا تھا کہ وہ جو جائیداد بھارت چھوڑ آئے ہیں ان میں دہلی کا لال قلعہ بھی شامل ہے لہٰذا انھیں اس کی قیمت اور تاریخی عظمت کے مطابق معاوضہ دیا جائے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ان کا شجرۂ نسب آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے ساتھ براہ راست ملتا ہے۔"

1925 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی سلور جوبلی کی تقریب بڑے اہتمام سے منعقد کی گئی۔ اس اجلاس میں ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے آئی ہوئی خواتین نے بھی شرکت کی۔ مولوی محمد امین زبیری نے اپنی کتاب مسلم خواتین کی تعلیم (مطبوعہ 1961) میں عطیہ بیگم کی بے باکی کے حوالے سے ایک واقعے کا ذکر کیا ہے:

"جب کل ہند کانفرنس کا اجلاس اسی پنڈال میں شروع ہوا تو اعلان کر دیا گیا کہ خواتین کو شرکت کی اجازت نہیں۔ مگر بمبئی کی عطیہ بیگم صاحبہ اور دوسری خواتین اعلان کے باوجود شرکتِ جلسہ کے لیے تشریف لے آئیں۔ پنڈال میں پہنچ کر انھوں نے کیا دیکھا کہ پردے اٹھا دیے گئے ہیں اور کرسیاں بھی الٹ دی گئی ہیں تاکہ کوئی خاتون آ کر بیٹھ نہ سکے۔ کانفرنس کے بعض ارکان نے یہ دیکھ کر فوراً پردے کا انتظام کر دیا اور سارے جلسے میں اس پر اظہار ناراضگی ہونے لگا۔ اتنے میں عطیہ بیگم نے زنانہ گیلری میں کھڑے ہو کر تقریر شروع کر دی۔ کانفرنس کے صدر نواب سر عبدالقیوم خان تھے انھوں نے بیگم صاحبہ کو اسٹیج پر آ کر تقریر کرنے کی اجازت دے دی۔"

پروفیسر محمد اسلم اپنی کتاب خفتگانِ کراچی کے صفحہ نمبر 94 پر لکھتے ہیں:

"قبرستان میوہ شاہ کراچی میں ایک احاطہ سلیمانی بوہروں کے لیے مخصوص ہے۔ اس احاطے میں ڈاکٹر وحید قریشی کی تصنیفِ دلپذیر 'شبلی کی حیاتِ معاشقہ' کی ہیروئن عطیہ فیضی محوِ خواب ابدی ہیں۔ موصوفہ نے Music of India کے عنوان سے ایک بلند پایہ کتاب تحریر کی تھی جو 1925 میں لندن سے شائع ہوئی تھی۔ انھوں نے 'اقبال' کے عنوان سے ایک کتاب بزبان انگریزی لکھی تھی جس کا ضیاء الدین احمد برنی نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ علامہ اقبال کے ساتھ بھی ان کی خط و کتابت رہتی تھی۔ شبلی کی جنجیرہ والی غزل کی محرک بھی یہی خاتون تھیں۔ عطیہ کی قبر کے برابر ان کے شوہر نامدار اور شہرہ آفاق مصور فیضی رحمین محوِ خواب ابدی ہیں۔" (حقیقت میں عطیہ کی قبر کے برابر میں فیضی رحمین کی نہیں بلکہ عطیہ کی بہن نازلی کی قبر ہے)۔

سلیمانی بوہروں کا قبرستان ڈھونڈنا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ ہم کوئی چار گھنٹے تک میوہ شاہ قبرستان کی خاک چھانتے رہے اور آخرکار یہ قبرستان ہمیں مل ہی گیا۔ اس قبرستان میں مدفون خواتین و حضرات کی قبریں بمشکل 100 یا 150 کے درمیان ہوں گی۔

ہمیں عطیہ فیضی کی قبر مل گئی لیکن فیضی رحمین کی قبر کہاں تھی، اس حوالے سے ہم نے قبرستان کے نگران سعید بلوچ سے معلوم کیا تو انھوں نے کہا کہ آپ کے ساتھ جو آپ کا دوست آیا ہے اسے یہ نہیں معلوم کہ سلیمانی بوہروں میں مردوں اور عورتوں کی قبریں الگ الگ ہوتی ہیں۔ اس قبرستان کی تلاش

کے لیے ہم اپنے دوست قاضی خضر حبیب کو اپنے ہمراہ لے گئے تھے۔ ہم نے سعید بلوچ کو یہ بتایا تھا کہ وہ اپنے کسی رشتے دار کی قبر دیکھنے آئے ہیں۔

سعید بلوچ خاصے دلچسپ انسان ہیں۔ انھوں نے افسردگی سے ہمیں بتایا کہ وہ قبرستان کے چوکیدار ہیں۔ ان کی تنخواہ صرف تین ہزار ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ''سلیمانی بوہروں کی عمر بڑی لمبی ہوتی ہے۔ ان کی عمریں 90 سے 95 برس تک ہوتی ہیں۔ آخری قبر چار سال قبل میرے مرحوم والد صاحب نے بنائی تھی۔ ہمارے رشتے دار داؤدی بوہروں کے قبرستان کے نگران ہیں۔ ان کی تنخواہ بھی اچھی ہے۔ مہینے میں انھیں دو سے تین قبریں بنانی پڑتی ہیں۔ آج کل قبروں کا ریٹ آپ کو معلوم ہی ہے۔ انھیں گزربسر کی فکر نہیں ہوتی، اور ایک ہم ہیں کہ صرف انتظار کرتے رہتے ہیں۔''

پروفیسر محمد اسلم اپنی کتاب خفتگانِ کراچی میں مزید لکھتے ہیں کہ:

''فیضی رحمین پیدائشی طور پر یہودی تھے اور عطیہ سے شادی کرنے سے قبل انھوں نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ ان کے نکاح کے موقعے پر مولانا شبلی نعمانی نے اپنے رازدان مہدی حسن کے نام ایک خط میں اپنے دل کا غبار یوں نکالا: 'قران میں یہودی ذلیل وخوار بنادیے گئے ہیں، لیکن کیا 5 دسمبر 1912 کے (بعد) بھی جس دن (عطیہ) ایک یہودی کو ہاتھ آئی؟ مشہور کیا گیا ہے کہ وہ مسلمان ہوگیا ہے۔'''

ایک سال بعد شبلی غمزدہ بمبئی گئے تو عطیہ اور فیضی سے بھی ملے۔ انھوں نے اس موقعے پر یہ دو شعر ان کی نذر کیے:

عطیہ کی جو شادی پر کسی نے نکتہ چینی کی
کہا میں نے کہ جاہل ہے کہ احمق ہے کہ نادان ہے
بتانِ ہند کافر کرلیا کرتے ہیں مسلم کو
عطیہ کی بدولت آج اک کافر مسلمان ہے۔

رئیس فاطمہ 16 جنوری 2014 کو روزنامہ ایکسپریس میں شائع ہونے والے اپنے کالم بعنوان ''فیضی رحمین کی یاد میں'' میں لکھتی ہیں کہ: ''افسوس کہ جس نگار ہوٹل میں انھوں نے دربدر ہونے کے بعد پناہ لی اس کو قومی ورثہ بنانے کے بجائے گودام بنادیا گیا۔ اگر یہ ہوٹل لندن یا پیرس یا نیویارک

میں ہوتا تو یادگار بن جاتا۔ ہوٹل کی پیشانی پر درج ہوتا: ’یہاں فیضی رحمین اور عطیہ رحمین نے اپنی زندگی کے آخری ایام گزارے‘۔ لیکن یہاں یہ ممکن نہیں۔‘‘

نگار ہوٹل کا ذکر تو رئیس فاطمہ نے کیا لیکن اس ہوٹل کے محلِ وقوع کے بارے میں کوئی ذکر نہیں کیا۔ ہم نے ہوٹل کی تلاش شروع کی۔ سینئر صحافی نعمت اللہ بخاری نے بتایا کہ یہ ہوٹل پاکستان چوک کے پاس کہیں تھا۔ ہم پاکستان چوک پہنچے۔ وہاں ایک نوجوان نے بتایا کہ کچھ آگے جائیں، وہاں حقانی چوک ہے، اس کے دائیں جانب نگار ہوٹل ہے۔ حقانی چوک پر ایک صاحب نے بتایا کہ ہوٹل تو کب کا مسمار ہو گیا۔ یہ علاقہ نگار کمپاؤنڈ کہلاتا ہے۔ یہ سامنے بالکل نگار ہوٹل ہے۔ ہوٹل کی باقیات کے باہر ایک مستعد سکیورٹی گارڈ ریپٹر بندوق تھامے کھڑا تھا۔ خیر ہم عمارت میں داخل ہو گئے۔ اندر ہوٹل تو نہیں فقط ایک گودام نظر آ رہا تھا جس میں شیشوں کے ٹکڑے ہی ٹکڑے تھے۔ لیکن گودام کے بالکل سامنے والی دیوار پر قدیم پتھروں سے بنے دروازے اور کھڑکیوں کے آثار تھے۔ ہم نے جلدی جلدی ان کی تصویریں بنائیں اور وہاں سے چل دیے۔

ہمیں اکثر کہا جاتا ہے کہ ہم جب بلاگ کا اختتام کرتے ہیں تو وہ اچانک سا لگتا ہے۔ ہم نے بڑی کوشش کی کہ ان کی ہدایات کی روشنی میں اس بلاگ کا اختتام کر سکیں لیکن ماہر القادری نے اپنی کتاب میں عطیہ اور فیضی رحمین کی پاکستان آمد اور ان کے انجام کے بارے میں جو لکھا ہے میرا خیال ہے وہ کافی ہے۔ ماہر القادری عطیہ فیضی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

’’انھیں فنونِ لطیفہ سے خاصا شغف تھا۔ شاعری، مصوری، رقص و موسیقی یہ سب ان کے شوق اور دلچسپی کی چیزیں تھیں۔ پاکستان آنے کے بجائے اگر وہ بھارت میں ہی رہتیں اور کوئی ’کلا مندر‘ انھیں سونپ دیا جاتا تو وہاں ان کے ذوق اور طبیعت کے جوہر کھلتے۔‘‘

ایڈلجی ڈنشا اور نادر شاہ ڈنشا کے مجسموں کی تلاش

یہ ایک پارسی باپ بیٹے کی کہانی ہے، جنھوں نے کراچی کے شہریوں کے لیے بے مثال خدمات انجام دیں۔ اس خاندان نے کراچی کی سماجی اور معاشی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ ایڈلجی ڈنشا اور ان کے بیٹے نادر شاہ ایڈلجی ڈنشا نے بھی اپنے والد کی روایات کو برقرار رکھا۔ دونوں باپ بیٹوں نے بغیر کسی معاشی وسیاسی مفاد کے، شہر میں تعلیمی ادارے قائم کیے، ہسپتال بنائے اور رہائشی کالونیاں بنائیں۔

الیف کے دادا چانجی کے مطابق ان کی خدمات کے جواب میں کراچی کے باسیوں نے انھیں جو کچھ دیا وہ تھے ان کے دو یادگاری مجسمے جو کراچی کے مختلف مقامات پر نصب کیے گئے تھے۔ لیکن دادا نے اپنی کتاب میں یہ نہیں بتایا کہ یہ مجسمے کہاں نصب تھے۔

تقسیم سے قبل کراچی کی خدمت کرنے والوں یا ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والے قدآور سیاسی شخصیات کے جو مجسمے نصب کیے گئے، وہ اب ان مقامات پر موجود نہیں ہیں۔ ان میں گاندھی جی اور جواہر لال نہرو کے مجسمے بھی شامل ہیں۔ ایڈلجی ڈنشا اور نادر شاہ کے مجسمے کہاں تھے، اور اب کہاں ہیں، اس کا ذکر آگے چل کر کریں گے۔

130 برس قبل ایڈلجی ڈنشا کراچی کے وہ پہلے فرد تھے جنھوں نے عوام کے لیے 12 ہسپتال تعمیر کروائے۔ 1885 میں Countess of Dufferine Vicereine of India نے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں خواتین کو علاج کی سہولت فراہم کرنے کے لیے مہم کا آغاز کیا۔ اس مہم کے لیے برطانوی راج کی جانب سے سندھ کے تمام باسیوں سے چندے کی درخواست کی گئی۔ اس درخواست کے جواب میں صوبہ بھر سے 10 ہزار روپے کی رقم حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ 5 ہزار روپے لیڈی ڈفرن فنڈ کی سینٹرل کمیٹی کی جانب سے موصول ہوے۔ لیکن یہ رقم کسی بھی ہسپتال کی تعمیر کے لیے کافی نہ تھی لہٰذا 6 برس تک ہسپتال کی تعمیر کا کام مکمل نہ ہوسکا۔ ایڈلجی ڈنشا نے ہسپتال کی تعمیر کو یقینی بنانے کے لیے 1894 میں 50 ہزار روپے کا چندہ دیا۔ Her Excellency The Countess of Elgin وائسرائے کے ہمراہ خصوصی طور پر کراچی تشریف لائیں اور عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔ ہسپتال کی

تعمیر کے دوران کچھ اضافوں اور تبدیلیوں کی وجہ سے مزید رقم کی ضرورت پڑی جو ہسپتال کی تعمیر کے لیے جمع ہونے والی رقم کا نصف تھا۔ یہ رقم بھی ایڈلجی ڈنشا نے خوش دلی سے فراہم کی۔ نہ صرف یہ بلکہ ہسپتال کے لیے دواؤں کی پہلی کھیپ بھی ان کی جانب سے دی گئی تھی۔ ان کے فرزند نادر شاہ نے ہسپتال کے 5 وارڈوں اور 5 کمروں کے لیے فرنیچر دیا۔ ہسپتال کے لیے عوام کی جانب سے دیے گئے 10 ہزار چندے کے مقابلے میں ڈنشا خاندان نے 85,000 روپے کا چندہ دیا۔

الیف کے داداچانجی اپنی کتاب ''تقاریر وتحاریر بابت زرتشتی مذہب، ثقافت اور تہذیب'' میں لکھتے ہیں کہ 10 ہزار کے مقابلے میں 85,000 کی رقم فراہم کرنا'' کیا جگر تھا! ''اسے کہتے ہیں'' زرتشتی جگرا''۔ اس کے علاوہ کراچی میں چلنے والے دو مشنری ہسپتال بھی ان کے چندے سے استفادہ کرتے تھے۔

تعلیم کے میدان میں بھی انھوں نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ وہ نادار اور غریب طلبا کی مالی مدد کے لیے بمبئی یونیورسٹی کو لاکھوں روپے کے عطیات دیتے تھے۔ کراچی میں ماما پارسی اسکول اور پونا میں سردار دستور گرلز اسکول اس کی مثال ہیں۔ لیکن تعلیم کے میدان میں اس خاندان کا سب سے بڑا کارنامہ نادر شاہ ایڈلجی ڈنشا انجینئرنگ یونیورسٹی ہے جسے آج کل NED یونیورسٹی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ اس یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے والے اکثر طلبا کو یہ نہیں معلوم کہ این ای ڈی کس کا مخفف ہے۔

اس یونیورسٹی کا شمار پاکستان کی سب سے قدیم انجینئرنگ یونیورسٹی کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ جیسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، الیف کے داداچانجی کے مطابق کراچی کے شہریوں نے جناب ایڈلجی ڈنشا اور ان کے فرزند نادر شاہ کی عظیم خدمات کے اعتراف میں ان کے دو مجسمے کراچی میں نصب کیے تھے۔ ہم نے بہت کوشش کی لیکن یہ مجسمے کہیں بھی نظر نہیں آئے۔ آخر یہ مجسمے گئے تو کہاں گئے؟ ہمیں ان مجسموں کی تلاش تھی لیکن تلاش اب تک بے نتیجہ ہی رہی تھی۔

ہمارے دوست اختر سومرو نے ایک دن ہمیں بتایا کہ وہ پارسی انسٹیٹیوٹ میں ایک لیکچر اٹینڈ کرنے جا رہے ہیں۔ ہماری بھی خواہش تھی کہ اس بہانے پارسی انسٹیٹیوٹ کا دورہ کیا جائے، شاید وہیں

پر ہمیں ایڈلجی ڈنشا اور نادر شاہ کے مجسموں کا کوئی سراغ مل جائے۔ ہم نے ان سے اس خواہش کا اظہار کیا لیکن انھوں نے معذرت کر لی اور کہا کہ جن لوگوں کو دعوت دی گئی ہے صرف وہی جا سکتے ہیں۔ اگلے دن انھوں نے ہمیں لیکچر کا حال احوال سنایا۔ ہم نے پوچھا کہ لیکچر کے علاوہ اور کیا تھا، تو کہنے لگے انسٹیٹیوٹ کے سبزہ زار میں ایک مجسمہ نصب تھا۔ بات ختم ہو گئی۔

ہم گھر سے پریس کلب آنے کے لیے مزار قائد سے صدر کو جانے والی سڑک کوریڈور تھری استعمال کرتے ہیں۔ پارکنگ پلازہ سے قبل ٹریفک بری طرح جام تھا۔ ہم نے لائنز ایریا سے صدر جانے والا راستہ استعمال کیا۔ سڑک کے اختتام پر ہمیں پارسی انسٹیٹیوٹ کی تختی نظر آئی۔ ہم خاموشی سے اندر داخل ہو گئے۔ انسٹیٹیوٹ کی عمارت مختصر تھی لیکن عمارت کے اطراف میں ایک بڑا گراؤنڈ اور سبزہ زار تھا۔ سبزہ زار کے دائیں طرف ایک مجسمہ نصب تھا۔ قریب جا کر دیکھا تو وہ ایڈلجی ڈنشا کا مجسمہ تھا۔ ابھی ہم مجسمے کو دیکھ ہی رہے تھے کہ دو افراد جو شکل سے گارڈ لگ رہے تھے، ہمارے قریب آئے اور پوچھنے لگے کہ ہم کس کی اجازت سے اندر آئے ہیں اور کیوں آئے ہیں۔

ہم نے جواباً بتایا کہ یہاں سے گزر رہے تھے ٹریفک بہت جام تھا تو سوچا کہ تھوڑی دیر سبزہ زار میں بیٹھ جائیں۔ دونوں نے بہت 'ادب' سے بتایا کہ یہ پبلک پارک نہیں ہے۔ ہم نے معذرت کی اور انسٹیٹیوٹ سے باہر نکل آئے۔ کلب پہنچے تو اختر سومرو سے ملاقات ہوئی۔ ہم نے انھیں بتایا کہ وہ مجسمہ ایڈلجی ڈنشا کا ہے۔ کہنے لگے کوئی مسئلہ نہیں ہے، میرا دوست کلیم جس نے اس انسٹیٹیوٹ میں لیکچر رکھوایا تھا اس سے بات کر کے اجازت لے کر تصاویر بھی بنائیں گے۔

ایسے اجازت ناموں کا ہمیں بہ خوبی اندازہ تھا لہٰذا ہم مایوس ہو گئے۔ تقریباً ایک ہفتے بعد کوریڈور تھری پر پھر ٹریفک جام تھا۔ ہم نے پارسی انسٹیٹیوٹ کا راستہ اختیار کیا۔ انسٹیٹیوٹ کے گیٹ پر بڑی رونق نظر آئی۔ ہم ایک بار پھر اندر داخل ہو گئے۔ اندر میلے کا سماں تھا، مختلف کیمرے لگے ہوئے تھے۔ ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ ہم نے ایک صاحب سے معلوم کیا کہ کیا ہو رہا ہے تو وہ بولے کہ شوٹنگ ہو رہی ہے۔

ہم فوراً باہر نکلے، پریس کلب پہنچے، فوٹو جرنلسٹ اکبر بلوچ کو اپنے ہمراہ لیا، اور انسٹیٹیوٹ پہنچ گئے۔ میں نے ایڈلجی ڈنشا کے مجسمے کی تصاویر بنانا شروع کیں۔ اکبر بلوچ نے ہماری توجہ دوسری جانب

مرکوز کروائی، وہاں ایک اور مجسمہ تھا۔ وہ نادر شاہ ایڈلجی ڈنشا کا مجسمہ تھا۔ ہم نے اس کی بھی جلدی جلدی تصاویر بنائیں۔

اس دوران اکبر نے بتایا کہ مجسمے کے پاس بیٹھے دو نوجوان ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ یار ہمیں تو تصاویر بنانے نہیں دیں یہ لوگ کیسے بنا رہے ہیں۔ ہم نے کیمرا فوراً جیب میں ڈالا۔ اتنی دیر میں ایک صاحب ہمارے پاس آئے اور دریافت کیا کہ ہم کیوں آئے ہیں۔ ہم نے کہا کہ یہاں کے انچارج سے ملنے آئے ہیں۔ وہ ہمیں انچارج کے کمرے میں لے آئے۔ انچارج صاحب نے ہماری آمد کی وجہ دریافت کی۔

ہم: انسٹیٹیوٹ کی تصاویر بنانی ہیں۔

انچارج: (نفی میں سر ہلاتے ہوئے) اس کی اجازت نہیں ہے۔ آپ کو پہلے عہدیداروں سے بات کرنی ہوگی۔

ہم: کسی کا فون نمبر ہی دے دیں۔

انچارج نے اس سے بھی انکار کر دیا۔

ہم: وہ کب آتے ہیں؟

انچارج: مہینے میں ایک بار آتے ہیں۔

ہم: اب کب آئیں گے؟

انچارج: ایک میٹنگ تو کل ہوگئی، اگلی ایک ماہ بعد ہوگی، اور کس تاریخ کو ہوگی اس کا کوئی علم نہیں۔

ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا اور انسٹیٹیوٹ سے باہر نکل آئے۔ ہم یہ سوچ رہے تھے کہ آخر یہ مجسمے انسٹیٹیوٹ کیسے پہنچے اور وہ بھی صحیح سلامت حالت میں۔ صحیح سلامت ہونے پر ہمیں حیرت اس لیے تھی کیونکہ ہم نے ہرچند رائے وشنداس اور ملکہ برطانیہ کا مجسمہ موہٹہ پیلیس میں دیکھا تھا۔ ہرچند رائے کی گردن غائب تھی، اور ملکہ کے ہاتھ ٹوٹے ہوئے تھے۔ ہاں یاد آیا ملکہ کی ناک بھی کٹی ہوئی تھی۔

بہرحال، مجسمے انسٹیٹیوٹ کیسے پہنچے، یہ جاننے کے لیے کسی پارسی سے بات چیت ضروری تھی۔ لیکن بدقسمتی سے کراچی میں پارسی کم ہوتے جا رہے ہیں اور جو ہیں وہ بات چیت کے لیے راضی نہیں

ہوتے۔

ان مجسموں پر آویزاں تختیوں پر ان مقامات کا بھی ذکر ہے جہاں یہ نصب کیے گئے تھے۔ ایڈلجی ڈنشا کا مجسمہ جس سڑک پر نصب تھا، وہ سڑک تقسیم ہند سے قبل وکٹوریہ روڈ کے نام سے جانی جاتی تھی۔اب اس سڑک کا نام عبداللہ ہارون روڈ ہے۔ نادرشاہ ایڈلجی ڈنشا کا مجسمہ جہاں تھا، اس مقام پر ایک مینار ایستادہ ہے، جس پر ایک گھڑیال نصب ہے۔

اس مقام پر پیلس تھیٹر کا کوئی وجود نہیں اور بونس روڈ تو کب کا فاطمہ جناح روڈ ہو گیا ہے۔ بتوں کی نمائش کا ویسے بھی کسی اسلامی معاشرے میں کوئی تصور نہیں، لیکن کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ان دونوں چوراہوں کا نام ان دو عظیم ہستیوں سے منسوب کر دیا جائے اور ان کی خدمات تحریری طور پر وہاں نصب کر دی جائیں؟

لیکن کیا یہ ممکن ہے؟

رابرٹ اور حسرت: دو شاعر، دو کہانیاں

رابرٹ اور حسرت دونوں شاعر تھے۔ رابرٹ کا پورا نام رابرٹ گرانٹ تھا اور حسرت کا نام حسرت موہانی تھا۔ رابرٹ ایک برطانوی شہری تھے، اور حسرت ہندوستانی۔ دونوں کے آباواجداد کا تعلق ہندوستان سے نہیں تھا۔ لیکن وہ ہجرت کر کے ہندوستان میں ایسے بسے کہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔

رابرٹ برطانوی راج کے نمائندے تھے۔ وہ راج کے دوران بمبئی کے گورنر رہے۔ اس وقت صوبہ سندھ بھی بمبئی کا حصہ تھا۔ حسرت ہندوستانی عوام کے نمائندے تھے اور ہندوستان کی مکمل آزادی چاہتے تھے۔ رابرٹ گورنر ہاؤس میں شاہی ٹھاٹھ سے رہتے تھے، جبکہ حسرت کی زندگی کا بیشتر حصہ آزادی کی جدوجہد اور جیلوں میں گزرا۔ رابرٹ پیشے کے اعتبار سے قانون دان تھے جبکہ حسرت صحافی تھے۔

یہ دونوں صاحبان شاعر بھی تھے لیکن دونوں کی شاعری میں نمایاں فرق یہ تھا کہ رابرٹ مقدس مذہبی گیت لکھتے تھے جو گرجا گھروں میں گائے جاتے تھے۔ جب کہ حسرت جنھیں رئیس المتغزلین کہا جاتا ہے، ان کی شاعری میں عشقیہ مضامین خوبصورت پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں۔ ان کی ایک غزل اردو گائیکی میں کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے۔

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کو وہ زمانہ یاد ہے
کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونا دفعتاً
اور دوپٹے سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے

حسرت کی شاعری کا سلسلہ جیل میں شدید مشقت کے دوران بھی بند نہ ہوا بلکہ قید و بند کی مصیبتوں کو انھوں نے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے:

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

حسرت ایک سیاست کار، صحافی کے علاوہ ایک انسان دوست شاعر بھی تھے۔ ان کی شاعری میں آپ بیتی کو بھی اتنے خوب صورت انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے والا کوئی بھی فرد ان کیفیات کو اپنی روح میں جذب ہوتے ہوئے محسوس کرتا ہے جس کا سامنا حسرت نے کیا۔

ان کی شاعری میں سوز و گداز بھی ہے تو انقلابی رنگ بھی۔ وہ اپنی شاعری میں ایک اشتراکی مسلمان بھی ہیں۔

درویشی و انقلاب مسلک ہے مرا
صوفی مومن ہوں اشتراکی مسلم

حسرت موہانی اردوئے معلّی کے نام سے ایک پرچہ بھی شائع کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے پرچے میں سیاسی مضامین کے ذریعے سیاسی سوالات کا آغاز کر دیا تھا۔ حکومت اس تمام صورت حال کو برداشت نہیں کر سکتی تھی، اس لیے 23 جون 1908ء کو حسرت کو حراست میں لے لیا گیا۔ ان کی گرفتاری کا سبب اردوئے معلّی میں شائع ہونے والا وہ مضمون تھا، جس کا عنوان ''مصر میں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی'' تھا۔

حکومتِ ہند اس بات پر بضد تھی کہ مولانا مضمون نگار کا نام بتائیں۔ لیکن حسرت نے اس سے انکار کیا اور مضمون کی اشاعت کی پوری ذمہ داری اپنے سر لی۔ اس الزام کے تحت ان پر مقدمہ چلایا گیا اور انھیں دو برس کی قید با مشقت اور 500 روپے جرمانے کی سزا دی۔ واضح رہے کہ مجسٹریٹ اپنے دائرۂ اختیار کے مطابق اس سے زیادہ سزا نہیں دے سکتا تھا۔

ہندوستان میں یہ ایک ایسا دور تھا جب اشرافیہ یہ سمجھتی تھی کہ جیل جانا انتہائی معیوب بات ہے۔ اس واقعے کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس وقت تک خواہ سیاسی بنیاد پر ہی کیوں نہ ہو، جیل جانا باعثِ افتخار نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے علی گڑھ کے لوگ حسرت سے سخت ناراض ہو گئے اور وہاں کے بعض ذمہ دار اصحاب نے، جن میں کالج سیکرٹری نواب وقار الملک بھی شامل تھے، مقدمے میں حسرت کے خلاف گواہیاں دیں۔

ایک دن ہم اپنے دوست ایوب قریشی کے دفتر گئے۔ ہمارے ہاتھ میں حسرت موہانی کی کلیات

تھی۔ قریشی صاحب نے کتاب دیکھتے ہی فرمایا، کیوں نہ حسرت کی قبر پر حاضری دی جائے۔ میں نے کہا اس کے لیے خاصی رقم چاہیے اور اس کے علاوہ ویزا بھی حاصل کرنا ہوگا۔ ایوب قریشی بولے، بھئی طارق روڈ کے قبرستان جانے کے لیے ویزا کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے انھیں کہا کہ حسرت کی قبر طارق روڈ پر نہیں بلکہ ہندوستان میں ہے لیکن وہ مان کے نہ دیے۔

تھوڑی دیر بعد ایک اور صاحب آئے اور بحث میں شامل ہو گئے۔ انھوں نے دعویٰ کیا کہ حسرت کی قبر طارق روڈ پر نہیں ہے۔ میں نے قریشی صاحب کو کہا، دیکھیے یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ ابھی میں نے جملہ مکمل ہی کیا تھا کہ وہ صاحب بولے، حسرت کی قبر پاپوش نگر والے قبرستان میں ہے۔ یہ ایک اور انکشاف تھا۔ ہم نے کہا کہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ قبر کے کتبے پر حسرت کا نام لکھا ہوا تھا۔ ہم نے ان سے پوچھا پورا نام لکھا ہوا تھا؟ وہ کہنے لگے، ہاں ہاں، کتبے پر لکھا ہوا تھا: ''حسرت ان غنچوں پہ جو بن کھلے مرجھا گئے''۔ ہم اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئے اور پھر قریشی صاحب سے اجازت چاہی۔

ایک بار آرٹس کاؤنسل جانا ہوا۔ آرٹس کاؤنسل میں حسرت کی یاد میں ایک تقریب ہو رہی تھی۔ مجھے اس شخص کا نام تو یاد نہیں لیکن وہ کسی ٹی وی چینل کے رپورٹر تھے اور مائیک بھی ان کے ہاتھ میں تھا۔ خاصی جلدی میں نظر آ رہے تھے۔ انھوں نے اپنا تعارف کرایا اور پریس کلب کا حوالہ دیا جہاں ان سے کبھی ہماری ملاقات ہوئی ہوگی۔ مجھ سے کہنے لگے یہ اسٹیج پر جو صاحبان بیٹھے ہوئے ہیں ان میں سے حسرت موہانی کون ہیں؟ میں حیران و پریشان ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگا تو انھوں نے کہا کہ ذرا جلدی بتا دیجیے۔ میں نے انھیں کہا کہ اسٹیج کے کونے پر جو صاحب بیٹھے ہوئے ہیں اور لوگوں کو تقریر کی دعوت دے رہے ہیں انھیں پتا ہوگا، ان سے معلوم کر لیں۔ اس کے بعد میں فوراً آرٹس کاؤنسل سے نکل گیا۔ پھر نجانے کیا ہوا ہوگا، اس کا مجھے علم نہیں۔

بہر حال رابرٹ گرانٹ کے نام سے کراچی کی سابقہ میکلوڈ روڈ اور حالیہ آئی آئی چندریگر روڈ سے متصل ایک سڑک منسوب تھی، جو اب حسرت موہانی سڑک کہلاتی ہے۔ ہمیں پاکستانی حکومت کے اس قدم کی داد دینی چاہیے کہ انھوں نے کسی کمیونسٹ کے نام سے کوئی سڑک منسوب کی۔ جہاں تک رابرٹ گرانٹ کا تعلق ہے، اس کے نام سے بمبئی میں اب بھی سڑک موجود ہے اور ایک میڈیکل کالج بھی۔ حسرت موہانی روڈ پر مختلف دفاتر پر لگے ہوئے بورڈوں پر حسرت موہانی روڈ کے علاوہ الطاف حسین روڈ اور آئی آئی چندریگر روڈ بھی لکھا ہوا ہے، جو ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔

دیارام گدومل: سندھ کا ناقابل فراموش کردار

دیوان دیارام گدومل کا شمار سندھ کی ان ہستیوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی زندگی کو خدمت اور اصولوں کا عملی نمونہ ثابت کیا۔ برطانوی راج کے دور میں گدومل کا شمار سندھی ہندوؤں کے گاڈ فادر کے طور پر ہوتا تھا۔ دیارام نے اپنی ابتدائی تعلیم فارسی میں حاصل کی۔ اس وقت تک سندھ میں سندھی زبان میں تعلیم کا کوئی رواج نہ تھا۔ ان کا جنم 1857 میں ہوا۔ 1867 میں انھوں نے انگریزی اسکول میں داخلہ لیا۔ جس وقت دیارام کراچی میں رہائش پذیر تھے، ان کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ سندھیوں کو اعلیٰ تعلیم دینے کے لیے کالج بنایا جائے۔ اس کے لیے انھوں نے اپنے بھائی میٹھارام کو جو ایک معروف وکیل تھے اور دوسرے ایک اور وکیل دیوان دیارام جیٹھ مل کو تیار کیا۔ جس کے بعد کراچی کے ایک مشہور کالج کی سنگ بنیاد ڈالی گئی۔ اسی طرح انھوں نے اپنی کوششوں سے حیدرآباد میں بھی نیشنل کالج کی بنیاد رکھی۔ فارسی کے علاوہ انھیں گورمکھی اور عربی پر بھی مکمل دسترس تھی۔ پیشے کے حوالے سے وہ سیشن جج تھے لیکن ان کے فیصلوں میں تعصب کی ہلکی سی بھی جھلک نہیں تھی۔ پیر علی محمد راشدی اپنی کتاب اُہے ڈینھ اُہے شینھ (وہ دن وہ لوگ) کے صفحہ نمبر 714 پر لکھتے ہیں کہ:

''1889 میں دیارام کا احمد آباد سے شکار پور تبادلہ ہوا تو شکار پور کا ایک ہندو سیٹھ میولداس شیطان کے بہکاوے میں آ کر ایک عورت سے زبردستی کر بیٹھا۔ حکومت انگریز کی تھی۔ مونچھوں سے پکڑ کر گرفتار کیا گیا۔ مقدمے کی سماعت دیارام کی عدالت میں ہوئی۔ شکار پور کے ہندوؤں کو یقین تھا کہ ہندو برادری کو بدنامی سے بچانے کے لیے ان کا ہندو بھائی ضرور رعایت سے کام لے گا لیکن دیارام نے ملزم کو سات سال قید کی سزا سنائی اور شکار پور کے ہندو بھائی چلاتے ہی رہ گئے۔''

سندھ میں درویش یا مجذوب دورِ قدیم سے دورِ جدید تک ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ ان میں نام نہاد مجذوب اور درویش بھی ہیں جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان پر الہامی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ ایسے درویشوں اور مجذوبوں کی ہدایت پر بے شمار لوگوں نے نہ صرف خود کو بلکہ اپنے اہل خانہ کو بھی جانی نقصان پہنچایا۔ ایسے ہی ایک خود ساختہ اور نام نہاد درویش کا مقدمہ جب دیوان صاحب کی عدالت میں پیش ہوا

تو انھوں نے اس بات کو قطعاً کوئی اہمیت نہ دی کہ ان کے فیصلے کے نتیجے میں ان کے ہندو ہونے کو جواز بنا کر ان کے خلاف کوئی محاذ کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ راشدی نے اس مقدمے کی روائیداد یوں بیان کی ہے:

"ایک مجذوب نے ایک شخص کو جان سے مار دیا تھا اور دلیل یہ دی کہ مجھ پر الہام نازل ہوا تھا کہ فلاں کو قتل کرو، اس لیے میں نے خدائی فرمان کی بجا آوری کی۔ اس واقعے کے نتیجے میں بہت زیادہ اشتعال پھیل گیا تھا۔ لیکن دیارام پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اپنے فیصلے میں انھوں نے لکھا کہ اگر درویش کو چھوٹ دی گئی تو وہ الہام کی آڑ میں لوگوں کو مارتا رہے گا۔ سندھ میں اتنے زیادہ درویش ہیں کہ کسی ایک آدمی کو زندہ نہ چھوڑیں گے۔ ملزم کو انھوں نے عمر قید کی سزا دی۔ پھر کسی درویش پر یہ الہام نازل نہ ہوا۔"

مسلمانوں اور ہندوؤں میں مندر مسجد اور اس کی ملکیتوں پر تنازعے کوئی نئی بات نہیں، اور جب ایسے مقدمات عدالتوں میں پیش ہوتے تھے تو طوالت کا شکار ہو جاتے تھے۔ ججوں کی جان عذاب میں پڑ جاتی تھی۔ اگر جج ہندو ہو تو مسلمانوں کے حق میں فیصلہ کیسے صادر کرے؟ لیکن دیارام ایسی مصلحتوں سے بالاتر تھے۔ احمد آباد میں ایک مسجد کے پلاٹوں پر ملکیت کے حوالے سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں 9 سال سے مقدمے بازی جاری تھی۔ فساد کے خوف سے کوئی بھی جج منصفانہ فیصلہ کرنے سے ڈرتا تھا۔ علی محمد راشدی کے مطابق جب معاملہ دیارام کی عدالت میں پیش ہوا تو انھوں نے فیصلہ بغیر کسی پروا کے فیصلہ مسجد کے حق میں صادر کیا۔

دیارام **1911** میں سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ بمبئی منتقل ہو گئے۔ انھوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد ہومیوپیتھک کا طریقہ علاج سیکھا اور غریب اور مسکین لوگوں کا علاج کرنے لگے۔ بمبئی میں انھوں نے امرا کے بچوں کو غریبوں کی خدمت کرنے کی ترغیب دینے کے لیے ایک آشرم قائم کیا۔ آشرم میں امیر ہندوؤں کی لڑکیاں اور لڑکے روزانہ گھنٹے دو گھنٹے کے لیے آتے جہاں انھیں لیکچرز کے ذریعے یہ درس دیا جاتا تھا کہ انھیں غریبوں کی خدمت کرنی چاہیے۔

یہ آشرم کئی برسوں تک جاری رہا۔ آشرم کے تمام لڑکے اور لڑکیاں دیارام کو پتاجی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ ایک دن اچانک دیارام گدومل نے آشرم بند کرنے کا اعلان کیا۔ اس کے بعد انھوں نے آشرم کی ایک نوجوان لڑکی سے شادی کر لی۔ آشرم بند کرنے اور نوجوان لڑکی سے شادی کرنے پر ان کے خلاف ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ اخبارات میں ان کے خلاف مضامین لکھے گئے، ان پر پتھر برسائے

گئے، لیکن انھوں نے اس کی ذرہ برابر پرواہ نہ کی۔ اس کے بارے میں دیوان سنگھ مفتون اپنی کتاب ناقابلِ فراموش کے صفحہ نمبر 280، 281، 289 پر یوں رقم طراز ہیں:

''دیوان صاحب بمبئی سے چند میل کے فاصلے پر باندرہ گئے۔ وہاں آپ نے ایک ایسی کوٹھی کرایہ پر لی جو سمندر کے کنارے سے چند قدم کے فاصلے پر تھی۔ کوٹھی کرائے پر لینے کے بعد بمبئی واپس آئے۔ آشرم کے طلبا اور طالبات کو بلایا اور ان سے کہا کہ آج کے بعد یہ آشرم بند کیا جاتا ہے۔ اس اعلان کے بعد لڑکے اور لڑکیاں اپنے گھروں کو چلے گئے۔ دیوان صاحب نے آشرم کو تالا لگایا اور لڑکی کو لے کر سکھوں کے گوردوارے گئے اور گرنتھی سے درخواست کی کہ آپ کی اس لڑکی سے شادی کرادی جائے۔ گرنتھی نے اس سترہ اٹھارہ سال کی نوجوان لڑکی اور ستر سال کے سفید ریش (دیوان صاحب کے سفید لمبی داڑھی تھی) بوڑھے کی شادی گروگرنتھ صاحب کے سامنے کرادی۔ دیوان صاحب اپنی نوجوان 'بیوی' کو لے کر باندرہ اس کوٹھی میں چلے گئے جو آئندہ زندگی گزارنے کے لیے کرائے پر لی تھی۔ 'میاں بیوی' نے اس کوٹھی میں رہائش اختیار کی۔

''دیوان دیارام آل انڈیا شہرت کے مالک تھے اور انڈین سوشل کانفرنس کے کئی برس سے صدر تھے۔ اخبارات میں مضامین شائع ہوئے جن کے عنوانات تھے: 'باپ کی بیٹی سے شادی'، 'نفس پرستی کی انتہا'، 'سوشل کانفرنس کے صدر کی گراوٹ'، 'دیوان دیارام گدومل کا ذلت آفریں فعل'، وغیرہ۔ دیوان دیارام گدومل کی مخالفت صرف اخبارات تک ہی محدود نہ رہی۔ اسی سال آپ کو اپنی خاندانی جائیداد کی رجسٹری کروانے کے لیے حیدرآباد جانا پڑا تو جب آپ بازار میں سے گزرے، لوگوں نے آپ پر اینٹیں پھینکیں اور یہ کہہ کر ماں بہن کی گالیاں دیں کہ اس حرکت نے حیدرآباد کو تمام دنیا میں رسوا و ذلیل کر دیا ہے۔

''مسٹر ویرومل بیگھ راج (ایڈیٹر سندھی، سکھر) نے جب اس شادی کی اطلاع سنی تو ان کو بہت صدمہ ہوا، کیونکہ دیوان صاحب ویرومل جی کے ساتھ بیس پچیس برس تک سندھ کے اندر سوشل اصلاح میں مصروف رہے تھے۔ آپ نے شادی کی خبر سنتے ہی دیوان دیارام کو باندرہ خط لکھا جس کے الفاظ یہ تھے: 'میں اخبارات میں پڑھ رہا ہوں اور لوگوں سے سن رہا ہوں کہ آپ نے اتنے بڑے سوشل لیڈر اور سوشل کانفرنس کے صدر ہوتے ہوئے اس بڑھاپے میں سترہ اٹھارہ برس کی لڑکی سے شادی کی۔

مجھے اس خبر پر یقین نہیں آتا کہ آپ اتنا بڑا پاپ کر سکتے ہیں۔ آپ مہربانی فرما کر بواپسی ڈاک اصل حالات سے مطلع فرمائیے۔ کیونکہ اگر واقعہ سچ ہے تو میرا بھی بطور ایک پبلک ورکر اور اخبار نویس کے فرض ہے کہ میں آپ کی اس شیطنت کے خلاف لکھوں۔'

''دیوان دیارام نے اس طویل خط کا جواب ایک پوسٹ کارڈ پر دیا جس کے الفاظ یہ تھے: 'میں نے اپنا فرض ادا کیا۔ آپ اپنا فرض ادا کیجیے۔' اس جواب کے بعد دیوان رام کے قدیمی دوست اور دیرینہ ساتھی مسٹر ویرومل بیگھ راج (جو سندھ میں ہندو مہا سبھا کے صدر بھی تھے) نے اپنے اخبار میں دیوان دیارام کے خلاف متعدد سخت مضامین لکھے۔

''دیوان دیارام کی 'بیوی' کے بطن سے اس حمل کا نتیجہ ایک بیٹی پیدا ہو چکی تھی۔ دیوان صاحب شادی کے بعد دنیا سے بالکل الگ رہے۔ وہ اپنی'' بیوی اور بچی کے ساتھ سمندر کے کنارے اس کوٹھی میں تنہائی کی زندگی بسر کرنے لگے اور اس طرح دس سال گزر گئے۔ دنیا کو کچھ علم نہیں کہ کیا ہوا۔ شادی کے دس سال بعد دیوان صاحب کی بیوی تپ دق میں مبتلا ہو گئیں۔ کئی ماہ تک اس موذی مرض میں مبتلا رہیں اور جب زندگی کی کوئی امید نہ رہی تو اس کے والدین اپنی بیٹی کی عیادت کے لیے بمبئی سے آئے۔ یہ لوگ کئی روز تک باندرہ میں رہے۔ ایک روز دیوان صاحب کی 'بیوی' نے اپنی ماں سے تنہائی میں کہا: 'اماں! میں اب چند روز کی مہمان ہوں۔ مگر ایک راز میں تم سے ظاہر کرنا چاہتی ہوں تا کہ اس راز کو لے کر اس دنیا سے رخصت نہ ہو جاؤں۔ وہ راز میں تمہیں بتاتی ہوں۔ اور وہ راز یہ ہے کہ دیوان صاحب نے میرے ساتھ شادی میری عزت کو بچانے کے لیے کی۔ مجھے ایک لڑکے کا ناجائز حمل تھا۔ اس لڑکے نے حمل کے بعد مجھ سے شادی کرنا تو کیا، بات تک کرنے سے انکار کر دیا۔ کوئی دوسرا بھی مجھے پناہ دینے کو تیار نہ تھا۔ میری عزت کو بچانے کے لیے دیوان صاحب نے اپنی آل انڈیا شہرت اور عزت کو میرے لیے قربان کر دیا اور مجھ سے کھلے طور پر شادی کر لی۔ ورنہ دراصل حقیقت یہ ہے کہ میرے اور ان کے آج تک تعلقات باپ بیٹی کے ہیں۔ دنیا مجھے ان کی بیوی سمجھتی ہے مگر میں ان کی ویسے ہی بیٹی ہوں جیسے شادی سے پہلے تھی۔'

''اس راز کے اظہار کے بعد دیوان صاحب کی 'بیوی' کا انتقال ہو گیا۔ ماں نے یہ راز اپنے شوہر کو بتایا۔ اس نے اپنے خاص دوستوں کو سنایا۔ وہاں سے یہ راز مسٹر ویرومل بیگھ راج کے پاس پہنچا

اور مسٹر ویرو مل بینگھ راج سے ایڈیٹر ریاست کو یہ حالات معلوم ہوئے جن کے بعد بمبئی کے کئی اصحاب نے بھی تصدیق کی۔"

یہ تھی دیوان صاحب کی کہانی جنھوں نے ایک معصوم لڑکی کی عزت بچانے کے لیے اپنی عزت کو نا صرف داؤ پر لگایا بلکہ عمر کے آخری حصے میں روحانی، ذہنی اور جسمانی اذیتیں بھی برداشت کیں۔ اپنا مذہب بھی تبدیل کیا، اور اپنی سماجی زندگی کو اپنے ہاتھوں سے ختم کیا۔ اگر وہ لڑکی اپنی ماں سے حقیقت بیان نہ کرتی تو لوگ کبھی دیوان صاحب کی عظمت سے واقف نہ ہوتے اور مرنے کے بعد بھی ان پر لعن طعن جاری رہتا۔

بندر روڈ سے کیماڑی

''بندر روڈ سے کیماڑی، میری چلی رے گھوڑا گاڑی... بابو ہو جانا فٹ پاتھ پر...'' کراچی کی بندر روڈ کے حوالے سے احمد رشدی کا یہ گیت بہت مقبول ہوا۔ آج بھی پرانے کراچی کے حوالے سے اگر کوئی یادیں تازہ کرنی ہو تو اس گیت سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔ تقسیم سے قبل یا اس کے فوراً بعد بندر روڈ کی شناخت میری ویدر ٹاور، ڈینسو ہال، حاجی مولا ڈینا مسلم دھرم شالا (مولوی مسافر خانہ)، کراچی مونسپلٹی، سوامی نارائن مندر، بینک آف انڈیا تھی۔ اب یہ ایک بہت دشوار تحقیقی معاملہ ہے کہ دھرم شالا تو ہندوؤں کا ہوتا ہے، اس سے مسلمانوں کا کیا تعلق؟ شاید یہ مشترکہ ہندوستان میں پہلا اور آخری مسلم دھرم شالا ہے۔ تقسیم کے بعد پاکستان آنے والے مہاجرین نے جب عارضی طور پر یہاں پڑاؤ ڈالا تو غالباً ان کے لیے مولوڈینا کا تعمیر کیا گیا مسلم دھرم شالا ایک نئی بات تھی، اس لیے انھوں نے اُسے ''مولوی مسافر خانہ'' بنا دیا۔ بندر روڈ کی خوبصورتی اس سڑک پر قائم تاریخی عمارتوں سڑک کے بیچ چلنے والی ٹرام سروس کے حوالے سے ہوتی تھی۔ یہاں پر خالق دینا ہال بھی ہے۔ محمد عثمان دموہی اپنی کتاب کراچی تاریخ کے آئینے میں کے صفحہ 576 پر لکھتے ہیں کہ اس خوبصورت عمارت میں 70 فٹ لمبے اور 40 فٹ چوڑے ہال کے علاوہ لائبریری کے لیے بھی دو کمرے تعمیر کیے گئے ہیں۔ 14 جولائی 1904 اس وقت کے کمشنر سندھ مسٹر ینگ ہسبینڈ نے اس عمارت کا افتتاح کیا۔ تعمیر کے بعد اس کا ہال کراچی کی مختلف سیاسی اور سماجی تقریبات کے لیے استعمال ہوتا رہا مگر ستمبر 1921 میں جب مولانا محمد علی جوہر اور ان کے رفقا پر بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا تو اس عمارت کو لازوال تاریخی اہمیت حاصل ہو گئی اور برصغیر کا بچہ بچہ اس سے واقف ہو گیا۔ خلافت تحریک کی مناسبت سے عمارت کے ہال کے باہر ایک کتبہ آویزاں ہے جس پر یہ تاریخی عبارت کندہ ہے: ''9 جولائی 1921 کو تحریکِ خلافت کے جلسے میں مولانا محمد علی جوہر نے ایک قرارداد منظور کرائی کہ افواجِ برطانیہ میں مسلمانوں کی بھرتی خلاف شرع ہے۔ اس جرم پر مولانا اور اُن کے رفقا پر حکومت برطانیہ نے بغاوت کا مقدمہ اسی عمارت میں چلایا تھا مگر مقدمہ کی پوری کارروائی کے دوران مولانا کا موقف یہ رہا؛ ہم کو خود شوق شہادت کا ہے گواہی کیسی فیصلہ کر بھی چکو مجرم اقراری کا''۔

اجمل کمال کی مرتبہ کتاب کراچی کی کہانی کے صفحہ 115 پر پیر علی محمد راشدی کی یادداشتوں کے حوالے سے لکھا ہے: ''ادھر بندر روڈ پر بھی چہل پہل ہوتی تھی مولے ڈینو کا مسافر خانہ غلام حسین خالق ڈینا ہال، ڈینسو ہال، میری ویدر ٹاور، اسمال کاز کورٹ، کسٹم ہاؤس، پورٹ ٹرسٹ بلڈنگ، اس سفر کے سنگ میل تھے۔ ڈینسو ہال کے پاس داہنے اور بائیں ہاتھ سڑکیں نکلتی تھیں۔ بائیں ہاتھ والی سڑک نپی چالی محلے سے (جہاں الوحید اخبار کا دفتر تھا) گزر کر میکلوڈ روڈ پر پہنچتی تھی۔ داہنے ہاتھ دو سڑکیں نکلتی تھیں، ایک میریٹ روڈ جس پر کاروباری کھولیاں اور دکانیں تھی، اور دوسری طرف نیپئر روڈ جس کے شروع میں میمن بیوپاریوں کے دفتر تھے (سر حاجی عبداللہ ہارون کا دفتر اور بعد میں صوبائی مسلم لیگ کا دفتر اسی سڑک پر تھا)، اور اس سے آگے چکلہ تھا۔ چکلے کے علاقے میں کسبیاں اور گانے والیاں تو رہتی ہی تھیں مگر جن لوگوں کا ان پیشوں سے تعلق نہ تھا اور بڑے درجے کے صاحب تھے، وہ بھی یہاں مکان بنا کر رہتے تھے۔ مثلاً سندھ کے کمشنر کا میر منشی بھی اسی محلے میں رہتا تھا۔ شریف، پاکباز اور روزے نماز کا پابند شخص تھا۔ شام کو مکان کی گیلری میں کرسی ڈال کر بیٹھ جاتا اور آنے جانے والوں کو دیکھا کرتا۔ پیشہ ور طوائفوں کو اپنے پاس بلوا کر یا ساتھ لے جا کر گانا سننے میں کوئی قباحت نہ سمجھی جاتی تھی۔ اشراف اور پیشہ وروں کے درمیان حد فاصل واضح تھی۔ اچھے اور برے فن کو اپنی اپنی حد کے اندر رکھا جاتا تھا۔ معاشرے میں منافقت کا دور ابھی نہیں آیا تھا۔''

کراچی میں تقسیم سے قبل جانوروں کے لیے قائم کیا جانے والا پہلا ہسپتال بھی اسی سڑک پر ہے۔ ریڈیو پاکستان کی تاریخی عمارت بھی بندر روڈ پر ہے۔ اس سڑک پر سر کٹے بھی رہتے ہیں۔ لیکن ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ کسی کو کچھ نہیں کہتے۔ ان کا بسیرا جامع کلاتھ مارکیٹ کے چوراہے پر واقع سکھن مینشن (1930) کی آخری منزل پر ہے۔ یہ سر کٹے وضع قطع سے ہندو لگتے ہیں۔ جی ہاں اگر آپ مولو ڈینا مسلم دھرم شالا (مولوی مسافر خانہ) کے فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر سکھن مینشن کی بالائی منزل پر نظر ڈالیں تو آپ کو یہ نمایاں طور پر نظر آئیں گے۔ جی جی یہ پتھر کے مجسمے ہیں۔ جن کے سر کسی ایماں کی حرارت والے نے قلم کیے ہوں گے۔ جامع کلاتھ مارکیٹ سے اگر ٹاور کی جانب چلیں تو اللہ والا مارکیٹ سے متصل بلیبر بلڈنگ نامی عمارت ہے۔ اس عمارت کی بالکونیوں کے نیچے بھی مجسمے موجود تھے اور ہیں۔ جو اب تیزی سے ختم ہوتے جا رہے ہیں۔

ہمارے محقق دوست عقیل عباس جعفری کے مطابق بندر روڈ کے حوالے سے احمد رشدی نے بندر روڈ سے کیماڑی میری چلی رے گھوڑا گاڑی 1954 میں گایا تھا۔ ایک اور مہربان ذاکر صاحب جو کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن میں ایک بڑے عرصے تک اپنی خدمات انجام دے چکے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ 1949 میں بندر روڈ کا نام تبدیل کر کے محمد علی جناح روڈ رکھا گیا تھا۔ فلمی دنیا کے حوالے سے معروف محقق زخمی کانپوری اپنی کتاب دود کوشی گائے کے صفحہ نمبر 142-143 پر لکھتے ہیں کہ احمد رشدی 24 اپریل کو 1938 کو حیدرآباد (دکن) میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک سادات خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی تمام تعلیم حیدرآباد دکن میں حاصل کی تھی۔ شروع ہی سے گلوکاری کا شوق تھا اس لیے ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہو گئے۔ جہاں ان کو مہدی ظہیر جیسا کہنہ مشق کمپوزر مل گیا۔ سب سے پہلے ان کی شہرت بچوں کے ایک پروگرام میں بندر روڈ سے کیماڑی میری چلی رے گھوڑا گاڑی گانے سے ہوئی جسے مہدی ظہیر نے تحریر کیا تھا۔ اس کی لاجواب دھن بھی انھوں نے ہی بنائی تھی۔ اس نظم کی بے حد پسندیدگی کی وجہ سے انھیں بے پناہ شہرت ملی۔ شکر ہے کہ مہدی ظہیر نے یہ نظم 50 کی دہائی میں لکھی اور اسی دوران میں احمد رشدی نے گائی۔ اگر یہ سب آج کے دور میں ہوتا تو اسے یقینا 'جناح صاحب کی شان میں گستاخی تصور کیا جاتا۔ احمد کے نام کے ساتھ رشدی ہی کافی تھا؛ ظہیر صاحب کے نام کا پہلا حصہ مہدی اُن کے مذہبی عقائد کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ وہ تو خیر ہو سلمان رشدی کی جس نے اپنی متنازعہ کتاب 80 کی دہائی کے آخر میں لکھی۔ اس وقت تک نام کے ساتھ حسن یا حسین لکھنے سے لوگ مارے نہیں جاتے تھے، ورنہ ان دونوں حضرات کا بچنا ممکن نا تھا۔ ہمارے صحافی دوست فاضل جمیلی صاحب نے ہمیں بتایا کہ بندر روڈ پر بوہڑ کے بڑے بڑے درخت ہوتے تھے۔ ہم پریشان ہو گئے کہ بوھڑ کے درخت کیا ہیں۔ وہ تو ان سے جاتے جاتے ہم نے کہا کہ بوہڑ سے ان کی مراد بڑ تو نہیں؟ تو انھوں نے اپنی الجھی زلفیں سلجھاتے ہوئے کہا، تم بڑ ہی سمجھو۔ ہمارے ایک اور دوست ابرار صاحب نے جواب چلنے کے لیے گھٹنوں کے بجائے چھڑی کو زیادہ تکلیف دیتے ہیں، ماضی کے جھروکوں میں جھانکتے ہوئے ہمیں بتایا کہ بندر روڈ ہر صبح کو دھلتی تھی اور شام کو سوکھے پتے بھی چنے جاتے تھے۔ معروف برطانوی مورخ الیگزینڈر ایف بیلی بندر روڈ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ بندر روڈ کی لمبائی پونے تین میل ہے۔ یہ سڑک ایک بڑے میدان پر جا کے ختم ہوتی ہے جسے جنرل پریڈ گراونڈ کہتے

ہیں۔ بندر روڈ کے مغربی حصے میں لب سڑک بہت بڑے کھلے میدان میں مسلمانوں کا پرانا قبرستان ہے (میمن مسجد کے تہہ خانے میں قبرستان، اس کا ذکر پھر کبھی کریں گے)۔ بہر حال بندر روڈ کا چپہ چپہ اور ہر عمارت ایک داستان ہے۔

جس بندر روڈ کو میری ویدر ٹاور، ڈینسو ہال کے حوالے سے پہچانا جاتا تھا، اب نہاری، مٹھائی یا کبابوں کی دکانوں سے جانا جاتا ہے۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے، ہم خود ایک عرصے تک صابری نہاری (صابر نہاری) کو غلام فرید صابری براداران کی فرینچائز اور بندو کباب والے کو استاد بندو خان سارنگی والے کا سائڈ بزنس سمجھتے تھے۔ بندر روڈ اب ایم اے جناح روڈ ہو کر بانی پاکستان کے نام سے منسوب ہو چکا ہے۔ اب دھلنا تو در کنار، یہ سڑک بارش کے پانی کو بھی ہضم نہیں کر سکتی۔ ریڈیو پاکستان ''جہاں تھی خبروں کی دکان''، اب صرف افسران کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ یہاں نہ اب زیڈ اے بخاری ہیں نہ ہی بندو خان اور نہ ہی مولانا احتشام الحق تھانوی۔ اب اس سڑک پر ٹریفک کو اپنی دسترس میں رکھنا ٹریفک پولیس کے بس سے باہر ہے۔ 1930 کے عشرے میں تعمیر کی گئی عمارتوں کی جگہ لینے کے لیے پلازہ بن رہے ہیں۔ دو چار جو عمارتیں بچ گئی ہیں ان پر بھی بلڈر مافیا کی نظریں ہیں۔ ہندوؤں کی تعمیر کی گئی یہ بوسیدہ عمارتیں کسی وقت بھی ترقی کے نئے دور میں داخل ہو سکتی ہیں۔ لیکن کیا کہنے اس روڈ پر گاڑیاں چلانے والوں کے کہ وہ 50 سال بعد بھی اسے بندر روڈ ہی کہتے ہیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ بندر روڈ کو جناح صاحب سے منسوب کر کے ہم نے اس کا وہی حشر کیا جو ان کے انتقال کے بعد پاکستان کے ساتھ کیا ہے۔

بھان سنگھ کیوں رویا

بھان سنگھ کون ہے؟ کہاں کا رہنے والا ہے؟ وہ کب رویا؟ اور کیوں رویا؟ یہ چار سوالات ہیں جن کے ہمیں جواب دینا ہیں۔ پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ بھان سنگھ ایک سکھ ہیں۔ دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ وہ میر پور خاص کے رہائشی تھے۔ میر پور خاص میں ان کی حویلی اور بیٹھک بھی تھی۔ ان کی بیٹھک ایک بنگلے کی شکل میں تھی۔ بیٹھک کی عقبی حصے میں ایک اصطبل بھی تھا۔ ان کی رہائش گاہ اور بیٹھک کے اطراف میں ساری زمین ان کی ملکیت تھی، اس لیے اس علاقے کو بھان سنگھ آباد کہا جاتا تھا۔ سب سے اہم سوال یہ ہے کہ بھان سنگھ کیوں رویا۔ اس سوال کا جواب ایک جملے میں ممکن نہیں۔ سب سے پہلے ہمیں بھان سنگھ کے شہر میر پور خاص کا ایک تفصیلی جائزہ لینا ہوگا۔ میر پور خاص، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، میروں کا خاص علاقہ تقسیم ہند کے بعد ہندوستان سے ہجرت کر کے میر پور خاص میں بسنے والے مہاجرین جو خطوط انڈیا یا پاکستان کے دیگر شہروں میں اپنے رشتے داروں کے نام بھیجتے تھے تو گھر کے پتے کے ساتھ شہر کا نام میر پور خاص سندھ لکھتے تھے۔ اسی طرح حیدر آباد میں بسنے والے مہاجرین حیدر آباد سندھ لکھتے تھے۔ انھیں یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ میر پور آزاد کشمیر میں بھی ہے جبکہ حیدر آباد انڈیا میں بھی ہے، کہیں غلطی سے ان کا بھیجا جانے والا حیدر آباد دکن یا میر پور آزاد کشمیر نہ چلا جائے، اور وہاں سے آنے والے خط کے بارے میں بھی ان کا یہی خیال تھا۔ ایسا ہوتا تو نہیں تھا لیکن خطرہ تو تھا۔ خیر، فی الوقت ہمارا موضوع ہے میر پور خاص اور بھان سنگھ۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں میر پور خاص میں سکھ آبادی میں کم ہی سہی لیکن تھے ضرور۔ شہر کے بالکل مرکز میں ان کا گرودوارہ تھا اور آج بھی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ گرودوارے میں جماعت اسلامی اور محکمۂ اوقاف و متروکہ املاک کا دفتر ہے۔ گرودوارے کی پیشانی پر ایک تختی بھی آویزاں ہے۔ جس پر غالباً گورمکھی تھا۔ گزشتہ دنوں متروکہ وقف املاک پاکستان کے منتظم اعلیٰ جناب صدیق الفاروق کراچی پریس کلب تشریف لائے اور ایک پریس کانفرنس سے خطاب میں اس عزم کا اظہار کیا کہ پاکستان سے ہجرت کرنے والے جن غیر مسلموں کی زمینوں، دکانوں، عبادت گاہوں پر جو ناجائز قبضے کیے گئے وہ خالی کرائے جائیں گے۔ اس موقعے پر ہم نے ان سے سوال کیا

کہ کیا میر پور خاص کے گرودوارے سے بھی قبضہ خالی کرایا جائے گا جس کے ایک حصے پر آپ کے اپنے دفتر کا قبضہ ہے؟ کیا گرودوارے کو سکھوں کے حوالے کیا جائے گا؟ تو جواباً انھوں نے فرمایا، چونکہ اب میر پور خاص میں سکھ موجود نہیں تو یہ عبادت گاہ کس کے حوالے کی جائے؟ بات ٹھیک ہی تھی۔ تقسیم ہند کے بعد بھان سنگھ بھی پاکستان سے انڈیا ہجرت کر گئے۔ اس کے بعد دوسرے سکھ بھی میر پور خاص چھوڑ گئے ہوں گے۔

بھان سنگھ کا میر پور خاص میں گھر تھا اور گھر کے نیچے دکانیں بھی۔ وہ بنیادی طور پر زمین دار تھے لیکن انھوں نے اپنے گھر کے نیچے دکانیں بھی بنائی تھیں۔ بھان سنگھ کی ان دکانوں کی خصوصیت یہ ہے کہ آج 70 یا 80 سال کا عرصہ گزرنے کے بعد بھی ان دکانوں کے دروازے اسی طرح کے بنے ہوئے ہیں جس طرز پر بھان سنگھ نے بنوائے تھے۔ ان دروازوں کا کمال یہ ہے کہ یہ دو تھموں پر مشتمل ہیں؛ جب کھلتے ہیں تو دکان کا سائبان (شیڈ) بن جاتے ہیں اور جب بند کیے جاتے ہیں تو دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ یہ دکانیں اور ان کے دروازے اب بھی موجود ہیں۔ انہی دروازوں کے اوپر ایک گھر کے آثار بھی ہیں جس کی بیرونی دیوار کے اوپری وسطی حصے پر گھڑیال کا ڈھانچہ موجود ہے۔ وقت کی گرد میں گھڑیال کی اصل صورت غائب ہو گئی ہے لیکن اس کی باقیات ڈھانچے کی صورت میں موجود ہے۔ جہاں تک گرودوارے کی بات ہے وہ تو میر پور خاص میں موجود ہے۔ اس کے اطراف میں دکانیں ہیں جو 50 سے زائد ہیں لیکن ان دکانوں کی ملکیت کے لیے کوئی بھی سکھ دستیاب نہیں۔ ہم نے سوچا کہ گردوارے کی عمارت کا ایک تصویری خاکہ بنایا جائے، اس لیے ہم میر پور خاص پہنچے۔ جیسے ہی ہم نے گردوارے کی تصاویر بنانی شروع کی تو آس پاس کے بہت سارے دکاندار ہمارے قریب آگئے اور کہنے لگے، ''گرودوارہ کب گرے گا؟'' ہم نے انھیں بتایا یہ ہمارا موضوع نہیں ہے، ہم تو صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس شہر میں سکھوں کا گردوارہ موجود ہے۔ اس پر انھیں بہت مایوسی ہوئی۔ خیر ہم گرودوارے کے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوئے اور مختصر اور تنگ سیڑھیاں چڑھتے بالائی منزل پر پہنچ گئے۔ اب بنیادی بات یہ تھی کہ تصویریں کس طرح بنائی جائیں۔ ہم نے دیکھا کہ جماعت اسلامی کے دفتر کے باہر ایک صاحب سو رہے ہیں۔ ہم نے ان کو جگایا اور بتایا کہ ہم گرودوارے کے حوالے سے تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ دفتر کا چوکیدار باہر گیا ہے۔ گرودوارے کے باہر

جماعت اسلامی کی ایک تختی ویزاں تھی اور تختی کے نیچے ایک اور تختی تھی۔ ہمارے دوست واحد پہلوانی نے اس تختی کی جانب توجہ دلائی۔ لیکن یہ بہت مشکل مرحلہ تھا کہ جماعت اسلامی کی تختی کو ہٹا کر کس طرح گردوارے کی تختی کی تصویر لی جائے۔ ہم نے دروازے پر موجود ایک صاحب سے پوچھا کہ جماعت اسلامی کی یہ تختی کس طرح ہٹا کر گردوارے کی تصویر لے سکتے ہیں؟ انھوں نے کہا، ڈنڈے سے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک بانس کا ڈنڈا لیا اور جماعت اسلامی کی تختی کو تھوڑا اوپر کر دیا۔ اس کے بعد گردوارے کی تختی بالکل نمایاں ہوگئی۔ ہم ابھی گردوارے کی تصاویر بنا ہی رہے تھے کہ اچانک ایک صاحب نے ہمیں آ کر کہا، "ابے بھائی، سکھ تو ہیں نہیں، گردوارہ شہر کے بیچ میں ہے، اب جلدی سے گردوارہ گراؤ اور دکانیں بناؤ۔" تصویریں تو بن گئیں لیکن ہمارے لیے گور مکھی تحریر کو پڑھنا ناممکن تھا۔ اس کے لیے ہم نے اجمل کمال کو تصویریں ارسال کیں کہ ہماری مدد فرمائیں۔ انھوں نے یہ تصویریں انڈین پنجاب میں ان کے ایک دوست چرن جیت سنگھ تیجا کو بھیجی۔ تختی کا ترجمہ انھوں نے یوں کیا: "اک اوں کار گر پرشاد پنجابی سکھ گردوارہ میر پور خاص (Ekonkaar Gur Prashad Punjabi Sikh Gurudwara Mirpurkhas)

ہم جب بھان سنگھ کے گھر کی تلاش میں میر پور خاص کے علاقے بھان سنگھ آباد میں پہنچے تو ہم نے ان کے گھر اور بیٹھک کی تلاش کر لی تھی لیکن ہمارے ذہن میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ کیا کبھی بھان سنگھ دوبارہ لوٹ کر آئے اور اپنے گھر اور بیٹھک کا جائزہ لیا۔ ہمارے ساتھ میر پور خاص کے ہمارے دوست واحد پہلوانی اور فوٹو جرنلسٹ عمران شیخ بھی تھے بالآخر ہم اس بیٹھک تک پہنچ گئے جہاں وہ رہتے تھے۔ بیٹھک کے باہر ایک صاحب جنھوں نے اپنا نام حاجی رفیق بتایا موجود تھے۔ ہم نے ان سے کہا کہ بھان سنگھ کا گھر کون سا ہے۔ انھوں نے انگلی کے اشارے سے ایک مکان کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ یہ گھر اب عمر راجپوت صاحب کا ہے اور یہی گھر بھان سنگھ کا تھا۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ نے بھان سنگھ کو دیکھا۔ انھوں اقرار میں سر ہلاتے ہوئے کہا کہ ہاں۔ 1964 میں جب میں سات سال کی عمر کا بچہ تھا تو اچانک علاقے میں شور ہو گیا کہ بھان سنگھ آیا ہے۔ تو پھر میں نے دیکھا کہ ایک عمر رسیدہ سکھ پگڑی پہنے اس گلی میں آیا کچھ دیر بعد وہ گھر سے باہر چلا گیا۔

یہ گھر اس وقت علوی ایڈووکیٹ کا تھا۔ بعد ازاں انھوں نے یہ گھر عمر راجپوت کو فروخت کر دیا تھا

اب اس گھر میں عمر راجپوت رہتے ہیں۔ باقی تفصیل آپ ان سے پوچھ سکتے ہیں۔ بہرحال ہم نے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا اور عمر راجپوت باہر تشریف لائے۔ ہم نے ان سے درخواست کی کہ ہمیں بھان سنگھ کی بیٹھک دیکھنی ہے جواب آپ کا گھر ہے۔ انھوں نے کہا بیٹا آؤ۔ ہم گھر میں داخل ہوئے تصویریں بنائی اور پھر عمر صاحب سے پوچھا کہ کیا کبھی بھان سنگھ یہاں واپس لوٹ کر آئے؟ ہاں آئے تھے۔ 2004 کی بات ہے، دن کے کوئی 12 بجے کا وقت ہوگا گھر کے دروازے پر دستک ہوئی، بیٹا اختر تمہیں تو اندازہ ہے یہ نہیں لیکن ایک طے شدہ بات ہے کہ میں بڑھا ہو گیا ہوں اور ریٹائرڈ بھی بچے اور ان کے بچے صبح کو اپنے دفاتر اور اسکولوں کی جانب چلے جاتے ہیں۔ میں اکیلا ہی گھر میں ہوتا ہوں اس لیے دروازے پر دستک ہو تو پہنچتے پہنچتے خاصی دیر لگ جاتی ہے۔ لیکن جب میں نے دروازہ کھولا ایک معمر شخص جو تقریباً نوے کے پیٹے میں تھا اور اس کے ساتھ ادھیڑ عمر عورت تھی جس کا تعارف اس نے اپنی بیٹی کی حیثیت سے کروایا۔ عمر رسیدہ شخص مجھ سے بولا بھان سنگھ کا گھر یہی ہے۔ میں نے کہا ہاں۔ آپ کو کس سے ملنا ہے۔ تو وہ بولے میں بھان سنگھ ہوں۔ کیا میں اپنا گھر دیکھ سکتا ہوں تو میں نے کہا کیوں نہیں اور میں انھیں گھر کے اندر لے آیا۔ میں نے اپنے باورچی سے کہا کہ چائے وغیرہ بابندوبست کرے گھر کے مالک آئے ہیں۔ باورچی گھر کے اندورنی حصے کی طرف چلا گیا اس کے بعد فقط اتنا ہوا کہ دو سے لیکر پانچ منٹ تک بھان سنگھ اور وہ ادھیڑ عمر لڑکی جو بھان سنگھ کے مطابق اس کی بیٹی تھی گھر کے در و دیوار پر ہاتھ پھیرتے رہے، چومتے رہے اور اس دوران روتے رہے۔ میں نے کہا آپ بیٹھیں میں چائے لیکر آتا ہوں لیکن جب میں واپس آیا تو نہ بھان سنگھ تھا اور نہ اس کی بیٹی۔ میں دوڑتا ہوا گلی میں آیا اور بھان سنگھ بھان سنگھ پکارتا رہا لیکن گلی میں خاموشی اور سناٹا تھا۔

ہاں! ایک بات اور۔ بھان سنگھ آباد کا سرکاری نام اب اورنگ آباد ہے۔ لیکن لوگ اب بھی اس علاقے کو بھان سنگھ آباد پکارتے اور لکھتے ہیں۔

کراچی کا اوتار: اے کے ہنگل

ہم آج کل اپنے دوستوں کی فرمائشوں کی زد میں ہیں۔ڈان ڈاٹ کام پر بلاگ شائع ہوتے ہی دوستوں کے فون اور پیغامات آنے شروع ہوجاتے ہیں۔اس موضوع پر لکھو،اس موضوع پر لکھو۔کراچی کے حوالے سے فلاں شخصیت پر ہم نے نہیں لکھا،ان پر بھی لکھنا چاہیے تھا۔یہ تمام تر پیغامات دیکھ کر مجھے خوشی بھی ہوتی ہے،اور اس کے ساتھ ساتھ مجھے صدمہ بھی ہے کہ ایک تو وسائل محدود ہیں،اور دوسرے ذرائع بھی۔لیکن بہ قول حسرت کے:

ہے مشق سخن جاری اور چکی کی مشقت بھی

سینیئر صحافی اور انسانی حقوق کے فعال کارکن زمان خان نے لاہور سے فون کیا کہ ہمیں اے کے ہنگل پر لکھنا چاہیے اور انھوں نے یہ مہربانی فرمائی کہ ہنگل کا انٹرویو بھی ہمیں بھیج دیا۔اے کے ہنگل ہندوستانی فلم انڈسٹری میں تین سو کے لگ بھگ فلموں میں کام کر چکے ہیں۔ہنگل ایک راسخ العقیدہ کمیونسٹ تھے اور وہ تقسیم ہند کے بعد پاکستان اور ہندوستان میں کمیونزم نافذ کرنا چاہتے تھے۔اپنے خیالات پر پختہ رہنے کی وجہ سے انھیں کراچی میں دو سال قید بھگتنا پڑی،اور وہ حیدرآباد جیل میں بھی رہے۔

ہنگل کا پورا نام اوتار کشن ہنگل تھا۔انھوں نے پاکستان چھوڑنے کے بعد انڈین فلموں میں بطور کریکٹر ایکٹر بہت نام کمایا۔خاص طور پر 1975 کی مشہور ہندوستانی فلم شعلے میں ''رحیم چاچا'' کا کردار ان کی شناخت بن گیا۔

کراچی میں اگر کمیونسٹوں اور کمیونسٹ پارٹی کا ذکر کریں،تو اس کی ایک طویل تاریخ ہے۔ان کمیونسٹوں میں زیب النساء عرف شانتا دیوی،سوبھو گیانچندانی،امام علی نازش،سجاد ظہیر اور اس طرح کے بے شمار لوگ شامل تھے۔لیکن ایک اور دلچسپ کردار لیاری کے بخشی کامریڈ تھے۔بخشی کامریڈ کا اوڑھنا بچھونا کمیونزم تھا۔

وہ کمیونزم سے جذباتی طور پر اس حد تک وابستہ تھے کہ کئی برس قبل کی بات ہے فٹبال ورلڈ کپ

میں روس کا مقابلہ کسی اور ٹیم سے تھا اور روس وہ میچ ہار گیا۔ یہ مقابلہ لیاری میں ایک عمارت کی تیسری منزل پر بڑی اسکرین پر دیکھا جا رہا تھا۔ جیسے ہی روس میچ ہارا، بخشی کامریڈ نے تیسری منزل سے چھلانگ لگا دی اور نتیجے میں ہاتھ پیر تڑوا بیٹھے۔ اس وقت کے کامریڈ اتنے ہی سچے ہوتے تھے۔

خیر ہم ذکر کر رہے تھے کراچی کے اوتار کا۔ اوتار اپنے نظریات کی وجہ سے کراچی جیل میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے کہ اچانک یہ حکم صادر ہوا کہ انھیں حیدر آباد جیل منتقل کیا جائے۔ جب انھیں حیدر آباد جیل منتقل کیا گیا تو اس جیل منتقلی کا احوال انھوں نے اپنے انٹرویو میں کچھ یوں بیان کیا:

جب مجھے حیدر آباد جیل منتقل کیا گیا تو وہاں غنی خان بھی قید تھے۔ غنی خان غفار خان کے صاحبزادے اور ولی خان کے بھائی تھے۔ انھوں نے مجھے کہا کہ میں کیوں پاکستان میں رہ رہا ہوں۔ انھوں نے مزید کہا کہ تم ایک ہندو ہو اور تمھارا یہاں کیا مستقبل ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ میں نے جواباً کہا کہ آپ ایک مسلمان ہیں اور جیل میں ہیں۔ آپ کا یہاں کیا مستقبل ہے؟ انھوں نے کہا کہ ہم پختونوں کو تنہا نہیں چھوڑ سکتے، گو کہ کانگریس نے ہم سے دھوکا کیا۔

اوتار نے سوبھو گیانچندانی کے ہمراہ ایک درخواست سندھ ہائی کورٹ میں دائر کی تھی۔ ان کے چار وکیل تھے جن میں سے ایک نوجوان شیخ ایاز تھے۔

اے کے ہنگل کمیونسٹ تھے۔ اس کی وجہ ان کی کراچی میں موجودگی تھی جہاں وہ کمیونزم سے متاثر ہوئے۔ کراچی میں اپنی رہائش کے دوران انھوں نے ایک درزی کی دکان پر ملازمت حاصل کی تھی اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ کپڑے کاٹنے میں بے انتہا مہارت رکھتے تھے۔

یہاں تک تو معاملہ ٹھیک تھا۔ دکان مالک سے ان کی بہت زیادہ دوستی تھی بلکہ اکثر خواتین گانے والیوں سے گانا سننے کے لیے وہ دونوں ایک ساتھ جایا کرتے تھے۔ لیکن اے کے ہنگل کمیونزم کے پیغام سے بہت زیادہ متاثر ہو چکے تھے اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ کمیونزم ہی وہ واحد طرز معیشت ہے جس میں تمام لوگوں کو اپنے حقوق حاصل ہو سکتے ہیں۔

چنانچہ انھوں نے کراچی میں ٹیلرنگ ورکرز یونین کی بنیاد رکھی۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا وہ مالک جو ان کا بہت اچھا دوست تھا وہ ان کے خلاف ہو گیا۔ اوتار نے ملازمین کے حقوق کی بحالی کے

لیے مطالبات کی ایک فہرست بنائی اور مالک کو پیش کی۔ ان مطالبات میں بنیادی نقطہ یہ تھا کہ یونین بنائی جائے اور شاپ اینڈ اسٹیبلشمنٹ ایکٹ کی پاسداری کی جائے۔ لیکن اس کے جواب میں ہنگل اور دیگر ملازمین کو ان کے دوست نے برطرف کر دیا۔

1946 میں انھیں کمیونسٹ پارٹی کا سیکریٹری منتخب کیا گیا۔ جیل جانے کے بعد حکومت پاکستان اور انڈیا کے درمیان قیدیوں کے تبادلے پر ایک معاہدہ ہوا۔ جب ان کی انڈیا منتقلی کے احکامات آئے تو انھوں نے جانے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ان کی نظر بندی کے احکامات میں مزید چھ ماہ کا اضافہ کر دیا گیا۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ آخر کار انھیں زبردستی ہندوستان بھیج دیا گیا۔

اوتار ایک آزاد خیال اور مذہبی ہم آہنگی کا پرچار کرنے والے انسان تھے۔ وہ پاکستان سے اپنی محبت کا اظہار گاہے بہ گاہے کرتے رہتے تھے۔ انڈیا کے انتہا پسند مذہبی رہنما بال ٹھاکرے کو ان کی یہ ادا پسند نہ آئی۔ ٹائمز آف انڈیا کی ویب سائٹ پر 26 اگست 2012 کو شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق شیوسینا کے قائد بال ٹھاکرے نے اے کے ہنگل پر غداری کا الزام لگایا۔ ان کی فلموں کا بائیکاٹ کیا گیا۔ شیوسینا کی طرف سے ان کے پتلے جلائے گئے اور متعدد فلموں سے ان کے سین بھی خارج کر دیے گئے۔

روزنامہ ڈان میں شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق اوتار نے اس کا جواب یوں دیا۔ "بال ٹھاکرے نے 6 دسمبر 1992 میں بمبئی میں ہونے والے بم دھماکوں اور ایودھیا کے واقعے کے بعد بیان دیا کہ میں اینٹی۔ انڈین ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اس وقت سے دیش بھگت ہوں جب آپ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ ہم آزادی کی جدوجہد کے لیے لڑے اور جیل گئے۔ ہم نے قربانیاں بھی دیں۔ ہمیں آپ سے دیش بھگتی کا سرٹیفکیٹ لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے روزرات کو قتل کیے جانے کی دھمکیاں ملتی رہیں لیکن میں نے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ آپ مہاراشٹر کا بڑا لیڈر ہونے کا دعوی کرتے ہیں جب کہ میں نے مہاراشٹر کے لیے قربانیاں دیں۔ میں جب بمبئی آیا تو میں نے مہاراشٹر موومنٹ میں حصہ لیا۔ اس میں میری بیوی بھی شامل تھی، اسے اس جیل بھیجا گیا جہاں پر خطرناک مجرموں کو رکھا جاتا تھا۔"

پاکستان کے معروف دانشور راحت سعید کی اوتار سے بہت زیادہ ملاقاتیں رہیں۔ ان کے

مطابق ہنگل صاحب پاکستان اور خصوصاً سندھ سے بہت محبت کرتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ سال میں ایک بار پاکستان ضرور آئیں۔

میں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کو ان کی کوئی خاص بات یا عادت یاد ہے تو راحت صاحب نے بتایا کہ لوگ اکثر ان سے مطالبہ کرتے تھے کہ ''شعلے'' فلم کے وہ ڈائیلاگ ضرور سنائیں جب ان کے بیٹے کو قتل کر دیا جاتا ہے، اور اس کی لاش رام گڑھ پہنچتی ہے تو ان کا پہلا جملہ یہ ہوتا ہے ''بسنتی او بسنتی اتنا سناٹا کیوں ہے بھائی۔'' میں نے یہ بھی دیکھا کہ ایک دن میں دس سے پندرہ بار مختلف اوقات میں ان سے یہ فرمائش کی جاتی تھی مگر وہ بیزاری کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ اس ''سناٹے'' نے انھیں امر کر دیا۔

یوں تو انھوں نے سینکڑوں فلموں میں کام کیا لیکن یہ جملہ ان کی شناخت بن گیا۔ اس موقع پر ہم اوتار کے ڈائیلاگ جوں کے توں بیان کرتے ہیں۔

بسنتی او بسنتی!

یہ اتنا سناٹا کیوں ہے بھائی؟

کون ویرو؟ بیٹے یہ خاموشی کیوں ہے یہاں؟ ہاں!

کیا ہوا؟ یہ کیا ہوا تھا بیٹا۔ یہ کہاں لے جا رہے ہو؟

احمد، احمد، احمد۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

کوئی یہ بوجھ نہیں اٹھا سکتا ہے بھائی۔ جانتے ہو دنیا کا سب سے بڑا بوجھ کیا ہوتا ہے؟ باپ کے کندھوں پر بیٹے کا جنازہ! اس سے بھاری بوجھ کوئی نہیں ہے۔ میں بوڑھا یہ بوجھ اٹھا سکتا ہوں اور تم ایک مصیبت (گبر سنگھ) کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے؟ بھائی میں تو ایک ہی بات جانتا ہوں۔ عزت کی موت ذلت کی زندگی سے کہیں اچھی ہے۔ بیٹا میں نے کھویا ہے، میں پھر بھی یہ ہی چاہوں گا کہ یہ دونوں (جے اور ویرو) یہیں رہیں۔

یہ تھے وہ ڈائیلاگ جنھوں نے ہنگل صاحب کو لافانی کر دیا۔ پاکستان سے انڈیا ہجرت کرنے والے روشن خیال ہندو دانشور انڈیا میں بھی انتہا پسندی کا شکار ہوئے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر اوتار پاکستان میں ہوتے تو شاید پاکستان کی فلم انڈسٹری اور تھیٹر کو عروج ملتا۔ ان کے نہ چاہتے ہوئے بھی ان

کو ہندوستان بھیج دیا گیا اور پھر اپنے وطن سے محبت کے جرم میں ان کے خلاف اشتعال انگیزی کی گئی اور انھوں نے اپنی آخری عمر بڑی کسمپرسی میں گزاری۔ میں تو جب بھی اپنے اس پاس ہونے والے واقعات پر لوگوں کی خاموشی دیکھتا ہوں، تو مجھے اے کے ہنگل کا یہی ڈائیلاگ یاد آتا ہے کہ:

بسنتی او بسنتی! یہ اتنا سناٹا کیوں ہے بھائی؟

کراچی روشن کرنے والا

گذشتہ 30 سالوں سے ہر حکمراں جماعت یہ دعویٰ کرتی ہے کہ روشنیوں کے شہر کی رونقیں ضرور بحال کریں گے۔ مگر رونقیں ہیں کہ بحال ہونے کا نام ہی نہیں لیتیں۔ سیاسی جماعتیں جب پہلے یہ دعویٰ کرتی تھیں تو غالباً ان کی مراد امن وامان کی بحالی ہوتی تھی۔ لیکن گزشتہ 10 سال سے اس میں لوڈ شیڈنگ کا خاتمہ بھی شامل ہو گیا ہے۔ تقسیم سے قبل کراچی کا شمار پس ماندہ شہروں میں ہوتا تھا۔ روشنیوں کے شہر میں روشنی کے لیے مٹی کے تیل کے لیمپ اور گیس بتیاں جلائی جاتیں تھیں۔ شہر حقیقتاً روشنی کا شہر اس وقت بنا جب ہر چند رائے وشن داس 1911 تا 1921 کے دوران کراچی میونسپلٹی کے صدر بنے۔ اراکین بلدیات کراچی رسالے کی 1980 کی اشاعت میں ہر چند رائے وشنداس کے حوالے سے تحریر ہے کہ وہ 1911 میں کراچی میونسپلٹی کے پہلے مقامی صدر منتخب ہوے۔ انھوں نے کراچی کی ترقی کے لیے بہت کام کیے۔ جن میں بجلی کمپنی کا قیام سب سے اہم تھا۔ بجلی کی آمد نے کراچی کو جدید شہر بنا دیا۔ رسالے میں یہ بھی لکھا ہے کہ ان کا تعلق بمبئی کے ایک ہندو خاندان سے تھا (جب کہ دیگر حوالوں سے یہ بات غلط ثابت ہوتی ہے)۔ وہ سندھ کے مقامی باشندے تھے اور ان کا جنم کوٹری شہر کے قریب ایک گاؤں میں ہوا تھا۔ وہ نہ صرف ایک فعال سماجی رہنما تھے بلکہ ایک نظریاتی سیاسی کارکن بھی تھے۔ مہاتما گاندھی اور دیگر کے ساتھ ایک یادگار تصویر۔۔۔ فوٹو۔۔۔ خادم حسین سومرو۔۔۔ پیر علی محمد راشدی اپنی کتاب 'اھی ڈینھن اھی شینھن' (وہ دن وہ لوگ) میں لکھتے ہیں کہ سیٹھ ہر چند رائے اور ان کے دوست غلام محمد خان بھرگڑی وہ نامور سندھی شہری تھے جنھوں نے اس وقت کے گورے (انگریز افسران) اور نوکر شاہی کے سامنے یہ نعرہ بلند کیا کہ سندھ کی شہریت ایک شان دار چیز ہے نہ کہ رسوائی کا سبب۔ علی محمد راشدی مزید لکھتے ہیں کہ: "ان کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب وڈیرے صاحب لوگوں" (انگریز افسران) کے پاس سلام (حاضری) کے لیے پیش ہوتے تھے تو صاحب کا پٹے والا ان کے جوتے اتروا کر انھیں ننگے پیر اندر لے جاتا تھا۔ کمشنر صاحب لیوکس، ان کی تذلیل کرنے کے لیے ان سے پوچھتے تھے: تم بدمعاش ہو یا نہیں؟ وڈیرے جواب میں کہتے تھے، "جی قبلہ! باپ دادا سے لے کر سرکار کے بدمعاش ہیں۔" اندیشہ یہ ہوتا تھا کہ انکار کرنے سے مبادا صاحب

ناراض ہوجائے اور جج ان کے خلاف کاروائی نہ کر بیٹھے۔ سیٹھ ہر چندرائے نے کراچی میونسپلٹی کے صدر کی حیثیت سے اپنے دور میں کراچی میں بے حد ترقیاتی کام کروائے۔ 1846 سے لے کر 1884 تک کراچی میونسپلٹی میں افسروں اور اہل کاروں کا زور رہتا تھا اور اراکین بھی ایسے نامزد ہوکر آتے تھے جن پر اہل کاروں کا زور چلتا تھا۔ یہ اراکین ہمیشہ افسروں کے کہنے پر عمل کرتے تھے۔ 1885 سے کراچی میونسپلٹی میں نامزد اراکین کے علاوہ منتخب اراکین بھی آنے لگے۔ ہر چندرائے کی ان تھک کاوشوں سے کراچی میونسپلٹی ایک عوامی ادارہ بنا۔ سندھ اور خصوصاً کراچی کی تاریخ کے حوالے سے مورخ گل حسن کلمتی اپنی سندھی کتاب "کراچی جالافانی کردار" (کراچی کے لافانی کردار) میں لکھتے ہیں کہ ہر چندرائے نے شہر کراچی میں مختلف برادریوں کے زیر انتظام کام کرنے والے سماجی اداروں کی بھی دل کھول کر مدد کی۔ ان اداروں کو میونسپلٹی کی جانب سے مفت پلاٹ دیے گئے تاکہ وہ بہتر طریقے سے کام کرسکیں۔ ان اداروں میں سنت دھرم منڈل، کنیا شالا، ڈوسا کنیا پاٹ شالا، خواجہ اسماعیلی کاؤنسل، مشن گرلز اسکول لوھانا واڈیا منڈل، لوھانا انڈسٹریل وٹیکنیکل انسٹیٹیوٹ اور سندھ مدرسے کا ادارہ شامل تھا۔ کراچی میں 1896 سے 1897 کے عرصے میں جب طاعون (Plague) کی وبا پھیلی تو اس وقت ہر چندرا؟ میونسپلٹی میں کاؤنسلر تھے۔ وبا سے نپٹنے کے لیے انھوں نے ایک عارضی اسپتال قائم کیا جس کے انچارج ہر چندرا؟ اور ان کے کزن تھے۔ ہر چندرائے نے پوری ٹیم کے ساتھ مل کر دن رات محنت کی۔ اس دوران خالی گھروں میں کچھ افراد نے لوٹ مار کی تو فوج اور پولیس کے ساتھ مل کر ہر چندرا؟ نے ان گھروں کی حفاظت کے لیے نوجوانوں کے جتھے مقرر کیے۔ کراچی شہر میں ہر چندرائے کے دور سے قبل سڑکیں کچی ہوتی تھیں۔ سڑکوں کے کنارے پیدل چلنے والوں کے لیے فٹ پاتھ کا کوئی تصور نہیں تھا۔ شہر میں تارکول (ڈامبر) سے بنائی جانے والی سڑکیں بھی انھوں نے متعارف کروائیں اور پیدل چلنے والوں کے لیے فٹ پاتھ بھی۔ سندھی ادب اور تاریخ پر گہری نظر رکھنے والے صحافی اصغر آزاد نے ہمیں بتایا کہ ہر چندرائے کی کراچی کے لیے خدمات کو ایک بلاگ میں تحریر نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے لیاری ندی کا رُخ تبدیل کر کے کراچی والوں کو ایک بڑی مصیبت سے چھٹکارا دلایا۔ موتی رام سترام داس اس بارے میں اپنی کتاب 'رتن جوت' کے صفحہ نمبر 101 پر لکھتے ہیں کہ: "لیاری ندی شہر کے درمیان میں بہتی تھی اور پانی کے تیز بہاؤ کے سبب شہریوں کے لیے مصیبت اور آزار کا سبب بنتی تھی۔ پانی اترنے کے بعد مچھروں کی بہتات ہوجاتی تھی۔ جس کی وجہ

سے ملیریا کا بخار پھیل جاتا تھا۔اس مسئلے سے نپٹنے کے لیے سیٹھ ہرچندرائے نے انجینئروں سے مشورے کے بعد ایک کارگر منصوبہ تیار کروایا۔لیاری ندی گاندھی باغ (کراچی چڑیا گھر) کے قریب دھوبی گھاٹ پر بند باندھا گیا اور پانی کے بہاؤ کا رُخ تبدیل کیا گیا۔اس کے نتیجے میں مزید زمین میسر ہوئی اور اور ایک اور کوارٹر وجود میں آیا۔لوگوں کی رائے تھی کہ اس کوارٹر کا نام ہرچندرائے کے نام سے منسوب کیا جائے لیکن سیٹھ صاحب کا واضح موقف تھا کہ جب تک میونسپلٹی کی باگیں ان کے ہاتھ میں ہیں وہ اس قسم کا کوئی فائدہ نہیں لیں گے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہرچندرائے اپنے اصولوں کی کس حد تک پاس داری کرتے تھے۔" ہرچندرائے ایک آزاد خیال اور مذہبی رواداری پر یقین رکھنے والے انسان تھے۔انھوں نے اپنی سماجی اور سیاسی زندگی کے دوران ہمیشہ اس بات کا ثبوت دیا کہ ان کے نزدیک مذہب ہر انسان کا ذاتی معاملہ ہے۔محمد عثمان دموہی اپنی کتاب کراچی تاریخ کے آئینے کے صفحہ نمبر 514 پر لکھتے ہیں کہ:" جب سندھ کو بمبئی پریذیڈینسی سے علیحدہ کرنے کی تحریک چلائی گئی تو کچھ ہندو اس تحریک کے سخت خلاف تھے۔مگر آپ نے اپنی قوم کی مخالفت کے باوجود اس تحریک میں دل وجان سے حصہ لیا تھا۔" جب کراچی میں کٹر ہندوؤں نے شدھی تحریک چلائی تو آپ نے کھل کر اس گھناؤنی تحریک کی مخالفت کی اور اس کی سرکوبی کے لیے میدان میں اتر آئے (شدھی تحریک کے بارے میں بات پھر کبھی کریں گے) آپ سائمن کمشن کے بائیکاٹ میں بھی شریک رہے۔غرض کہ آپ بے حد غیر متعصب اور بے لوث سماجی رہنما تھے۔سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیوں ہوا؟ اس بارے میں معروف مورخ اور محقق ڈاکٹر مبارک علی خان نے ہمیں بتایا کہ انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ جس کے قائد جناح تھے نے اس کمیشن کا بائیکاٹ کیا۔لیکن ایک مسلم لیگ سر محمد شفیع کی قیادت میں پنجاب میں بھی تھی، انھوں نے سائمن کمیشن کو خوش آمدید کیا تھا۔بہر حال کانگریس اور جناح صاحب کا موقف یہ تھا کہ چوں کہ کمیشن میں کوئی بھی ہندوستانی شامل نہیں اس لیے یہ کمیشن نا قابل قبول ہے۔سائمن کمیشن کی آئینی منظوری کے لیے انڈین قانون ساز اسمبلی کے 1 فروری کو ہونے والے اجلاس میں وائسرائے نے تقریر کی۔ہرچندرائے اس وقت خراب صحت کی بناء※ پر کراچی میں تھے۔اسمبلی میں کمیشن کے حوالے سے ووٹنگ ہونی تھی۔ہرچندرائے نے اپنی خراب صحت کے باوجود اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کا فیصلہ کیا۔موتی رام سترادم داس اپنی کتاب رتن جوت ' میں لکھتے ہیں :" 14 فروری کو وہ بہ ذریعہ ٹرین لاہور میل کے ذریعے کراچی سے روانہ ہوئے۔ٹرین جب سماسٹہ

اسٹیشن پہنچے تو شدید سردی کے سبب ان کی حالت بگڑنے لگی۔ وہ خون کی الٹیاں کرنے لگے۔ انھیں علاج کے لیے کہا گیا۔ لیکن وہ دہلی جانے کے لیے بضد تھے۔ 16 فروری کی صبح وہ دہلی پہنچے ان کی حالت بہت خراب تھی۔ انھیں ٹرین سے کرسی پر بٹھا کر موٹر میں سوار کرایا گیا اور اسپتال لے جانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن وہ بضد تھے کہ اسمبلی جا کر ووٹ دیں گے۔ اسمبلی کی جانب آتے ہوئے ان کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہوگئی۔ بلا آخر وہ اسمبلی کے گیٹ پر جان کی بازی ہار گئے۔ یہ تھی ان کی نظریاتی وابستگی اور سیاسی خلوص کی انتہا۔ ان کی آخری رسوم شان وشوکت سے ادا کی گئیں۔ آخری رسومات میں پنڈت مدن موھن مالویہ، پنڈت موتی لال نہرو، وٹھل بائی پٹیل سمیت بے شمار نامور شخصیات شریک ہوئیں۔ ان کا اگنی سنسکار جمنا ندی کے کنارے پر کیا گیا"۔ ہر چند رائے نام ونمود کے سخت خلاف تھے۔ ان کے دیہانت کے بعد ان کی یاد میں 28 فروری 1928 کو خالق دینا ہال میں ایک عوامی جلسہ منعقد کیا گیا۔ موتی رام سترام داس کے مطابق جلسے میں فیصلہ کیا گیا کہ مرحوم کی یاد میں ایک یادگار تعمیر کی جائے۔ اس سلسلے میں ایک کمیٹی ترتیب دی گئی۔ 6 سال بعد 16 فروری 1934 کو کراچی میونسپلٹی کمپاؤنڈ میں ان کے مجسمے کی تقریب رونمائی کی گئی۔ مجسمہ بنانے پر 16 ہزار روپے خرچ ہوئے۔ یہ رقم کراچی کے شہریوں سے حاصل کی گئی تھی۔ یہ مجسمہ مسٹر نام نے بنایا تھا۔ اراکینِ بلدیات کراچی رسالے کے مدیر مناظر صدیقی اداریے میں لکھتے ہیں: "آنجہانی ہر چند رائے وشن داس کے کراچی پر بڑے احسانات ہیں۔ ان کے کردار اور خدمات کے اعتراف میں کراچی میں ان کا ایک مجسمہ نصب تھا جو قیام پاکستان کے بعد ہٹا دیا گیا"۔ مجسمہ ہٹانے تک تو خیر لیکن ان کے نام سے موسوم سڑک کا نام تبدیل کر کے اسے ایک دوسرے سربراہ بلدیہ سے موسوم کر دینے کا جواز سمجھ میں نہیں آیا، اگر صرف جناب صدیق وہاب کی خدمت کا اعتراف کرنا مقصود تھا تو ان کے نام سے اسی طرح کسی نئی سڑک کو موسوم کیا جا سکتا تھا۔ اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جناب صدیق وہاب اور آنجہانی ہر چند رائے وشن داس دونوں ہی بلدیہ کراچی کے سربراہ رہ چکے ہیں۔ محسن کراچی سیٹھ ہر چند رائے کا یادگاری مجسمے سے خادم حسین سومرو ہمیں پتہ چلا کہ ہر چند رائے کا یہ مجسمہ میونسپلٹی کے گوداموں میں موجود ہے۔ ہم نے تمام گودام کھنگال ڈالے مگر اس کا کوئی پتہ نہ چلا۔ بعد میں ہر چند رائے پر لکھی گئی کتاب کے مصنف جناب خادم حسین سومرو نے ہمیں بتایا کہ یہ مجسمہ موہٹہ پیلس میں موجود ہے۔ جب وہاں پہنچ کر مجسمہ دیکھا تو وہ سر سے محروم تھا۔ یقیناً یہ سر کسی 'بت شکن' نے قلم کیا ہوگا۔

کراچی کی یہودی مسجد

قیام پاکستان کے بعد ہم نے کراچی میں تاج برطانیہ کے دور میں شہر کی تعمیر و ترقی میں نمایاں کردار ادا کرنے والے افراد کے ناموں سے منسوب تمام عمارتوں اور سڑکوں کے نام تبدیل کر دیے۔ یہ کوشش تا حال جاری ہے۔

یہ ہی سب کچھ ہم نے یہود و ہنود کے ساتھ بھی کیا۔ یہود و ہنود کی حد تک تو ہم کسی سطح تک کامیاب بھی ہوئے۔ لیکن تاج برطانیہ کے حوالے سے ہم کہیں کہیں ناکام بھی رہے۔

یہود سے ہماری نفرت دیرینہ ہے۔ اس کا احساس ان کو بھی تھا اس لیے وہ آہستہ آہستہ یہاں سے بیرون ملک خصوصاً اسرائیل منتقل ہو گئے۔

یہودیوں کی کراچی میں موجودگی کے حوالے سے محمودہ رضویہ اپنی کتاب ملکہ مشرق کے صفحہ نمبر 146 پر لکھتی ہیں کہ یہودی لارنس کوارٹر میں آباد ہیں۔ ملازم پیشہ اور عرف عام میں بنی اسرائیل کہلاتے ہیں۔ ذبیحہ اپنا الگ کرتے ہیں۔ ایک ہیکل اور سیمٹری ہے۔ ان کی آبادی بہت کم ہے۔ تعلیم یافتہ اور خاصے خوشحال ہیں۔

ایٹکن کی مولفہ سندھ گزیٹیر مطبوعہ 1907 میں یہودیوں کی کراچی آبادی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ 1901 کی مردم شماری کے مطابق ان کی تعداد صرف 428 ہے۔ یہ سب تقریباً کراچی میں آباد ہیں۔ اکثر کا تعلق بنی اسرائیل برادری سے ہے۔

محمد عثمان دموہی اپنی کتاب 'کراچی تاریخ کے آئینے' میں کے صفحہ نمبر 652 پر لکھتے ہیں کہ کراچی میں یہودیوں کا صرف ایک قبرستان تھا جو پرانا حاجی کیمپ کے جنوب مشرق میں واقع تھا۔ یہ بنی اسرائیل قبرستان کہلاتا تھا۔ اس حوالے سے محمودہ رضویہ لکھتی ہیں؛

"پرانی جوئین سیمٹری عثمان آباد سے ملحق ہے اور حاجی کیمپ کے جنوب مشرق میں بنی اسرائیل (یہودیوں) کا قبرستان ہے۔"

محمودہ رضویہ نے کراچی میں یہودیوں کی دو عبادت گاہوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان کو تلاش

کرنے سے قبل ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ جو یہودی کراچی سے اسرائیل منتقل ہوئے وہ کس حال میں ہیں اور کراچی کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔

سولجر بازار کا ڈینئل

اس بارے میں معروف قلم کار اور صحافی محمد حنیف جنھوں نے خوش قسمتی سے اسرائیل کا دورہ کیا۔ اس وقت بین الاقوامی نشریاتی ادارے بی بی سی سے وابستہ ہیں۔ ان کا ایک مختصر سفرنامہ بی بی سی سے نشر ہوا تھا۔ جسے بعدازاں نام ور ادیب اجمل کمال نے اپنے سہ ماہی جریدے آج کے شمارے نمبر 35 مطبوعہ 2001 میں شائع کیا تھا۔

محمد حنیف اسرائیل کے دورے کے دوران ایک تقریب کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ آخر میں کسی منتظم کو خیال آیا کہ میں نے تقریر نہیں کی۔ مجھے ہاتھ پکڑ کر اسٹیج پر کھڑا کر دیا گیا۔ میں نے کہا کہ میرا تعلق ہندوستان سے نہیں کراچی سے ہے۔ میں تو یوں ہی کام سے آیا تھا۔ لیکن آپ لوگوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی وغیرہ وغیرہ۔ میری بات سن کر پہلی قطار میں بیٹھے ہوئے پکی رنگت اور فربہ جسم کے ایک چالیس پینتالیس سالہ آدمی نے زور سے سسکی لی۔ میں اسٹیج سے اترا تو اس نے آکر میرا ہاتھ پکڑا، ایک کونے میں لے کر گیا اور گلے لگایا۔ یہ سولجر بازار کراچی کا ڈینئل تھا۔

"میں نے 68 کے بعد سے کوئی کراچی والا نہیں دیکھا"

اس نے سسکیوں کے درمیان مجھے بتایا:

"میں وہاں انگریزی میڈیم اسکول میں پڑھتا تھا، ہماری اپنی مسجد تھی۔ سن 67 کی جنگ کے دوران ایوب خان نے اس کی حفاظت کے لیے پولیس بھی بھیجی تھی۔"

پھر اس نے دل پر ہاتھ رکھا اور کہا، "ہمیں وہاں کوئی تکلیف نہیں تھی۔ ہمیں کبھی کسی نے گالی نہیں دی۔ ہم نے بس دیکھا کہ سب یہودی لوگ اسرائیل جا رہے ہیں تو ہم بھی آگئے ہیں۔ آپ سولجر بازار کے ظفر خان کو جانتے ہو؟"

ڈینئل ایک فیکٹری میں کام کرتا ہے۔ ایک ہندوستانی یہودی لڑکی سے شادی کر رکھی ہے۔ دو بچے بھی ہیں۔ خواہش یہ ہے کہ مرنے سے پہلے ایک دفعہ کراچی ضرور دیکھ لے۔

"سنا ہے آج کل پھر کوئی فوج وغیرہ کی حکومت ہے وہاں، وہی چلا سکتے ہیں اپنے ملک کو بس۔"

باتوں باتوں میں ڈینئل نے بتایا اس کا اسرائیل، خاص طور پر رام اللہ میں دل نہیں لگتا۔

میں نے پوچھا کیوں؟

آپ کو پتا ہے کہ ہم پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کی طبیعت میں بڑا فرق ہے۔ یہ لوگ ہمیں کبھی پسند نہیں کر سکتے۔ ہماری بھی ان کے ساتھ نہیں بنتی۔ ہمارے یہاں پر صرف تین چار خاندان ہیں۔ میری بیوی بھی ہندوستانی ہے لیکن وہ اپنے لوگوں والی بات نہیں ہے۔ میں نے کہا یہ سب تو آپ کے یہودی بھائی ہیں۔ کہنے لگے ہاں ہاں لیکن ہیں تو ہندوستانی!

ذکر ہو رہا تھا کراچی میں یہودیوں کی عبادت گاہوں کا۔ ان میں سب سے مشہور (Magain (Bani Israel TrustShalome Synagogue کی عمارت تھی جسے آج بھی کراچی کے پرانے لوگ اسرائیلی یا یہودی مسجد کے نام سے پہچانتے ہیں۔ یہ رنچھوڑ لائن کے مرکزی چوک پر واقع ہے۔ جہاں اب اس کی جگہ مدیحہ اسکوائر کی کثیر المنزلہ عمارت موجود ہے۔

ہمارے دوست قاضی خضر حبیب نے اس سلسلے میں ہماری خاصی مدد کی۔ ان کے مطابق بنی اسرائیل ٹرسٹ کی آخری ٹرسٹی ریشل جوزف نامی خاتون تھیں جنھوں نے اس عمارت کا پاور آف اٹارنی احمد الٰہی ولد مہر الٰہی کے نام کر دیا تھا۔ ان میں ایک معاہدہ طے پایا تھا کہ عبادت گاہ کی جگہ ایک کاروباری عمارت تعمیر کی جائے گی۔ عمارت کی نچلی منزل پر دکانیں جب کہ پہلی منزل پر عبادت گاہ تعمیر کی جائے گی۔

نچلی منزل پر دکانیں تو بن گئیں اور پہلی منزل پر عبادت گاہ بھی۔ مگر اب عبادت گاہ کی جگہ رہائشی فلیٹ ہیں۔ ریشل جوزف اور مختلف افراد کے درمیان ٹرسٹ کی ملکیت کے حوالے سے مقدمہ بازی بھی ہوئی جس میں ریشل اور ان کے اٹارنی کو کامیابی حاصل ہوئی۔

ریشل کی کراچی موجودگی کے بارے میں ہم نے اپنے ایک وکیل دوست جناب یونس شاد کے ذریعے ان کے وکیل سے رابطہ کیا تو انھوں نے بتایا کہ وہ کافی عرصہ پہلے لندن منتقل ہو گئیں تھیں۔

6 مئی 2007 کو روزنامہ ڈان میں شائع ریما عباسی اپنے ایک مضمون میں ریشل سے گفتگو کا حوالہ دیتی ہیں۔ یہ گفتگو یہودی قبرستان کے حوالے سے ہے۔ جس کی وہ آخری کسٹودین تھیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ 2007 تک کراچی میں موجود تھیں۔ جس کے بعد وہ یہاں سے چلی گئیں۔

یہودی قبرستان

اگلا مرحلہ یہودی قبرستان جانے کا تھا۔ ہم نے اپنے ایک صحافی دوست اسحاق بلوچ جو گولیمار کے رہائشی ہیں سے اس سلسلے میں مدد چاہی۔ انھوں نے بتایا کہ قبرستان کی نگرانی ایک بلوچ خاندان کرتا ہے۔ وہ ایک بار وہاں گئے تھے۔ بلوچ خاندان نے بہ مشکل انھیں اندر جانے کی اجازت دی۔ وہ بھی بغیر کیمرے کے۔ ہم مایوس ہو گئے۔

اسحاق بلوچ نے ہمیں کہا کہ اس سلسلے میں نوجوان صحافی ابوبکر بلوچ سے بات کریں۔ ان کے رشتے داروں کے قبرستان کے نگران خاندان سے تعلقات ہیں۔ میں نے اس حوالے سے ابوبکر بلوچ سے بات کی اور ہمارے درمیان یہ طے پایا کہ اتوار کے دن میوہ شاہ قبرستان جا کر کوشش کریں گے۔

اتوار کے دن ہم ابوبکر کے گھر لیاری کے علاقے نوالین پہنچے اور وہاں سے میوہ شاہ قبرستان۔ ابوبکر نے ایک پھولوں کی پتیاں بیچنے والی خاتون کی جانب اشارہ کیا۔ ہم نے جیسے ہی انھیں سلام کیا تو انھوں نے ناگوار نظروں سے ہماری جانب دیکھا۔ انھیں اندازہ ہو گیا کہ ہم پھولوں کی پتیاں خریدنے نہیں آئے۔ وہ اردو میں بولیں تم لوگ اندر نہیں جا سکتے۔ میں نے ابوبکر کی جانب دیکھا۔ اس بے چارے نے بلوچی میں کسی شریف بھائی کا حوالہ دیا۔

اتوان نے نازبو کے ڈنٹھل صاف کرتے کرتے ہماری طرف کچھ حیرت سے دیکھا اور پھر اردو میں اپنا پرانا جواب دہرایا۔ لیکن اب ان کے لہجے میں پہلی والی شدت نہیں تھی۔ ہم نے بھی بلوچی کا حربہ آزمانے کا فیصلہ کیا اور ان سے بلوچی میں قبرستان دیکھنے کی اجازت چاہی۔

اب انھوں نے ہم سے بلوچی میں گفتگو شروع کی۔ ان کے لہجے سے درشتگی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ انھوں نے کہا پہلے بھی کچھ لوگ آئے تھے۔ فوٹو بنا کر چلے گئے۔ ہم کو بڑا آسرا دیا کہ قبرستان ٹھیک کروا دیں گے۔ اس کی چار دیواری اونچی کروا دیں گے۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔ چار دیواری بھی ہم نے اونچی کروائی ہے نہیں تو لوگ سنگ مرمر کے پتھر بھی لے جاتے۔

انھوں سے بتایا کہ قبرستان میں 500 سے زیادہ قبریں ہیں۔ ہم لوگوں کو قبرستان کی حفاظت کرتے ہوئے 100 سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا ہے۔

گفتگو کے دوران وہ ہمیں بار بار اس بات کا احساس دلاتی رہیں کہ ہمیں اندر جانے کی اجازت

ہرگز نہیں دیں گی۔ لیکن ہم نے اپنی کوشش جاری رکھیں۔ آخر زچ ہو کر انھوں نے کہا کہ ہم پیر والے دن ایک بجے آجائیں اور ان کے بیٹے سے ملیں۔

ہم تقریباً مایوس ہو چکے تھے۔ اتنی دیر میں ایک موٹر سائیکل ہمارے قریب آکر رکی اور اس سے ایک نوجوان اترا۔ جو لنگڑا کر چل رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک اسٹک بھی تھی۔ یہ خاتون کا بیٹا عارف تھا۔ عارف نے ہماری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ان کی والدہ نے انھیں ہمارے بارے میں بتایا۔

عارف نے بھی اردو میں بتایا کہ ہم اندر نہیں جا سکتے۔ لیکن لہجے میں ماں والی درشتگی نہیں تھی۔ ہم نے عارف سے بھی دوبارہ بلوچی میں درخواست کی، ان کی آنکھوں میں حیرت اور کچھ قبولیت کے آثار دیکھ کر ہم نے انھیں بتایا کہ ہم صرف قبرستان دیکھنا چاہتے ہیں۔ خاصی بحث کے بعد وہ راضی ہو گئے۔ لیکن شرط لگائی کہ صرف ایک آدمی ان کے ساتھ چلے۔ ہم نے شرط مان لی۔

یوں ہم قبرستان کے اندر داخل ہو گئے۔ اگلا مرحلہ تصویریں بنانے کا تھا۔ قبرستان کانٹے دار جھاڑیوں سے اٹا پڑا تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ جیب سے کیمرہ نکالا اور تصویریں بنانی شروع کی۔ عارف نے میری طرف دیکھا اور بلوچی میں بولا جتنی چاہو بنالو یار بلوچ بھائی ہو۔

اس دوران عارف نے بھی اپنی والدہ والی باتیں دہرائیں اور بتایا کہ پہلے وہ جھاڑیاں وغیرہ خود صاف کرتے تھے۔ لیکن گزشتہ دنوں ان کا موٹر سائیکل سے ایکسیڈنٹ ہو گیا جس کے نتیجے میں ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اس لیے اب ان کے لیے یہ کام ممکن نہیں ہے۔

عارف نے مزید بتایا کہ تقریباً ایک سال قبل ایک شخص ان کے پاس آیا تھا جس نے بتایا کہ شیرٹن ہوٹل میں کچھ لوگ ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ ہوٹل گئے تو 4 لوگوں سے ملاقات ہوئی جنھوں نے قبرستان کا تفصیلی حال احوال لیا۔ مگر قبرستان دیکھنے نہیں آئے۔

عارف کے مطابق کبھی کبھار لوگ آتے ہیں تصویریں بناتے ہیں اور بڑی بڑی باتیں کر کے چلے جاتے ہیں لیکن ہوتا ہواتا کچھ نہیں ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہودیوں کو شکر ادا کرنا چاہیے کہ ان کی قبروں کے نگران بلوچ ہیں ورنہ یہودی مسجد کا تو آپ کو پتہ ہے نا کیا حال ہوا۔

یاراٹول کافران دے

1992 میں جب ہندوستان میں بابری مسجد کی بے حرمتی کی گئی، تو پاکستان میں بھی اس کا ردعمل دیکھنے میں آیا۔ کراچی کے علاقے کیاماڑی (اسے کیماڑی کہا جاتا ہے مگر درست نام کیاماڑی ہے کیونکہ کیا' نام ہے جب کہ ماڑی عمارت کو کہتے ہیں) میں مشتعل افراد کو توڑ پھوڑ کے لیے کوئی مندر نہ ملا تو انھوں نے مسیحی مشنری کے زیر اہتمام چلنے والے Sacred Heart School پر دھاوا بول دیا۔

ہجوم بڑی تیزی سے اسکول کی جانب بڑھ رہا تھا کہ اچانک مجمعے میں سے ایک بزرگ آگے بڑھے اور ہجوم کے سامنے کھڑے ہو کر زور سے پشتو میں چلائے: "دا کرستان باندے، ہندوان نہ دے، او بابری جماعت ہندوانوں حملہ کڑے دہ (یہ ہندو نہیں مسیحی ہیں اور بابری مسجد پر حملہ ہندوؤں نے کیا ہے) اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ہم اس بلاگ کے آخر میں بتائیں گے۔

تاہم یہ بتا دیں کہ یہ واقعہ ہمارے دوست صحافی انور خان نے ہمیں سنایا تھا۔ ایک دن ہم نے ان سے پوچھا کہ سنا ہے کراچی میں آریہ سماج نامی تنظیم کام کرتی تھی اور ان کے مندر بھی تھے، تو انھوں نے بتایا کہ ان کے علاقے کیاماڑی میں ایک عمارت ہے جس پر آریہ سماج کمپاؤنڈ اردو میں لکھا ہے۔ ان سے طے پایا کہ اتوار کے دن ہم وہاں جائیں گے، لیکن اتوار کو وہ نہ چل سکے۔ اگلے اتوار کو میں انور خان، فوٹو جرنلسٹ ماجد بٹ اور اختر سومرو کے ہمراہ کیاماڑی پہنچا۔ مختلف گلیوں سے ہوتے ہوئے وہ ہمیں ایک پرانی عمارت کے سامنے لے گئے۔ عمارت کے دروازے پر کوئی تختی نہیں لگی ہوئی تھی۔

ہم نے انور خان کی جانب دیکھا تو وہ پریشان ہو کر بولے یار تختی کچھ عرصے پہلے تک تو لگی ہوئی تھی۔ اتنی دیر میں ماجد بٹ نے دروازے کے اوپر اور بائیں طرف لگی ہوئی تختیوں کی جانب ہماری توجہ مبذول کروائی لیکن یہ تختیاں ہندی میں تھیں۔ انور خان کے ہمراہ ان کے ایک مقامی دوست محمد علی سومرو صاحب بھی تھے۔ انھوں نے عمارت کے بائیں جانب ایک کے جی اسکول کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس مقام پر مندر ہوتا تھا۔

محمد علی سومرو صاحب اور انور خان ہمیں علاقے میں ایک اور جگہ لے گئے اور وہاں ایک عمارت

دکھلائی جو باقاعدہ ایک مندر کی عمارت لگ رہی تھی، لیکن اس کے بیرونی دروازے پر بھی ایک کے جی اسکول کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ آریہ سماج کمپاؤنڈ پر لگی تختیاں جو ہندی کو پڑھنے کے لیے ہندی دانوں سے رابطہ کرنا تھا۔ اس سے قبل یہ معلوم کرنا تھا کہ آریہ سماج اگر کراچی یہ سندھ کے دیگر علاقوں میں تھا تو اس کی سرگرمیاں کیا تھیں۔ اس حوالے سے معروف مورخ عثمان دموہی اپنی کتاب کراچی تاریخ کے آئینے میں لکھتے ہیں کہ

کچھ انتہا پسند ہندوؤں کا خیال تھا کہ قدیم زمانے میں تمام دنیا پر آریوں کی حکومت تھی۔ چناں چہ آریوں کو دوبارہ اپنا کھویا ہوا اقتدار حاصل کر لینا چاہیے۔ چوں کہ وہ دنیا کی اعلیٰ ترین قوم ہیں لہذا ہندوؤں میں اعلیٰ درجے کی قومیت کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ غیر مذاہب کے ماننے والوں کو یا تو جلاوطن کر دیا جائے یا پھر سوکھی لکڑی کی طرح آگ میں جلا دیا جائے۔ آریہ سماج ہندوؤں کی پرانی تنظیم ہے۔ جو ہندو مہا سبھا سے بھی قبل قائم ہوئی تھی۔ اس کا بانی منشی رام نامی ایک انتہا پسند ہندو تھا یہ شخص تعلیم یافتہ ابتداء میں پنجاب پولیس میں ملازم تھا۔ بعد میں وہ پولیس کی ملازمت چھوڑ کر وکالت کرنے لگا اور پھر ترک دنیا کا ڈھونگ رچا کر گیان دھیان کی نام نہاد زندگی گزارنے لگا اور بالاآخر منشی رام سے شردھانند بن بیٹھا اس جماعت کا پس پردہ انگریز حکومت سے گہرا ربط وضبط قائم تھا۔ انگریزوں کی شہہ پر ہی ہندو مسلم اتحاد کو فنا کرنے کے لیے اس جماعت نے پورے ہندوستان میں اپنی شاخیں قائم کی تھیں۔

سوامی شردھانند کے بارے میں دموہی صاحب کی رائے اپنی جگہ سوامی جی کو ان کی سرگرمیوں سے روکنے کے لیے قتل کر دیا گیا ان کے قتل کی داستان دیوان سنگھ مفتون جو ایک بہت بڑے صحافی تھے اور اپنا ایک اخبار ''ریاست'' کے نام سے شائع کرتے تھے نے اپنی کتاب ناقابل فراموش کے صفحہ نمبر 497 پر کچھ یوں بیان کی ہے۔

میں میٹرک پریڈ والے دفتر ''ریاست'' میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ سوامی رامانند (جو سوامی شردھانند کی شدھی کی تحریکوں کے انچارج تھے) کا ٹیلی فون آیا کہ سوامی شردھانند کو ابھی ایک مسلمان نے قتل کر دیا ہے۔ سوامی شردھانند بہت ہی بلند انسان تھے اور ایڈیٹر ''ریاست'' پر بہت مہربانی فرمایا کرتے تھے۔ یہ اطلاع ایڈیٹر ''ریاست'' کے لیے خلاف توقع اور بے حد افسوس کا باعث تھا۔ میں فوراً

سوامی جی کے نیا بازار والے مکان پر پہنچا۔ اس وقت واقعہ کو ہوئے ایک گھنٹے سے کم ہوا تھا۔ سوامی جی مقتول حالت میں خون سے لت پت لکڑی کے تخت پوش پر پڑے تھے۔ قاتل عبدالرشید حراست میں تھا۔ ہزار ہا لوگ جمع تھے اور شیخ نذیر الحق انسپکٹر پولیس ابتدائی تحقیقات میں مصروف تھے۔ میں جب عبدالرشید کو دیکھا تو میں نے پہچان لیا کیوں کہ ایک یا دو سال پہلے یہ دفتر ''ریاست'' میں کتابت کا کام کر چکا تھا۔ عبدالرشید نے جب مجھے دیکھا تو سلام کیا۔ یہ ہجوم کے باعث بہت ہی پریشان تھا اور اس کا رنگ زرد تھا۔ میں نے حالات کو دیکھا تو میں سمجھ گیا کہ یہ قتل عبدالرشید کی مذہبی دیوانگی کا نتیجہ ہے۔ کیوں کہ اس کی دیوانگی کی علامات ایک عرصہ پہلے ذیل کی صورت میں دفتر ''ریاست'' میں ظاہر ہو چکی تھیں اور وہ واقعات یہ تھے۔

افغانستان میں کنگ امان اللہ کے حکم سے چند احمدی سنگسار کر دیے گئے جو وہاں اپنے احمدی خیالات کی تبلیغ کرتے تھے۔ سنگساری کے ان واقعات کو سن کر مجھے بہت افسوس ہوا اور میں حیران تھا کہ کیا موجودہ زمانہ میں بھی انسان انسانوں کو مذہب کے نام پر پتھر مار مار کر ہلاک کر سکتے ہیں۔ چنانچہ میں نے اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے افغان گورنمنٹ کے ایک سخت ایڈیٹوریل نوٹ لکھا اور یہ نوٹ اس کاتب عبدالرشید (سوامی شردھانند کے قاتل) کو کتابت کے لیے دیا۔ عبدالرشید نے ابھی چند سطروں کی کتابت کی تھی کہ وہ میرے پاس آیا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں چہرہ پر غصہ کے جذبات تھے۔ اور اس نے کہا'' آپ کو شرعی معاملات میں دخل دینے کا کیا حق حاصل ہے۔ اسلام کی تعلیم کے مطابق سنگساری جائز ہے اور احمدیوں کو ضرور سنگسار کیا جانا چاہیے تھا۔ کیوں کہ یہ اپنے مرزا قادیان کے نبی ہونے کے دعویدار ہیں۔ میں یہ کافرانہ نوٹ نہیں لکھ سکتا۔ میں نے جب اس کو انتہائی غصہ کی حالت میں دیکھا تو میں نے محسوس کیا کہ اس کا دماغی توازن قائم نہیں۔ میں نے اس سے نوٹ واپس لے کر دوسرے کاتب کو دے دیا اور اس کا احساب کر کے اسے اپنے دفتر سے علیحدہ کر دیا۔ اس کے بعد عبدالرشید کے جو حالات مجھے معلوم ہوئے وہ یہ تھے کہ ہجرت کی تحریک میں یہ افغانستان چلا گیا تھا اور وہاں سے جب مہاجر واپس ہندوستان آئے تو یہ بھی واپس آ گیا اور آتے ہوئے وہاں سے پوشیدہ طور پر ایک ریوالور اپنے ساتھ لے آیا تھا اور اس ریوالور سے ہی اس نے سوامی جی کا قتل کیا۔

پیر علی محمد راشدی اپنی کتاب ''اھی ڈینھں اھی شینھن'' (وہ دن وہ لوگ کتاب کے اس نام کا

ترجمہ معروف ادیب اجمل کمال نے کیا ہے اگر اس کی لفظی معنی پر جائیں تو وہ اس طرح ہوتے ہیں "وہ دن وہ لوگ" لیکن اجمل صاحب کا ترجمہ لفظی نہیں بلکہ بامحاورہ ہے) میں آریہ سماج کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ 1920 کی اصلاحات کے بعد ہندوؤں نے تین چار تحریکیں بیک وقت شروع کیں (1) شدھی سنگھٹن (۲) آریا سماج (۳) ہندو مہا سبھا۔ ان سب کی سرتاج پرانی کانگریس تھی جو یہ نام نہاد دعوی کرتی تھی کہ وہ ہندو اور مسلمانوں کی مشترکہ جماعت ہے۔ مگر درحقیقت اس کا مقصد ہندوؤں کی بالادستی قائم کرنا تھا۔ آریہ سماج کی سندھ میں سرگرمیوں کے حوالے سے پیر علی محمد راشدی مزید لکھتے ہیں کہ

ہندو مسلم فسادات کا آغاز لاڑکانہ سے ہوا۔ جو 29 مارچ 1928 کو ایک مسلمان عورت کے مسئلے پر ہوا۔ کریماں نامی یہ عورت ایک دیہاتی مسلمان کی بیوی تھی۔ جو تین بچوں کی ماں تھی۔ کریماں ایک ہندو سے بدراہ ہوکر لاڑکانہ بھاگ آئی اور بچوں سمیت ہندو آریہ سماجیوں (جنھوں نے شدھی کی تحریک شروع کر رکھی تھی) کے ہاتھوں مرتد ہوگئی۔ یعنی بچوں سمیت ہندو دھرم میں داخل ہوگئی۔ شہر کے مسلمانوں نے بچوں کے حصول کے لیے عدالت میں درخوست دائر کی۔ لیکن ان کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ مسلمانوں نے وفد کی شکل ضلعی اہل کاروں سے بچوں کے معاملے پر ملاقات کی۔ ہندوؤں نے اس دوران کریماں اور بچوں کو اپنے پاس چھپالیا۔ کلکٹر سے ناامید ہوکر وفد ہجوم کی شکل میں حاجی امیر علی خان مرحوم سے ملنے گیا اور وہاں سے مایوس ہوکر واپس لوٹتے ہوئے وفد میں شامل کچھ لڑکوں نے ہندوؤں کی دو بیڑی سگریٹ فروخت کرنے والی کیبنوں کو لوٹا اور ہندو لڑکوں پر پتھراؤ کیا۔ اس کے بعد شہر میں فساد کے نتیجے میں ہندوؤں کی چار پانچ اور دکانیں متاثر ہوئیں۔ لیکن یہ بات یادر ہے کہ مذہبی اشتعال کے باوجود ہندوؤں کو کوئی جانی نقصان نہ پہنچا۔ نہ ہی کوئی ہندو مارا گیا اور نہ ہی شدید زخمی ہوا۔ دکانیں لوٹنے والی بات بھی عدالتوں میں جھوٹی ثابت ہوئی۔ کیوں کہ لوٹا ہوا مال کسی مسلمان سے برآمد نہ ہوا اور نہ ہی خود ہندو یہ ثابت کر سکے کہ ان کی دکانوں کو لوٹا گیا تھا۔ انگریز جج نے اپنے فیصلے میں ہندو گواہوں کو جھوٹا اور بے ایمان قرار دیا۔

ہندوؤں نے اس مختصر اور وقتی حادثے کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے جھوٹے مقدمات درج

کرواکر 80 مسلمانوں کو جیلوں میں بند کروایا۔ لاڑکانہ کے اہم مسلمان قومی کارکنوں کو خاص طور پر گرفتار کروایا۔ خان بہادر ایوب کھوڑو کو جو اس وقت بمبئی کاؤنسل میں مسلمانوں کے منتخب نمائندے تھے۔ صرف اس بنیاد پر کہ وہ مسلمانوں کے ہم درد ہیں جھوٹے مقدمے میں پھنسوانے کی کوشش کی۔

موجودہ دور میں کراچی یا سندھ کے دیگر علاقوں میں آریہ سماج کا وجود نظر نہیں آتا آریہ سماج کی آخری نشانیاں کیاماڑی آریہ سماج کمپاؤنڈ کے مرکزی دروازے پر لگی ہوئی وہ تختیاں ہیں جو ہندی میں ہیں انھیں پڑھنے کے لیے ہمارے دوست حسن منصور، حفیظ چاچڑ اور اجمل کمال نے ہماری مدد کی تختیوں پر لکھی ہوئی تحریروں کا ترجمہ کچھ یوں ہے۔

آریہ سماج کیاماڑی

یہ آدھار شیلا (سنگ بنیاد) شری آچاریہ رام دیوجی

(گروکل کانگڑی) نے

15-9-1929 کو رکھا۔

اوم

شری سوامی سیوک آنند جی کے

ادیوگ (تعاون) سے یہ مندر بنایا گیا

شاہین اور چیل

چیل تو گھاس نہیں کھاتی مگر گھاس بیچنے والے کے نام سے منسوب چوک کا نام چیل چوک کیسے پڑ گیا؟ ذکر ہے لیاری کے اس مشہور چیل چوک کا جواب لیاری کی شناخت بن گیا ہے۔ یہ وہ چیل چوک ہے جہاں سے اندرون لیاری کا آغاز ہوتا ہے۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے ایک ہفتے تک اپنے تمام وسائل کو استعمال کرنے کے باوجود لیاری میں آپریشن کے لیے اس چوک سے آگے نہ بڑھ سکے۔ لیاری کے سابقہ باشندے ایوب قریشی جو نیشنل پارٹی صوبہ سندھ کے سیکریٹری اطلاعات ہیں کہتے ہیں کہ آج جس لیاری کو بھتا خوری، گینگ وار، اور اغوا برائے تاوان کے حوالے سے شناخت کیا جاتا ہے۔ گذشتہ دور میں لیاری رواداری، جمہوریت پسندی اور آمریت کے خلاف جدوجہد کے حوالے سے پہچانی جاتی تھی۔ یہی لیاری تھی جہاں کے بسنے والے خواہ ان کا تعلق کسی بھی رنگ، نسل یا مذہب سے ہوتا تھا نظریاتی اعتبار سے یکجا تھے۔ مگر اب یہ تمام چیزیں یاد ماضی بن گئی ہیں۔ خیر ہم ذکر کر رہے تھے چیل چوک کا۔ یہ چوک اسی کی دہائی میں ابراہیم چوک کے نام سے مشہور تھا۔ ابراہیم چوک کا نام کب اور کیسے پڑا؟ اس کے بارے میں سرکاری دستاویز دستیاب نہیں۔ لیکن علاقے کے باشندوں کا کہنا ہے کہ اس چوک پر ابراہیم نامی ایک شخص گھاس فروخت کرتا تھا۔ اس سے لیاری کے گدھا گاڑی بان اور مویشی پالنے والے چارا خریدتے تھے۔ اس لیے اس چوک کا نام ابراہیم چوک ہوگیا۔ غالباً یہ پاکستان میں پہلا چوک ہے جو ایک گھاس بیچنے والے کے نام سے منسوب تھا۔ ترقی پسند سماجی کارکن تاج مری چیل چوک کے بارے میں ایک الگ ہی کہانی بیان کرتے ہیں۔ تاج مری کا کہنا ہے کہ ایم آر ڈی کے تحریک کے دوران عموماً احتجاجی مظاہرے چاکیواڑہ کے آٹھ چوک پر ہوتے تھے۔ آٹھ چوک کو پولیس پہلے ہی سے گھیرے میں لے لیتی تھی۔ یہ ممکن نہ تھا کہ مظاہرین یا جلوس کے شرکاء آٹھ چوک سے آگے بڑھ کر لیمارکیٹ یا نیپیر روڈ تک پہنچ کر شہر کے دیگر علاقوں کو بھی متاثر کرسکیں۔ اس لیے کامریڈوں کی نظر اس چوک پر پڑی۔ اس کی وجہ غالباً اس چوک سے متصل عثمان آباد اور رنچھوڑ لائن کی یہودی مسجد کے کاروباری علاقے تھے جہاں بسنے اور کاروبار کرنے والے افراد کو اس بات سے کوئی سروکار نہ تھا کے

ضیاء الحق رہے یا نہ رہے، جمہوریت بحال ہو نہ ہو ان کا کاروبار چلتا رہے (رنچھوڑ لائن کے مرکزی چوک پر یہودیوں کی عبادت گاہ (جسے یہودی مسجد کہا جاتا ہے) ہوتی تھی۔ جس کی جگہ پر اب ایک عالیشان کاروباری مرکز کھڑا یہودیوں کو منھ چڑا رہا ہے یہ سب کب ہوا کیوں ہوا کیسے ہوا اس کا ذکر پھر کبھی سہی) کامریڈوں کی یہ حکمت عملی تھی کہ اس چوک پر مظاہروں کے ذریعے مرکزی شہر کے ایک کاروباری علاقے میں سرگرمیوں کو معطل کیا جاسکتا ہے اور اس کے اثرات دیگر کاروباری علاقوں پر بھی مرتب ہو سکتے ہیں۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ لیاری کے مکین مارشل لا اور ضیاء الحق سے شدید نفرت کرتے تھے۔ کسی بھی پولیس کارروائی کی صورت میں جب وہ پسپا ہوتے تھے تو لیاری کے لوگ خصوصاً خواتین انھیں پناہ دینے کے لیے اپنے دروازے کھلے رکھتی تھیں تا کہ کامریڈ اگلے روز دوبارہ کسی مظاہرے میں شریک ہو کر ضیائی آمریت کی "جڑیں ہلا سکیں"۔ لیکن سوال پھر بھی برقرار ہے کے ابراہیم چوک چیل چوک کیسے ہوا ؟۔اس کا جواب علاقے کے ایک مکین اور سماجی کارکن الٰہی بخش بلوچ نے کچھ یوں دیا۔ کہ پندرہ بیس سال قبل جب کراچی کی بلدیہ عظمہ نے کراچی کے مختلف چوکوں کی تزئین و آرائش کا کام شروع کیا تو ابراہیم چوک پر بھی ایک مینار بنا کر اس پر اقبال کا شاہین نصب کر دیا۔ لیکن چوں کہ علاقے کے بلوچ اقبال کے شاہین سے اتنی زیادہ واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اس شاہین کو چیل سمجھ لیا ۔ پھر اس چوک کا نام بتدریج چیل چوک پڑ گیا۔ گذشتہ سال لیاری میں آپریشن کے دوران چودھری اسلم کی قیادت میں ایک ہفتے سے زیادہ وقت تک آپریشن کرنے والے شاہین چیل چوک سے آگے نہ بڑھ سکے۔ لگتا ہے کہ لیاری میں اب بھی ایم آر ڈی کی تحریک کے وقت کے مزاحمت کاروں کی منصوبہ بندیوں پر عمل کرنے والے موجود ہیں۔ غالباً ان ہی کی حکمت عملی پر چیل چوک کے اطراف میں بلنے والے عمل پیرا ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ جمہوریت بحال کرنے کی تحریک تھی اور اب۔۔۔۔؟

ایلفی زیبی نہ بن سکی

کراچی کے دل صدر کے دل میں واقع زیب النساء اسٹریٹ جو کبھی الفنسٹن اسٹریٹ ہوتی تھی۔ تقسیم سے قبل لوگ اس سڑک کو پیار سے ایلفی اسٹریٹ بل کہ اب بھی کچھ پرانے لوگ ایلفی اسٹریٹ کے بجائے صرف ایلفی کا نام استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے استاد حسین نقی جب بھی ایلفی اسٹریٹ کا ذکر کرتے ہیں تو بلکل ایسے محسوس ہوتا ہے کہ کوئی عاشق اپنی معشوقہ کا ذکر کر رہا ہو۔ صرف حسین نقی ہی نہیں ہمارے دوست جناب عبدالحئی، اسد اقبال بٹ بھی ایلفی کا ذکر اتنی ہی محبت کے ساتھ کرتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ نام ور دانش ور سیاستدان اور ادیب پیر علی محمد راشدی کی یادداشتوں میں بھی نظر آتا ہے (وہ دن وہ لوگ مطبوعہ آج کی کتابیں مرتبہ اجمل کمال) الفنسٹن اسٹریٹ کے حوالے سے علی محمد راشدی لکھتے ہیں۔ الفنسٹن اسٹریٹ کی چھاپیں Shops دیکھ کر لوگوں میں احساس کمتری پیدا ہوتا تھا۔ میمنوں کی دو چار دکانوں کے سوا باقی سب دکانیں انگریزوں، پارسیوں اور ہندو عاملوں کی تھیں، مگر صدر کی دکانوں کا مہندار تب بھی میمن حاجی ڈوسل ہوتا تھا۔ سب سے بڑی دکان ہر قسم کا سامان، عمدہ دھاگے سے لے کر اعلیٰ درجے کی بندوقوں تک، اس ایک ہی دکان سے مل جاتا تھا۔ البتہ دکان میں داخل ہونے سے پہلے بوٹ صاف کرائے جاتے، کوٹ کے بٹن بند کیے جاتے اور داڑھی مونچھوں کو ہاتھ پھیر کر درست کیا جاتا، کیوں کہ اندیشہ ہوتا تھا کہ اندر داخل ہونے پر کسی انگریز افسر سے سامنا نہ ہو جائے، سندھیوں کو اپنے سے اونچے لوگوں کے ادب کے تقاضے ہر وقت اور ہر جگہ یاد رہتے ہیں، ڈوسل کی دکان ایک ادارہ تھی۔ سندھ کے تقریباً تمام وڈیرے، میر اور پیر اس دکان کے مقروض ہوتے تھے اور فصل کٹنے پر سال بھر کی کمائی کا بڑا حصہ انھیں ڈوسل کا ادھار چکانے میں صَرف کرنا پڑتا تھا۔ ان لوگوں کی مار بندوقوں، کارتوسوں، ولایتی بسکٹوں اور خوشبودار صابن پر ہوتی تھی اور ان جنسوں کی ڈوسل کے پاس کوئی کمی نہ تھی۔ دکان میں رکھا ہوا دوسرا سامان اکثر ان کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا، اس لیے اس کے قریب نہ پھٹکتے، کچھ چنیدہ بڑے آدمی شام کے وقت ڈوسل کی دکان کے باہر محراب دار چبوترے پر بید کی کرسیاں ڈال کر بیٹھ جاتے کہ کوئی افسر یا اس کی میم گزرے تو اٹھ کر اسے سلام کریں۔ ایک لحاظ سے ڈوسل کی دکان

کے سامنے بیٹھنا خود عزت کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔

ہور (Hoar) نامی ایک انگریز درزی کی دکان، اسی الفنسٹن اسٹریٹ پر، نئے فیشن کے دلدادہ وڈیروں کی دلچسپی کا مرکز ہوتی تھی۔ سندھی پڑھے ہوئے لوگ فقط قمیض میں بوٹائی لگانے پر اکتفا کرتے، انگریزی کے دو چار درجے پڑھے ہوئے ہوتے ہور سے سوٹ سلوا کر پہنتے، مگر انگریز اہلکاروں کے پاس اکثر سوٹ پہن کر نہ جاتے مبادا صاحب کو خیال گزرے کہ وڈیرا انگریزوں کی ہمسری کر رہا ہے۔ اس سے کچھ آگے جے بلس کی دکان تھی جہاں انگریزی دواؤں کے علاوہ اعلیٰ ترین ولایتی سینٹ، صابن وغیرہ مل سکتے تھے، فیشن ایبل لوگ وہاں کا بھی چکر لگاتے، دکان کے باہر بڑے بڑے شیشے لگے ہوئے تھے۔ زیادہ تر لوگ باہر کھڑے ہو کر شیشے میں سے اندر کا نظارہ کرتے اور کہتے واہ رے انگریز واہ! دکان یوروپی طرز میں آراستہ کی گئی تھی، ایک بار سندھ کے ایک بزرگ کوئی چیز لینے اس دکان میں داخل ہوئے۔ مریدوں کو معلوم ہوا تو وہ لاٹھیاں لے کر پہنچے اور بلس کی دکان کے شیشے توڑ کر اس کے ٹکڑے تبرک کے طور پر اپنے ساتھ لے گئے۔ بزرگ نے بلس کو اس نقصان کا معاوضہ دیا (مبادا بلس، جو انگریز تھا، سندھ کے کمشنر صاحب سے جا کر شکایت کر دے!) اور شاید یہ وعدہ بھی کیا کہ آئندہ اس دکان میں داخل نہیں ہوں گے۔ اسی طرح کی ایک دکان اسپنجلی نامی انگریز کی بھی تھی۔ وہاں بھی دوائیں اور خوشبو کا سامان ملتا تھا۔ الفنسٹن اسٹریٹ کس گورے کے نام پر ہے شروع میں ہم سمجھتے تھے کہ اس سڑک کا نام ایک انگریز وکیل کے نام پر ہے جس میں انگریز سرکار کی جانب سے خالق دینا ہال میں تحریکِ خلافت کے مقدمہ میں سرکار کی پیروی کی تھی مرزا عبدالقادر بیگ کی کتاب کراچی کا تاریخی مقدمہ (مطبوعہ سٹی پریس) میں لکھا ہے کہ گیارہ بج کر پانچ منٹ پر سٹی مجسٹریٹ صاحب، مسٹر احسن تلاتی، تشریف لائے اور اپنی مخصوص کرسی پر آ کر بیٹھ گئے ان کی آمد پر بھی اکثر لوگ تعظیماً کھڑے ہوئے، سرکار کی طرف سے مقدمہ کی پیروی مسٹر ٹی جی الفنسٹن نے کی جو پبلک پروسیکیوٹر ہیں۔

ہمارا خیال یہ تھا کہ غالباً الفنسٹن اسٹریٹ کا نام مسٹر ٹی جی الفنسٹن کے نام پر رکھا گیا تھا۔ ساجی ویب سائٹ وکی پیڈیا پر اس سڑک کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کا پرانا نام الفنسٹن اسٹریٹ ہے دراصل الفنسٹن نے برٹش گورنمنٹ کی جانب سے بمبئی پریذیڈنسی میں بہ حیثیت گورنر اپنی خدمات انجام دی تھیں۔ جب کہ کراچی بھی اس کا ہی حصہ تھا اور 1930 تک بمبئی کے ساتھ رہا۔ 1970 میں اس

شاہراہ کا نام تبدیل کر کے زیب النساء اسٹریٹ رکھ دیا گیا۔ دراصل یہ نام ایک خاتون کے نام پر رکھا گیا۔ جو 25 دسمبر 1921 کو پیدا ہوئیں۔ یہ پاکستان کی انگریزی زبان کی کالم نگار، ایڈیٹر اور پبلشرز تھیں۔ جن کے نام سے اس شاہراہ کو منسوب کیا گیا۔ تقسیم ہند سے پہلے وہ انڈیا کے متعدد اخبارات میں لکھتی تھیں اور وہ پہلی مسلمان خاتون تھیں جنھوں نے انڈین نیوز پیپر میں کالم لکھے۔ قیام پاکستان کے بعد انھوں نے کراچی کے ایک انگریزی اخبار میں لکھنا شروع کیا۔ نیز انھیں پاکستان کی پہلی خاتون پولیٹیکل کمنٹیٹر کا اعزاز حاصل ہوا۔ 1940 میں زیب النساء کی شادی محمد حمید اللہ سے ہوئی جو جوتوں کی ایک کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔

معروف مورخ عقیل عباس جعفری نے ہمیں بتایا کہ وکی پیڈیا میں غلط اطلاعات فیڈ کی جارہی ہیں اور یہ اس کی ایک چھوٹی سی مثال ہے حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ اس سڑک کا یہ نام مغل شہزادی زیب النساء کے نام پر زیب النساء اسٹریٹ رکھا گیا تھا۔ اس بات کی تفصیل روزنامہ جنگ نے ہی اپنی 26 مئی 1970 کی اشاعت میں شامل کی تھی۔ اگر اس سڑک کا نام زیب النساء حمید اللہ کے نام پر زیب النساء اسٹریٹ رکھا جاتا تو اس کا نام زیب النساء حمید اللہ اسٹریٹ ہوتا۔ صرف زیب النساء اسٹریٹ نہ ہوتا۔ عقیل عباس جعفری نے ہمیں بھی اس سلسلے میں حکم جاری کیا کہ اس معاملے کی تحقیق کریں۔ ہم نے اس کا ذکر اپنے ایک مونس دوست سے کیا۔ تو انھوں نے اس سلسلے میں ہماری مدد فرمائی اور بالآخر 26 مئی 1970 کو اس حوالے سے شائع ہونے والی خبر کا متن ہم تک پہنچ گیا۔ جو آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

''ایلفی زیبی ہوگئی'' کراچی 26 مئی (اسٹاف رپورٹر) کراچی شہر کی سب سے بارونق سڑک الفنسٹن اسٹریٹ کا نام زیب النساء اسٹریٹ رکھ دیا گیا ہے۔ آج بلدیہ کراچی کی طرف سے اس سڑک پر زیب النساء اسٹریٹ کے بڑے بڑے بورڈ نصب کر دیے گئے ہیں۔ زیب النساء کے لغوی معنی عورتوں کی زیبائش ہے۔ الفنسٹن اسٹریٹ جسے عرف عام میں ایلفی کہا جاتا ہے۔ ہمیشہ سے خواتین کی شاپنگ کا سب سے بڑا شاپنگ سینٹر رہا ہے۔ ایلفی اور اس کے قرب و جوار کے علاقوں بوہری بازار وغیرہ میں جو چہل پہل رہتی ہے وہ کسی دوسرے علاقے میں نہیں ہوتی خیال ہے کہ بلدیہ کی مقررہ کمیٹی نے جب شہر کی سڑکوں کے نام قومی رہنماؤں اور تاریخی شخصیتوں کے نام پر تجویز کیے تو خیال ہے کہ

الفنسٹن اسٹریٹ کا نام زیب النساء تجویز کرتے وقت دو خیال تھے ایک تو یہ کہ مغل شہنشاہ محی الدین عالمگیر اورنگ زیب کی بیٹی کا نام زیب النساء تھا جو انتہائی حسین ہونے کے ساتھ ساتھ فارسی کی نامور شاعرہ بھی تھی اور مخفی تخلیق کرتی تھی۔ اس کے کلام کا مجموعہ دیوان مخفی کی صورت میں موجود ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ علاقہ خواتین کی شاپنگ کا سب سے بڑا مرکز ہے اور یہاں عورتوں کی زیبائش کا ہر سامان مل جاتا ہے۔ چناں چہ کمیٹی نے اس کا نام بھی زیب النساء رکھ دیا۔ واضح رہے کہ الفنسٹن اسٹریٹ کو من چلے لوگ ایلفی کے نام سے یاد کرتے ہیں اس اعتبار سے اگر یہ لوگ ایلفی کو "زیبی" کے نام سے پکارنے لگیں تو یہ کوئی تعجب خیز بات نہ ہوگی۔

الفنسٹن اسٹریٹ کے حوالے سے پیر علی محمد راشدی اپنی یادداشتوں میں مزید لکھتے ہیں کہ کراچی کی میمنڈ موں (میموں) سے ہمارے وڈیروں کی روح فنا ہوتی تھی۔ حالاں کہ دیدار عام یہی ہوتا تھا۔ میمنڈ میں خاصی تعداد میں ہوتیں۔ صبح شام صدر کی دکانوں کی سیر کیا کرتیں۔ ان کی خاص مار الفنسٹن اسٹریٹ پر ہوتی تھی۔ جہاں ان کی ضرورت کی چیزوں کی دکانیں تھیں۔ دیہات سے آئے ہوئے وڈیرے ان سے بہت خوف کھاتے تھے۔ مبادا کسی میم صاحب سے اچانک سامنا ہو جائے اس ڈر سے بہت سے تو صدر کا رخ ہی نہ کرتے ان کی سرگرمیاں مولوی مسافر خانے، زمیندار، ہوٹل، سندھ اسلامیہ ہوٹل، جونا مارکیٹ، نیپیئر روڈ کیا ماڑی اور زیادہ سے زیادہ ہوا بندر تک محدود رہتیں۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ الفنسٹن اسٹریٹ پر جال بھائی پارسی فوٹو گرافر کی دکان میں جیکب آباد کی طرف سے دو تین طروں والے وڈیرے اپنے آدھ درجن نوکروں چاکروں سمیت گھسے کھڑے ہیں۔ خوف سے نیم جاں، منہ اترے ہوئے۔ آنکھیں وحشت ناک، بال بکھرے ہوئے۔ ہونٹ خشک، زبان تالو سے لگی ہوئی۔ جیسے بکریوں کے گلے نے بھیڑیے کی بو سونگھ لی ہو۔ وہ میرے واقف تھے۔ فوٹو گرافی کے شوق کے باعث میں بھی جال بھائی کی دکان پر اکثر جایا کرتا تھا۔ مجھے گمان ہوا شاید اپنا گروپ فوٹو کھنچوانے آئے ہیں۔ مگر اسٹوڈیو کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے ان میں سے کوئی نہ کوئی ذرا ذرا دیر بعد دروازے میں سے باہر منہ نکال کر سڑک پر دونوں سمت نظر ڈالتا اور جلدی سے لوٹ آتا۔ یہ روش مجھے کچھ عجیب معلوم ہوئی۔ میں نے جال بھائی کے بیٹے سے پوچھا۔ اس نے بتایا کہ ان بیچاروں نے پاس کی دکانوں میں چند میڈموں کو چڑھتے دیکھ لیا ہے جن سے ڈر کر یہاں آ چھپے ہیں۔ میں نے آگے

بڑھ کر بڑے وڈیرے سے پوچھا۔فوٹو کھنچوانے میں اتنی دیر کیوں لگا رہے ہیں؟

بولے: فوٹو جائے جہنم میں، ہماری جان پر بنی ہوئی ہے۔

میں نے کہا: خیر تو ہے؟

کہنے لگے: خیر کہاں؟ بازار آئے تھے، چمڑے کے صندوق، بیگ اور بستر بند خریدنے تھے۔ اچانک دیکھا کہ میمنڈ میں چلی آرہی ہیں۔ ان کے ڈر سے اس دکان میں آکر پناہ لی ہے۔ یہ میمنڈ میں رخصت ہوں تو ہم یہاں سے نکلیں۔

مگر میمنڈ موں سے آپ کو کیا ڈر ہے؟ وہ آپ کو کیا کہیں گی؟

شاہ صاحب خبر نہیں کس جورپی (یورپی) ہفیسر (آفیسر) کے گھر کی عورتیں ہیں۔ سنا ہے کمشنر کلٹر (کلکٹر) کمانی (کمانڈر) اور دوسرے بڑے ہفیسروں (افسروں) کے بنگلے پاس کے علاقے میں ہیں۔ اگر ہمارا یوں ٹولی بنا کر گھومنا کسی میمنڈم صاحب کو نہ بھایا تو ہمیں بندھا کر زیل (جیل) بھجوا سکتی ہیں۔ کاراچی (کراچی) گھومنے کے شوق میں خواہ مخواہ قید کاٹنی پڑے، اس لیے شیروں اور بھیڑوں سے دور رہنا ہی بھلا۔ یہ بات مئی 1924 کی ہے۔ مہینے بھر بعد نئے خطابوں کا اعلان ہوا۔ اس وڈیرے کو خان بہادر کا خطاب ملا۔

اب یہ فیصلہ آپ کریں کہ یہ سڑک بمبئی کے سابق گورنر الفنسٹن کے نام پر ہے یا انگریز سرکاری کے وکیل ٹی جی الفنسٹن کے نام پر ہے۔ نام تبدیل ہونے کے بعد یہ اورنگزیب کی بیٹی شہزادی زیب النساء کے نام پر ہے یا زیب النساء حمید اللہ کے نام پر ہے۔ لیکن جو بھی ہو اب یہ سڑک پیر علی محمد راشدی یا کراچی کے دیگر پرانے باسیوں کی آئیڈیل سڑک نہیں ہے اس سڑک پر عموماً ٹریفک جام رہتا ہے وہ فٹ پاتھیں جن پر کبھی انگریز میمیں اسکرٹ پہن کر گشت کرتی تھیں ان فٹ پاتھوں پر جرابیں، انڈر ویئر، بنیانیں اور پرانی شرٹیں بیچنے والوں کا قبضہ ہے۔ سڑک پر اکثر دکانیں جوتوں کا کاروبار کرنے والوں کی ہیں اور سال میں اکثر و بیشتر ان دکانوں پر رعایتی سیل بھی لگائی جاتی ہے۔ بہ ہر حال یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ سرکاری ریکارڈ میں الفنسٹن اسٹریٹ زیب النساء اسٹریٹ ہوگئی اور اس سڑک پر مختلف دکانوں پر پتہ زیب النساء اسٹریٹ ہی لکھا ہوا ہے۔ لیکن ایک نجی بینک کی برانچ پر پتہ الفنسٹن اسٹریٹ لکھا ہوا ہے۔ لوگ اب بھی اس سڑک کو اس کے سابقہ مختصر نام ایلفی سے ہی یاد کرتے ہیں یعنی

کہ ایلفی زیبی نہ بن سکی۔

کراچی میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنھیں ایمپریس مارکیٹ کے بارے میں معلوم نہ ہو۔اور وہ یہاں آئے نہ ہوں کراچی والوں کو تو چھوڑیے ملک اور سندھ کے دیگر علاقوں سے آنے والوں کے لیے ایمپریس مارکیٹ ایک عجوبے سے کم نہیں۔ مارکیٹ اور اس کے اطراف کی دکانوں پر چائے کی پتی سے لے کر پھل، سبزیاں، گوشت، پشتو گانوں کی کیسٹیں سی ڈی کی دکانیں پالتو جانور، ان کے پنجرے، کوئٹہ کانٹی نینٹل کی کڑک چائے سمیت ہر چیز دستیاب ہے۔ چائے کی پتی کی بے شمار دکانیں ہیں۔ ہر دکان پر لکھا ہوتا ہے نقالوں سے ہوشیار۔ ہماری کوئی دوسری برانچ نہیں ہے۔ مارکیٹ کے سامنے سڑک پر بنگالی خواتین ایک طویل قطار میں خشک میوے فروخت کرتے نظر آئیں گی تو سڑک کی دوسری جانب استعمال شدہ چیزیں، ٹی شرٹ اور ڈریس شرٹ فروخت کرنے والوں کا ڈیرہ ہے۔ یہاں استعمال شدہ چیزیں فروخت کرنے والے بھی اپنا کاروبار کامیابی سے چلتے ہوئے نظر آئیں گے۔ اتوار کا دن تو گویا ایمپریس مارکیٹ اور اس کے اطراف کا علاقہ غیر بن جاتا ہے۔ نیوی اور ایر فورس میں نئے بھرتی ہونے والے جوان جن کی پہچان ان کے مخصوص ہیر اسٹائل سے ہوتا ہے۔ بڑی تعداد میں یہاں خریداری کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ ایمپریس مارکیٹ کی عمارت کے باہری جانب قطار سے پانچ دکانیں ایسی ہیں جن میں دور جدید کی الیکٹریکل اشیاء انتہائی سلیقے سے سجی ہوتی ہیں۔ ان میں گھڑیاں، ٹی وی، سی ڈی پلیئر، موبائیل فون اور دیگر بہت ساری چیزیں شامل ہیں۔ یہ چیزیں فرش سے لے کر چھت تک سجی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان اشیاء کے درمیان ایک شخص قدرے اونچائی پر کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک مائیک ہوتا جس کے ذریعے وہ مختلف اشیاء کے بھاؤ بتا رہا ہوتا ہے۔ قیمتیں اتنی کم کہ دل اچھل کر حلق میں آجائے 24، انچ ٹی وی کی قیمت 50روپے سی ڈی پلیر 30 روپے کا جدید موبائل فون 20 روپے میں۔ ہے نا حیرت کی بات؟ آپ کا دل بھی للچانے لگا نہ۔ اب آپ کے قدم کسی بھی نیلام گھر پر رُک گئے۔ آپ بھی 20 روپے میں موبائیل فون لینا چاہتے ہیں۔ آپ کی طرح اور دو چار لوگ بھی نیلام گھر پر کھڑے ہیں۔ نیلام کرنے والا آپ کو متوجہ پا کر نیلامی کے اصول بتانا شروع کرتا ہے۔ سامنے ٹیبل پر تین چھوٹے ڈبے موجود ہیں جن میں مختلف اشیاء کے حوالے سے پرچیاں موجود ہیں۔ ابتدائی بولی 20، 30 یا 50 کی ہے لیکن اب آپ کا یہ مقصد ہے کہ آپ صحیح ڈبے کی

نشاندہی کریں اور اپنا انعام حاصل کریں۔ ہے نا کتنا آسان کام۔ مگر معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ اچانک آپ کے ساتھ کھڑا شخص سی ڈی پلیر کی بولی ۳۰ روپے سے شروع کرتا ہے۔ چند لمحے کی خاموشی اس کے بعد ایک اور شخص 60 روپے بولی لگاتا ہے۔ اس کے بعد تیسرا شخص 200 روپے کی بولی لگاتا ہے۔ اب یہ بولی بڑھتے بڑھتے 1500 تک پہنچ جاتی ہے۔ لیکن آپ سوچیں گے کہ 5 ہزار والی چیز 1500 میں بھی بری نہیں۔ 1500 کی بولی دینے والے کو اب انعام کے ڈبے کا انتخاب کرنا ہے اور وقت بھی محدود ہے۔ وہ شخص آپ سے اچانک سرگوشی میں التجائیہ لہجے میں پوچھتا ہے کہ کس ڈبے کا انتخاب کرے۔ آپ امتحان میں پڑ جاتے ہیں۔ لیکن چند لمحے یہ سوچنے کے بعد کہ جیت بھی ہار بھی اپنی نہیں، اُس سے آپ کہتے ہیں بیچ والا ڈبہ۔ آپ کا جواب سنتے ہی بولی لگانے والا بیچ والے ڈبے کی طرف اشارہ کر دیتا ہے۔ نیلامی والا دوبارہ اس کو خبردار کرتا ہے کہ ایک بار پھر سوچ لے ورنہ 1500 روپے گئے۔ بولی دینے والا اصرار کرتا ہے کہ بیچ والا ڈبہ ہی۔ اب جگر تھام کے بیٹھیے۔ لیں ڈبہ کھلتا ہے۔ بولی دینے والے کی لاٹری کھل گئی۔ ڈبے سے انعام کی پرچی نکل آئی۔ بولی دینے والا آپ سے گلے ملا بھرپور طریقے سے شکریہ ادا کیا اور انعام لے کر چلتا بنا۔ آپ وہیں کھڑے قسمت کو کوس رہے ہیں کہ بولی کیوں نہ لگائی۔ نیلامی دینے والے نے اب ٹی وی کی بولی شروع کر دی۔ آپ اپنے سابقہ مشورے پر پُر اعتماد ہیں۔ آپ بولی پر بولی لگا رہے ہیں۔ 10 ہزار کے ٹی وی کی بولی 3 ہزار پر رُک گئی۔ آپ نے کونے والے ڈبے کی طرف اشارہ کیا نیلامی والے نے آپ کو خبردار کیا۔ آپ اپنے موقف پر قائم رہے اور یہ کیا ڈبے میں سے انعامی پرچی نہ نکلی۔ گھبرایئے نہیں صرف آپ ہی نہیں یہ سلسلہ دوپہر سے رات دیر تک جاری رہتا ہے۔ انعام ایک ہی کا نکلتا ہے۔ جو کچھ دیر بعد دوبارہ دکان پر آ جاتا ہے۔

محمد عثمان دموہی اپنی کتاب کراچی تاریخ کے آئنے میں لکھتے ہیں کہ 1839 میں کراچی پر قبضہ کرنے والی برطانوی افواج کے سپاہیوں کے لیے کیمپ کے علاقے میں خرید و فروخت کے لیے جس بازار کی ابتدا کی گئی تھی وہ حیرت انگیز طور پر ترقی کر کے بہت جلد پورے شہر میں کیمپ بازار کے نام سے مشہور ہو گیا اور شہر کے دور دراز محلوں کے لوگ یہاں خرید و فروخت کے لیے آنے لگے۔ کراچی کی انگریز انتظامیہ نے اس بازار کی عوام میں مقبولیت کو دیکھتے ہوئے یہاں ایک عظیم الشان مارکیٹ تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس مجوزہ مارکیٹ کا ڈیزائن کراچی کے مشہور انجینئر مسٹر جیمز اسٹریچن نے تیار

کیا۔ 10 نومبر 1884 کو اس مجوزہ عمارت کا سنگ بنیاد گورنر ممبئی سر جیمز فرگوسن نے رکھا اور مسٹر جیمز اسٹریچن کی نگرانی میں اس کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔ اس عمارت کی تعمیر کا ٹھیکہ تین کنٹریکٹرز کو دیا گیا تھا جن کے نام مسٹر جے۔ ایس ایٹ فلیڈ' مسٹر ولی محمد جیون اور مسٹر ڈلو کیجو تھے۔ اس کی تعمیر پر ایک لاکھ 55 ہزار روپے سے زائد رقم خرچ ہوئی تھی۔ اس کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد 21 مارچ 1889 کو ایک رنگا رنگ تقریب میں کمشنر سندھ مسٹر پرچرڈ نے اس کا افتتاح کیا تھا۔ اور چوں کہ اس سال ملکہ وکٹوریہ کی سلور جوبلی منائی جارہی تھی' چناں چہ اس کی مناسبت سے اس کا نام ایمپریس مارکیٹ رکھا گیا تھا۔ اس کی افتتاح کے بعد کئی برس تک یہاں مقامی لوگوں کی خرید و فروخت کی اجازت نہیں تھی۔ یہ عمارت یورپین طرز تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ اسے جودھپوری سرخ پتھر سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کے ٹاور کی اونچائی 140 فٹ ہے۔ اس مارکیٹ میں چار گیلریاں ہیں' درمیان میں 130 فٹ لمبا اور 100 فٹ چوڑا کھلا صحن ہے۔ اس مارکیٹ میں 280 سٹالز کی جگہ ہے' جہاں پھل گوشت اور سبزیاں فروخت ہوتی ہیں۔ یہ عمارت اب سو سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اپنی خوبصورتی اور پختگی کے اعتبار سے بے مثال ہے۔ یہ عمارت اپنی ابتدا ہی سے کراچی کی شناخت بنی ہوئی ہے۔

واضح ہو کہ ایمپریس مارکیٹ کی تعمیر سے قبل خاص اسی جگہ پر 1857 میں انگریزوں کے خلاف بغاوت میں حصہ لینے والے اکیسویں رجمنٹ کے مقامی سپاہیوں کو نعرہ آزادی بلند کرنے کی پاداش میں گولیوں سے چھلنی کر کے شہید کر دیا تھا۔

کراچی کے معروف ماہر تعمیرات اور شہری امور کے محقق اپنی کتاب تفہیم کراچی میں لکھتے ہیں کہ 1857 کے باغیوں کو سزا آرٹلری میدان میں دی گئی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں کراچی میں ایک بہت اہم واقعہ پیش آیا۔ 1857 میں یہاں کے دیسی فوجیوں نے اس جنگ آزادی کی حمایت میں جو پورے ہندوستان پر محیط تھی، انگریزوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس بغاوت کو انگریزوں نے کچل دیا۔ اس میں حصہ لینے والے سپاہیوں میں سے ساتھ کو آرٹلری میدان میں سرعام پھانسی دی گئی اور دوسرے تین سپاہیوں کو توپ کے منہ پر باندھ کر اڑا دیا گیا۔ ایک عینی شاہدین کا بیان ہے کہ "ان لاشوں کے بچے کھچے حصوں کو بھنگیوں نے فوراً اکٹھا کیا اور ایک گاڑی میں رکھ کر کچھ دور لے جا کر ایک گڑھے میں پھینک دیا۔ اس کے بعد جن لوگوں کو پھانسی دی گئی تھی ان کی لاشوں کے مرے ہوئے

کتوں کی طرح ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے اور اسی طرح لے جا کر ان ٹکڑوں کو گڑھے میں ڈال دیا گیا۔ اور اسی طرح ایک انتہائی بھیانک اور مرعوب کن منظر ختم ہوا جو کراچی میں پھر کبھی دہرایا نہ جائے''

(1) اس واقعے کے ایک ہفتے بعد جنگ آزادی کے چودہ دوسرے سپاہیوں کو اسی طرح پھانسی دی گئی اور رام دین پانڈے کو، جو کراچی کے باغیوں کا سرغنہ تھا توپ کے منھ سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔

(2) آزادی کی خاطر لڑنے والے ان سپاہیوں کی کراچی نے آج تک کوئی قدر نہیں کی ہے۔ ان کے اعزاز میں نہ کوئی یادگار تعمیر کی گئی اور نہ کوئی سڑک ان کے نام سے منسوب کی گئی۔

محقق گل حسن کلمتی اپنی کتاب 'کراچی سندھ کی ماروئی' کے صفحہ نمبر 357 پر لکھتے ہیں۔ کہ ایمپریس مارکیٹ اسی جگہ تعمیر کی گئی ہے۔ جہاں 13 اور 14 ستمبر 1857 رات 21 ویں رجمینٹ میں بغاوت کرنے والے سپاہیوں کو توپوں کے منھ پر رکھ کر اڑایا گیا تھا۔ یہاں پھانسی گھاٹ بنا کر سپاہیوں کو پھانسیاں دی گئی تھی۔ یہاں ایمپریس مارکیٹ اس لیے تعمیر کی گئی تھی کہ شہیدوں کی کوئی یادگار نہ بنائی جائے۔ ایمپریس مارکیٹ کی تعمیر سے پہلے 1857 کے اس واقعے کے بعد سینکڑوں لوگ اس مقام کو دیکھنے کے لیے آتے تھے۔ ایمپریس مارکیٹ کی تعمیر سے قبل اس کے چاروں طرف سرخ گلاب فضاء میں جھومتے تھے۔ انگریز سرکار نے شہیدوں کے لہو کو چھپانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن شہیدوں کے لہو کی سرخی بھی ان پھولوں میں شامل ہوگئی۔ آئیں کبھی ایمپریس مارکیٹ جا کر اس کے کسی کونے پر سرخ گلابوں کا گلدستہ رکھ کر ان شہیدوں کو یاد کریں۔

لکشمی بلڈنگ اور منٹو

لکشمی ہندو دھرم میں دولت کی دیوی مانی جاتی ہے۔ لکشمی کو خوشحالی کی علامت سمجھا جاتا ہے اور اس کی پوجا بھی کی جاتی ہے۔ ہندوؤں کا یقین ہے کہ اگر لکشمی دیوی کسی سے روٹھ جائے تو وہ کنگال ہو جاتا ہے اور کہیں کا نہیں رہتا۔ لکشمی کے نام سے پاکستان میں دو عمارتیں ہیں ایک ایم اے جناح روڈ کراچی پر واقع ہے جب کہ دوسری عمارت لاہور شہر کے مشہور مال روڈ کے قریب واقع ہے۔ لاہور میں لکشمی چوک بھی ہے۔ لکشمی مینشن لاہور میں اردو کے نامور ادیب اور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو رہائش پذیر تھے۔ ان کے علاوہ سابق نگراں وزیر اعظم ملک معراج خالد اور مشہور دانشور عائشہ جلال کے والد بھی یہیں رہتے تھے۔ ملک معراج خالد اور عائشہ جلال کا خاندان اس عمارت سے کہیں اور منتقل ہو گیا۔ جب کہ منٹو صاحب کی بڑی بیٹی نگہت پٹیل اب بھی اسی عمارت کے ایک فلیٹ میں رہائش پذیر ہیں۔ ہم نے سعادت حسن منٹو کی بیٹی نگہت بشیر پٹیل سے عمارت سے وابستہ ان کی یادوں کے بارے میں گفتگو کی اور علاقے کے ایک معمر رہائشی جوہر عباس صاحب سے بھی بات چیت کی۔ جوہر صاحب اب تقریباً 100 کے پیٹے میں ہوں گے۔ وہ منٹو سے ایک لفظ ''چغد'' کے معنی جاننا چاہتے تھے لیکن ان کی خواہش ایک حسرت ہی رہی۔ وہ یہ کیوں جاننا چاہتے تھے اس کا ذکر ان سے کی گئی بات چیت میں ملے گا۔

کراچی کی لکشمی بلڈنگ کے حوالے سے مورخ عثمان دموئی اپنی کتاب کراچی تاریخ کے آئینے میں لکھتے ہیں کہ قیام پاکستان سے قبل یہ کراچی کی سب سے بلند عمارت تھی۔ یہ بندر روڈ پر عین تجارتی علاقے میں واقع ہے۔ اسے لکشمی انشورنس کمپنی لاہور نے تعمیر کرایا تھا۔ اس انشورنس کے مالک لالہ لجپت رائے تھے۔ اس کی تعمیر کے بعد اس کا افتتاح 24 دسمبر 1938ء کو برصغیر کی مشہور سیاسی شخصیت مسز سروجنی نائیڈو نے کیا تھا۔ اس عمارت کے اوپر پہلے لکشمی دیوی یعنی دولت کی دیوی کا مجسمہ نصب تھا۔ جسے قیام پاکستان کے بعد ہٹا دیا گیا تھا۔ اس عمارت کی آرکیٹیکٹ کمپنی میسرز ڈی۔ ایچ دارو والا اینڈ کمپنی کراچی تھی جبکہ کنٹریکٹر ہندوستان کنسٹرکشن کمپنی تھی۔

سعادت حسن منٹو کی سب سے بڑی بیٹی نگہت بشیر پٹیل بھی اب اپنے اس فلیٹ کو بیچ کر کہیں اور

منتقل ہونے والی ہیں۔ اس فلیٹ سے ان کے بچپن، شادی کی یادیں وابستہ ہیں۔ وہ یہ فلیٹ کیوں بیچنا چاہتی ہیں اس کا احوال انھوں نے کچھ یوں بیان کیا۔ میں آپ کو میں بتاتی ہوں جی میری پیدائش 1946 کی ہے اور 1947 کے بعد ہم لوگ یہاں آ گئے۔ اس دن سے 1947 سے میں ایک سال کی تھی جب میں اس گھر ادھر آئی ہوں اس مینشن میں آئی ہوں 1947 میں اسی گھر میں۔ ہاں جی لکشمی مینشن ابھی یہ ہے کہ اتنا ہمارے ساتھ پلنے بڑھنے والا درخت تھا وہ خود بخود ہی ایک دن گر گیا۔ مطلب اس پر کسی نے کچھ کیا نہیں۔ کوئی اس کے اوپر کسی نے یہ نہیں کیا کہ جی اس پر کوئی اندھی چلی یا کوئی کچھ ہوا۔ کچھ بھی نہیں اچانک ہی یہ اتنا بڑا یہاں درخت ہے وہ خود بہ خود ہی گر گیا۔ یہ بوہڑ کا۔ ہاں جی بوہڑ کا درخت جو ہے گر گیا۔ نہیں ڈاکٹر محمود علی ملک ہیں نہ۔ ہاں جی انھوں نے کافی کیا تھا انھوں نے تو اسے بھی میرے خیال میں انھوں نے لیا تھا پتہ نہیں کس نے لیا تھا مجھے نہیں پتہ۔ میں پتہ ہے اکیلی ہوں میرے **Husband** بیمار رہتے ہیں۔ آپ مجھے بتائیں کہ کون ساتھ دیگا۔ یا تو کوئی گورنمنٹ ساتھ دینے والی ہو یا پیچھے بیک میں آپ کو کوئی ہو تو **You Know** انسان۔ سارا کچھ ہی ہانی ہے اب کیا اب کچھ بھی نہیں رہا اب تو۔ بالکل بہت ہی اچھا ہوتا تھا۔ ہم لوگ سارے بھی جتنے یہ جو گھر اب پلازہ بن گیا جتنا یہ سارا کچھ جو ہے یہ سب یہاں گھر تھے یہاں لڑکیاں رہتی تھیں ہماری عمر کی ہم لوگ جب تھے یہاں اور اب تو ماشاءاللہ کوئی کہاں چلا گیا کوئی کہاں چلے گئے ہوئے ہیں۔ آتے ہیں کئی لوگ تو ایسے وہ کہتے ہیں کہ لوسٹ پیراڈائیز ہے ہمارا یہ۔ ہاں جی لوسٹ پیراڈائز ہے۔ مطلب **You know** اتنا اتنی ہم لوگ اسکی جتنی بھی قدر کریں اتنی کم ہے۔ مگر **You know** قدر کرنے والا اب کہاں ہیں۔ بیچ میں ہم بھی ہیں۔ "ہاہاہا" ایسے ہی "ہاہاہا" ہاں سچی کہہ رہی ہوں۔ بیچ میں اگر قدر کرنے والے ہوتے یہاں پر تو ہم بھی بیچ میں ہی ہیں۔ ہم بھی کہاں قدر کہاں کر رہے ہیں نہ۔ نہیں جی آپ کہاں! پہلے تو ہم لوگ کھیلتے بھی رہے ہیں یہاں۔ اس گارڈن کھیلتے بھی رہے ہیں۔ ہماری شادیاں۔ میری شادی، میری بہنوں کی شادیاں، ہم لوگوں کی افریقہ سے لڑکیاں آتی تھیں میری کزنز وغیرہ ان کی شادیاں یعنی کہ بے شمار شادیاں بھی ہوئی ہیں بے شمار سارا کچھ ہی ہوا ہے۔ نور جہاں تک آئی ہوئی ہیں یہاں پر میری شادی پر نور جہاں آئی تھیں۔ تو یہ بھی کہ **You Know** جی ہاں وہ آئی تھیں اور انھوں نے گایا بھی ہے۔ پھر اسکے بعد بھی ایک دفعہ اور بھی آئی تھیں۔ دو دفعہ آ چکی ہیں۔ "ہاہاہا" یہاں۔ مگر یہ ہے کہ یہاں اب تو وہ

بات ہی نہیں رہی اب تو دیکھ لیں یہاں پر دکانیں شکانیں بن گئی ہیں۔ اور ہم بھی اب انشاء اللہ میرا خیال شاید چلے ہی جائیں گے۔ ہاں جی ہاں جی ہاں جی! انہی کا ہی ہے انہی کے ساتھ ہی ہے کیوں کہ یہ۔ یہ ہے یہاں پر بابر محمود ہیں اور خالد صاحب ہیں اور یہ سب ہیں جنھوں نے یہ سب خریدا ہے ۔ پتہ نہیں دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ "ہاہاہا" پتہ نہیں ابھی تک تو کوئی خاص ایسا نہیں ہے۔ جی جی سارا کا سارا ہی پورا ہی پورا ہی۔ یہ جی پچھلے سال کی بات ہے۔ پچھلے سال میں تو انڈیا گئی ہوئی تھی مجھے تو نہیں پتہ چلا۔ میرے خیال میں جب ابا میرے والد منٹو کی جب سینٹری تھی نہ تو ہم لوگوں کو انڈیا بلایا ہوا تھا۔ تو یہ آیا ہے یہ آدمی جو خالد صاحب تھے نہ تو یہ آئے ہیں کہنے لگے کہ جی ہم لوگ کو یہ توڑنا ہے۔ تو مجھے اس وقت You know اتنا "ہاہا" وہ نہیں ہوا کہ یہ واقعی ! You know They are بچی بچی توڑنے لگے۔ اور تھوڑے دنوں کے بعد دیکھا تو توڑ دیا۔ توڑنا شروع کر دیا۔ پھر میں تو انڈیا چلی گئی ہوئی تھی۔ کافی دیر رہے۔ جب واپس آئی ہوں تو یہ کافی سے زیادہ ٹوٹ چکا ہوا تھا۔ پھر اسکے بعد سے نہ یہ ٹی 42 والے اور یہ سب آئے تھے اور آ کے نا تو انھوں نے آ کر یہ دیکھا تھا۔ اس سے پہلے میں آپ میں بتاتی ہوں کہ میں نے بڑے انٹرویوز پہلے اس سے بہت پہلے یعنی کہ یہ میں آپ کو 7,6,5 سال پہلے کی میں بات بتا رہی ہوں۔ پانچ ایک سال پہلے کی کہ میں نے کہا بھی تھا اور سب کو میں کہتی تھی کہ یہ جو ہے نہ یہ ختم ہونے والی ہے یہ جگہ مگر اس وقت میرے خیال میں کسی نے نوٹس ایسا۔ اور واقعی میں خیال نہیں ہوتا تھا۔ کیوں یہ کہ آہستہ آہستہ یہ سارا کچھ بکنا شروع ہوا ہے۔ ایک دم تو نہیں بکا۔ یہ کافی گھر تھے جیسے یہاں پر سارے گھر ہیں اسی طرح سے یہاں پر اتنے بھی بے شمار گھر تھے اور ایک ایک کر کے بکے ہیں کوئی ایک دم سے سارے اکٹھے نہیں بکے۔ ہمارے، ہمارے یہاں پر بھی کسی نے بھی ورثے والوں نے نہیں سوچا کسی نے بھی نہیں سوچا۔ ہیریٹیج والوں نے بھی۔ اندر تو آئے نہیں باہر ہی باہر رہے ہیں۔ باہر یعنی کہ جو یہ جو مینشن ہے حامد مینشن جو ہے۔ اسی کو ہی وہ ورثاء سمجھتے رہے۔ اندر کو نہیں انھوں نے سمجھا۔ نہیں خطرہ کیا۔ اب دیکھیں نہ یہاں پر آپ مجھے بتائیں یہاں کہاں کیسے رہ سکتا ہے انسان۔ آپ خود ہی بتائیں۔۔ آپ خود بتائیں کہ یہاں کیسے رہ سکتا ہے۔ اتنا۔ جب کہ دکانیں کھل جائیں گی تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہاں رہا جا سکتا ہے۔ ابھی سے ہی آپ دیکھیں یہاں کتنی گندگی ہے۔ گارڈن کو بھی ٹیک اوور کر لیا ہوا ہے۔ سارا کچھ ہے تو۔ میں تو سوچ رہی ہوں کہ! ہم لوگ تو سوچ رہے

ہیں کا کونسل کرنے کا۔ ہاں جی !! اب یہ آپ لوگ دیکھ لیں۔ کہ کیوں کہ میں نے تو۔ ہم لوگوں نے تو ہماری تینوں بہنوں نے تو سوچ لیا اوپر ہمارے گھر کے جو تھے وہ حامد جلال رہا کرتے تھے۔ اور ان کی بھی بیٹی عائشہ جلال ہیں جو کہ مطلب ایک آپ سمجھ لیں کہ پاکستان کے لیے ایک Proud ہیں۔ ہاں جی!! You have to feel Proud of the fact that she is Aysha Jalal پاکستان کی بیٹی ہے۔ تو مگر کچھ بھی نہیں ہے ایسا نہیں ہے۔ ایسا یہ۔ ملک مراد صاحب کا گھر بک چکا ہوا ہے یہ ساتھ والا گھر یہ بھی انہی کے پاس کے سب کچھ ان کے پاس ہی ہے۔ Naturaly نہ ان کا بیٹا ہی تھا جس کے بیچ دیا۔ اب ہم بھی ان کی بیٹیاں ہی ہیں نہ منٹو کی بیٹیاں ہی ہیں تو اگر ہم بیچیں گے تو ہم ہی بیچیں گے نہ اور تو کوئی نہیں بیچ سکتا نہ۔ بالکل Exactly,Exactly یہ ہی بات ہے۔ اور دوسرا یہ ہے کہ اب یہ جگہ

جب کمرشلائزڈ جب ہو جائے گی ابھی تو آپ کو پتہ ابھی تو یہ بنا رہے ہیں یہ۔ ابھی تو سال ہو گیا ہے۔ مگر یہ ہے کہ انھوں نے ابھی دیکھ لیں آپ سال سے پہلے ہی آپ دیکھ لیں تو آپ سال سے پہلے ہی یہ کافی کچھ تیار ہو چکا ہوا ہے۔ تکلیف تو ہوتی ہے No Doubte in that! اگر آپ سوچیں کہ جی جب گھر بیچنے کی جب بات آتی ہے ہاں اس وقت ضرور ہوتا ہے۔ اور اس وقت یہ ضرور ہوتا ہے۔ کہ جی اس کو توڑ دیا جائے گا۔ کیوں کہ جیسے یہ باقی سارے توڑے ہیں اس کو بھی توڑ دیا جائے گا۔ یہ بات تو ہے نہ۔ یہی ایک چیز۔ اب وہ پتہ ہے ان لوگوں کا کیا ہے خیال جو یہاں پر جو لوگ رہتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جی منٹو تو یہاں رہا ہی نہیں۔ منٹو کے نام کا یہ گھر ہی نہیں ہے۔ کیوں کہ منٹو کے واقعی نام کے گھر نہیں ہے یہ ان کی Wife کا ہے صفیہ منٹو کے نام ہے یہ گھر تو اب ہم نے اپنے نام کرا لیا تینوں بہنوں نے اور اسی طرح ہی ہے۔ بس اب وہ یہ ہی سمجھتے ہیں کہ منٹو تو یہاں رہا ہی نہیں۔ وہ تو سات سال رہا۔ تو کیا یہ صرف پتہ ہے سب کو یہاں مگر ویسے اور کچھ نہیں پتہ ان کو وہ یہ سمجھتے ہیں جی یہ منٹو کا تو گھر ہی نہیں ہے۔ ہمیں تو صرف ایک سوائے سنگ میل کے اور کسی نے نہیں رائلٹی دی۔ بالکل یہاں پر آپ کو پتہ ہے یہاں تو وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی اپنی چیز ہے نہ تو وہ ہم سے اجازت لیتے ہیں نہ ہم سے کبھی کوئی پروگرام ہوا تو کبھی تو بلا لیتے ہیں جیسے لاسٹ ایئر جو سینٹینری کے پروگرامز تھے اس پر تو واقعی بلاتے ہیں۔ یا 18 جنوری کو بلا لیا 11 مئی کو بلا لیا مگر اس کے علاوہ اگر کوئی پروگرام کریں تو کچھ بھی نہیں۔

اجازت تو خیر آپ چھوڑ ہی دیں۔ اجازت نامہ ''ہاہاہا'' اجازت لینا جو ہے۔ ہاں انڈیا والے اجازت ضرور لیتے ہیں۔ مگر ان کا کیا ہوتا ہے وہ بناتے ہیں فلم یا نہیں بناتے وہ ان کے اوپر ہے مگر اجازت ضرورت لیتے ہیں۔ ابھی بھی کوئی انھوں نے ہمارے خط و کتابت ایسوسی ایشن چل رہی ہے ابھی بھی۔ مگر یہ ہے ایٹلیسٹ وہ پوچھ لیتے ہیں۔ یہاں تو بغیر پوچھے بغیر وہ سمجھتے ہیں کہ جی اب تو ختم ہو گیا ہے۔ کیوں کہ you know After Some پتہ نہیں 50 کہ 60 year کے بعد ختم ہو جاتی ہے جو رائلٹی جو ہوتی ہے سارا کچھ۔ وہ تو پہلے سے ہی ختم تھی پہلے ہی سے نہیں تھی اب تو خیر بالکل ہی نہیں اب تو وہ جائز بات کر رہے ہیں۔ جی میں سب سے بڑی ہوں میرا نام نگہت بشیر پٹیل ہے۔ میری چھوٹی بہن جو ہے بیچ والی وہ ہے نزہت ارشد فاروق اور جو سب سے چھوٹی ہے نصرت حامد جلال۔ Sorry نصرت شاہد جلال اس کا نام ہے۔ وہ ایک تو گلبرگ میں ہے 34 ایف سی سی ہے اسکا جو بیچ والی جو ہے اور جو میری سب سے چھوٹی والی ہے جو حامد جلال کی جو بہو ہے وہ 6 شار روڈ پر۔ ہاں جی بالکل آتی تھی ہیں مگر اب انھوں نے بھی اب بند کر دیا۔ جی میں آپ کو بتاتی ہوں ابھی تو دیکھیں نہ ابھی تو اس وقت تو you know بہت ٹھیک ٹھاک ہے۔ مگر آپ شام میں کوئی ایمرجنسی ہو یا ہم نے کہیں جانا ہو یا کچھ ہو تو آپ نکل نہیں سکتے یہاں سے۔ مجھے نہیں پتہ یہ تو ان کے اوپر ہے۔ یہ جب یہ کیئر ٹیکنگ تھی نہ نجم سیٹھی جب تھے تو ان دنوں میں سلیمہ ہاشمی نے کوئی تھوڑا سا بڑھایا تھا۔ اور ان کو بھی میں نے کہا تھا میں نے کہا تھا اگر آپ نے اس کو لائبریری بنانی ہے یا What ever جو آپ کو جو کچھ بھی کرنا ہے۔ تو میں نے کہا we want to sale this place ایسا نہیں کہ Donate نہیں ہم نے کرنی۔ Government never ever given us anything ایوارڈ دیا ہے ضرور وہ بھی کتنے سالوں کے بعد اب ایوارڈ آیا ہے۔ یہ تو ایسا نہیں ہو سکتا نہ۔ اب یہ ہی ہے اب پھر اس کے بعد سے وہ چلے گئے انھوں نے سلیمہ ہاشمی نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ Nothing کچھ بھی نہیں ہوا ہاں یہ ضرور ہوا کہ کچھ لوگ آئے، اس گھر کو ناپا شاپا یہ وہ، وہ کہنے لگے کہ جی ہم اس گھر کو پینٹ کرنا چاہتے ہیں۔ میں کہا نہیں جب تک میں اس گھر میں ہوں میں نہیں پینٹ کرانا چاہتی اس کو۔ اگر آپ اس کو لے لیں گے تو جو آپ کی مرضی چاہے کریں۔

جوہر عباس صاحب بھی اس عمارت میں رہائش پذیر ہیں انھوں نے عمارت کے قیام اور منٹو

صاحب کے حوالے سے اپنی یاداشتیں بیان کرتے ہوئے ہمیں بتایا کہ۔ یہ لکشمی مینشن پہلے ایک بہت بڑی کوٹھی تھی سر شادی لال کی۔ 1930 کے قریب سر شادی لال نے یہ کوٹھی لکشمی انشورنس کمپنی کو بیچ دی۔ لکشمی انشورنس کمپنی نے یہ پوری کوٹھی توڑ کر فلیٹ بنا دیے۔ بہت خوبصورت فلیٹس تھے، اور بیچ میں گراؤنڈ بھی بنایا۔ فلیٹس کے ساتھ کوارٹرز بھی بنا دیے۔ فلیٹس میں رہائش پذیر فیملی کے ملازمین کی سہولت کے لیے کم کرائے پر۔ میں پاکستان بننے سے پہلے یہاں کا ہوں اس وقت فلیٹ کا کرایہ 62 روپے ماہ وار مقرر کیا تھا 2 روپے پانی کے اور 60 روپے کرایہ۔ اور کوارٹرز کے 5 روپے ماہ وار مقرر کیا تھا۔ جب یہ تحریک پاکستان چلی تو لکشمی انشورنس کمپنی کے مالکان کو میں ڈر لگ گیا کہ پاکستان کا قیام عمل میں آئے گا۔ تو وہ گھبرا گئے۔ لکشمی انشورنس کمپنی کے مالکان تقریباً ہندو سکھ تھے۔ تو پھر انھوں نے یہ سب فلیٹس وغیرہ بیچنا شروع کر دیے۔ ہندوؤں نے خریدے، پارسیوں نے خرید جو بک سکتے تھے وہ بیچ دیے ناقی رہ گئے۔ پھر پاکستان بن گیا اس کے بعد مہاجر آئے یہ تمام فلیٹس ان کو اور کچھ اور لوگوں کو الاٹ ہو گئے۔ یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا۔ آج سے 10 سال پہلے کچھ مہاجر بھی بیچ کے چلے گئے۔ یہاں پر خالد صاحب بھی رہ چکے ہیں ان کا ایک بھائی شفقت محمود امریکہ میں پاکستانی سفارتخانہ میں کسی اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ اب پتہ نہیں زندہ ہیں یا نہیں۔ مال روڈ پر موبائلوں کا بزنس چمک گیا اور ان کے جو مالکان تھے انھوں نے لکشمی مینشن کے لوگوں کو لالچ دینا شروع کیا تو لوگ ایک ایک کر کے بیچتے گئے۔ موبائل شاپس مالکان نے ایک سائڈ تو پورا خرید لیا اور اسے گرا کر مارکیٹ بنانا شروع کر دی تقریباً تیار ہی ہو گئی ہے۔ اب جو کوارٹرز تھے وہ بھی انھوں نے خرید لیے بس چند ایک کوارٹر باقی ہے۔ تو ان کوارٹرز کو بھی گرا کر یہاں پر بھی مارکیٹ بنا دیں۔ یہ ایک پرانی آثار قدیمہ تھے بہت پیارے، بہت خوبصورت فلیٹس تھے ہم جب اب ان کو دیکھتے ہیں تو دکھ ہوتا ہے۔ ابھی تو میرا کوئی ارادہ نہیں ہے فلیٹ بیچنے کا کیوں کہ میری یہاں پر دکان بھی ہے۔ منٹو صاحب تو میرے خاص دوست تھے میرے پاس آتے تھے۔ کیپسٹن کی سگریٹ پیتے تھے۔ جی میرا نام جوہر عباس ہے۔ اگر مجھے مجبور کیا تو طاقتور لوگوں کے سامنے ہمارا بس نہیں چلے گا۔ تو مجبوراً مجھے بھی بیچنا پڑے گا۔ میں آپ کو ایک واقعہ سناؤں کہ میں یہاں پر جوس بھی بیچتا تھا۔ تو کچھ خواتین یہاں آئیں انھوں نے لپ سٹک لگائی ہوئی تھی۔ انھوں نے یہاں جوس پیا تو گلاس پر ان کی لپ سٹک کا نشان بن گیا تھا انھوں نے گلاس رکھا اور چلی گئیں۔ پھر دو لڑکے

آئے اور انھوں نے گلاس اٹھایا اور پوچھا کہ یہ گلاس کتنے کا ہے۔ اس زمانے میں تو گلاس صرف 1 روپے کا تھا میں نے کہا کہ جی 1 روپے کا ہے گلاس۔ کہنے لگے کہ یہ گلاس ہم کو دیدو۔ میں نے کہا آپ لے لو میں اور لے لونگا میں اس کو دھو دیتا ہے۔ کہنے لگے نہیں نہیں نہیں اگر گلاس دھو دیا تو ہمارا خریدنے کا مقصد نہیں رہے گا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے نہیں دھوتا۔ پھر میں نے پوچھا آپ کیا کرو گے اس گلاس کا۔ کہنے لگے ہم اس کو اپنے ڈرائنگ روم میں رکھیں گے اور یہ جو گلاس پر لپ سٹک کا نشان ہے (چاند) اس کو دیکھتے رہیں گے۔ اور اتفاق کی بات وہاں پر منٹو صاحب بھی کھڑے ہوئے سب باتیں سن رہے تھے۔ انھوں نے سر کو جھٹکا دیا اور چغد کہتے ہوئے چلے گئے۔ بعد میں، میں نے یہ سوچا کہ مجھے لوفر ،لفنگے، اچکے کا مطلب تو آتا ہے۔ باقی چغد کا تو نہیں پتہ تھا میں نے سوچا منٹو صاحب آئیں گے تو میں ان سے پوچھوں گا کہ چغد کس کو کہتے ہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ جس دن وہ آتے تھے۔ کوئی نہ کوئی ان کا دوست آ کر چنبڑ (چمٹ) جاتا تھا، موقع ہی نہیں ملتا تھا وہ بات کرنے کا۔ اور بڑے اچھے سفید عینک لگاتے تھے موٹے چشمے کے۔ کیپسٹن کے سگریٹ پیتے تھے۔ اور کھڑے ہو جاتے تھے مگر لوگ ان سے بات کرنے کے لیے آتے تھے۔ بڑا حلقہ احباب ان کا بڑا وسیع تھا۔ اللہ تعالیٰ ان مغفرت کرے فوت ہو گئے۔ میں یہاں نہیں تھا میں گاؤں گیا ہوا تھا۔ جنوری 1955 کی بات ہے میرا خیال ہے۔ مجھے اطلاع دی ایک دوست نے میں گاؤں میں تھا تو ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ میرے ایک دوست کا گھریلو ملازم تھا غلام رسول اس نے مجھے خط لکھا اور اطلاع دی تھی کہ منٹو صاحب کا انتقال ہو گیا۔

کراچی لکشمی بلڈنگ اب لکشمی بلڈنگ کے نام سے ہی پہچانی جاتی ہے۔ جیسا کہ ماضی اور حال میں بھی یہ روایت ہے کہ کسی بھی عمارت کی تعمیر کے آغاز پر اس کے سنگ بنیاد کی تختی نسب کی جاتی ہے۔ بعد ازاں عمارت کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد اس کا افتتاح کیا جاتا ہے اور اس کی بھی تختی بھی لگائی جاتی ہے۔ ان تختیوں پر افتتاح یا سنگ بنیاد رکھنے والی شخصیات کے ناموں کے علاوہ تعمیر میں حصہ لینے والے دیگر افراد کے نام بھی درج ہوتے ہیں۔ اس کے پیش نظر ہم بھی ان تختیوں پر لکھی جانے والی عبارات کو پڑھنے کی اُمید لے کر بندر روڈ پر واقع لکشمی بلڈنگ پہنچے۔ ہم جیسے ہی عمارت کے اندر داخل ہوئے تو دو شخصیات کا سامنا کرنا پڑا ان میں سے ایک نحیف ونزار سا سیکورٹی گارڈ تھا جو ایک ٹوٹی پھوٹی کرسی پر بیٹھا گھوم رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور کرسی پر شلوار

قمیض میں ملبوس ادھیڑ عمر شخص بیٹھا تھا۔ گارڈ کی حالت سے مایوس ہو کر ہم ادھیڑ عمر شخص کی طرف بڑھے اور اس سے پوچھا کہ اس عمارت کی تعمیر سے قبل یا بعد میں افتتاح کے حوالے سے کوئی تختی ہے۔ ادھیڑ عمر شخص طنزیہ انداز میں ہنسا اور سامنے کی جانب ایک دیوار کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ تختی یہاں موجود ہے۔ ہمیں تختی کہیں بھی نظر نہ آئی بس ایک لکڑی کا فریم نظر آیا۔ ہم نے دوبارہ سوالیہ نگاہوں سے اُس کی جانب دیکھا تو اُس نے کہا فریم کے قریب جاو۔ ہم فریم کے قریب گئے تو ہمیں انگریزی میں کندہ کچھ حروف نظر آئے جنھیں پڑھنا ناممکن تھا۔ ہم نے اپنے کیمرے سے اس فریم کی تصویر بھی بنا ڈالی لیکن کیمرے کی آنکھ حروف کو اپنے دامن میں لانے سے قاصر تھی۔ ہم نے دوبارہ اس شخص سے پوچھا کوئی اور تختی؟ اس نے جواب دیا بس یہی ہے۔ اس موقع پر ہمیں حیدرآباد سندھ کے نامور شاعر اسد عزیز کی غزل کے یہ دو شعر یاد آئے:

جب نظر آنے لگے گا آپ کو
سب نظر آنے لگے گا آپ کو
اے میرے قاصد عزیز
کب نظر آنے لگے گا آپ کو

جیون کا بت خانہ ہوپ لاج اور فری میسن

جی ہاں کراچی میں بھی فری میسن ہال تھا اور اس میں سرگرمیاں بھی ہوتی تھیں۔ اگر آپ کو اس کے محل وقوع کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تو اس کا پتہ بہت آسان ہے آپ کو بس فوارہ چوک پہنچنا پڑے گا۔

اگر آپ کو فوارہ چوک کے بارے میں نہیں معلوم کہ یہ کہاں اور کس مقام پر ہے تو ہم بتائے دیتے ہیں۔ فوارہ چوک صدر کے علاقے سے گذرنے والی سڑک عبداللہ ہارون روڈ (سابقہ وکٹوریہ روڈ) پر واقع ہے۔ چوک کے ایک جانب پروٹیسٹنٹ عیسائیوں کی قدیم عبادت گاہ ٹرینٹی چرچ اور دوسری جانب گورنر ہاؤس ہے ایک طرف جعفر برادرز کی کثیر المنزلہ کشتی نما عمارت اور دوسری جانب اسٹیٹ لائف بلڈنگ کی فلک بوس عمارت موجود ہے اس چوک سے آپ اگر آرٹس کاؤنسل کی جانب جانے والی سڑک پر روانہ ہوں تو بائیں جانب سب سے پہلی عمارت انسٹی ٹیوٹ آف فارن افیئرز کی ہے۔ اس کے بعد اس کے ساتھ ہی ایک اور قدیم عمارت ہے۔

یہ عمارت کچھ پراسراری بھی لگتی ہے عمارت کے احاطے میں کچھ گاڑیاں کھڑی ہوتی ہیں جب کہ بند گیٹ سے کچھ فاصلے پر ایک کرسی پر سردیوں میں دھوپ کے مزے لیتا ہوا ایک عمر رسیدہ چوکیدار اونگ رہا ہوتا ہے۔ عمارت کے احاطے میں کچھ پرانے درخت بھی ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ گرمیوں میں ان کے سائے تلے بیٹھنے والا کوئی نہیں ہوتا اس لیے وہ بھی اداس نظر آتے ہیں یہ فری میسن ہال ہوپ لاج کی عمارت ہے مجھے نہیں معلوم کہ کراچی میں اب کتنے لوگ فری میسن تنظیم اور اس کے زیر انتظام ہوپ لاج کے بارے میں معلومات رکھتے ہیں۔ فری میسن تنظیم کے بارے میں جب ہم نے کھوجنا کی تو ان کی حمایت میں تو بہت کم لیکن مخالفت میں بہت زیادہ مواد دستیاب تھا۔ عموماً مسلمان قلم کاروں کی رائے یہ ہے کہ فری میسن دراصل یہودیوں کی پروردہ ایک تنظیم تھی لیکن تقسیم سے پہلے یہ حقیقت مختلف تھی۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس تنظیم میں تقسیم سے قبل اور بعد میں مسلمان بھی شامل ہوتے تھے۔ تقسیم سے قبل کراچی کے مسلمانوں میں ایک بڑا نام جام ایوب عالیانی کا ہے جن کا نام اب بھی عمارت کی ایک تختی پر موجود ہے۔ صرف ان کا ہی نام نہیں بل کہ دو اور مسلمانوں کے نام بھی تختی پر موجود ہیں۔

جن میں سے ایک ''ایم ایم آر شیرازی'' اور دوسرا نام ''ایم جی حسن'' ہے۔ جام ایوب صرف تنظیم کے رکن تھے لیکن یہ دونوں حضرات فری میسن تنظیم کے عہدیدار بھی تھے۔ ہندو اراکین میں ڈبلیو، ایف بھوجوانی کے پی ایڈوانی جب کہ پارسی اراکین میں ڈی ایف سیلینا کا نام تحریر ہے۔ ''سائیں جی ایم سید اپنی کتاب ''جب گذار ایم جن سین'' میں میر ایوب خان ولد جام میر خان بریسٹر کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ وہ ایک بے ریا، یار باش اور آزاد خیال خاندانی فرد تھے مجھے ان کے ساتھ میونسپلٹی، لوکل بورڈ، انجم ترقی اردو، ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن، فری میسنری، سندھ مدرسہ بورڈ اور سندھ محمڈن ایسوسی ایشن میں کام کرنے کا موقع ملا''۔ جام ایوب کا نام تو اب بھی فری میسن ہال کے بورڈ پر موجود ہے لیکن سائیں جی ایم سید کا نام نہیں ہے۔ جب کہ سائیں جی ایم سید خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ انھوں نے جام ایوب کے ساتھ مل کر فری میسن تنظیم میں کام کیا ہے یعنی کہ وہ بھی فری میسن تنظیم کے ممبر تھے۔ ہمارے دوست مورخ عقیل عباس جعفری کے مطابق مرزا اسد اللہ خان غالب بھی فری میسن تنظیم کے رکن تھے۔ اس کی تصدیق نام ور ادیب اور دانش ور جناب اجمل کمال نے بھی کی۔

جام ایوب کی فری میسن تنظیم میں شمولیت کے بارے میں ''محمد عثمان دموہی اپنی کتاب کراچی تاریخ کے آئینے میں لکھتے ہیں کہ آپ جون 1994 میں کنگ جارج پنجم کی اجازت سے ایران کے نائب کونسل مقرر ہوئے اور 1927 تک اس عہدے پر فائز رہے۔ ان دنوں کراچی میں فری میسن کی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔ وہ شہر میں اکثر کلچرل پروگرام کراتی رہتی تھی۔ آپ فری میسن کی کراچی شاخ کے اعزازی ممبر تھے۔ اس وقت دراصل اس تحریک کے مذموم عزائم عوام پر آشکار نہیں ہوئے تھے۔

13 جولائی 2011 کو عبیرہ خان روزنامہ ڈان میں شائع اپنے ایک مضموم میں لکھتی ہیں کہ فری میسن تنظیم کے آغاز کی کہانی پر اسراریت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ سے ان کی وہ خفیہ رسومات اور سرگرمیاں ہیں جو سینکڑوں برسوں سے جاری ہیں۔ ان کے زیر انتظام عمارتوں کو نمایاں کرنے کے لیے دو بڑی نشانیاں ہیں ایک تو پرکار (Compas) اور دوسرا گونیا (Square) لیکن یہ نشانیاں صرف فری میسن ہالز تک محدود تھیں اس کا جواب ہمارے فوٹو جرنلسٹ دوست اختر سومرو نے دیتے ہوئے کہا نہیں! انھوں نے ہمیں لاہور کے جنرل پوسٹ آفس کی ایک فضا سے لی گئی تصویر کی جانب مبذول

کروائی۔ اس تصویر کو غور سے دیکھنے پر فری میسن کے زیر استعمال نشانیاں بالکل واضح ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا فری میسن تحریک سے وابستہ لوگوں کا اثر ونفوذ اتنا زیادہ تھا کہ وہ لوگوں کو مجبور کرتے تھے کہ وہ عمارتوں کی تعمیر اس طرز پر کریں کہ ان کے نقشے سے فری میسن علامات واضح ہوں۔ پاکستان اور خصوصا کراچی میں قدیم عمارات ہیں۔ ان کی نقشہ سازی میں یہودی نقشہ سازوں نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

لیکن کم از کم ہمارا مشاہدہ ہے کہ کراچی کے ہوپ لاج فری میسن ہال کے علاوہ ہمیں کسی بھی دوسری عمارت پر فری میسن کی علامات نظر نہیں آئیں اگر فری میسن واقعی یہودیوں کے حقوق کی تنظیم تھی تو ان کی علامات ہمیں ان عمارتوں میں بھی نظر آنی چاہیے۔ یہودیوں کی علامات تو کچھ عمارتوں پر نظر آتی ہیں۔ لیکن یہودیوں اور فری میسن کی علامات میں کچھ فرق ہے۔

میری گذارش ہے کہ اگر کراچی کے کسی رہائشی کو یہ علامات کسی عمارت میں نظر آئیں تو مجھے ضرور آگاہ کریں۔ پاکستان میں فری میسن تنظیم کے ساتھ کیا ہوا۔ یہ ایک اور کہانی ہے۔

روزنامہ ڈان میں 19 جولائی 1973 کو شائع ہونے والی خبر جس کا عنوان ہے شہر کا فری میسن ہال قبضے میں لے لیا گیا۔ خبر کے مطابق ایک مجسٹریٹ کی سربراہی میں سندھ حکومت کی جانب سے فری میسن ہال قبضے میں لے لیا گیا اور اس میں موجود تمام دستاویزات بھی قبضے میں لے لیے۔ خبر میں مزید بتایا گیا ہے کہ کراچی میں پہلا لاج یعنی ہوپ لاج کا سنگ بنیاد 7 ستمبر 1843 کو رکھا گیا سندھ کے پہلے گورنر سر چارلس نیپیئر کو بھی فری میسن کا اعزازی رکن بنایا گیا سرکار نے یہ قدم عوام کے مطالبوں اور فری میسن تنظیم کے ایک باغی گروپ کی ایماء پر اٹھایا عام تاثر یہ ہے کہ فری میسن یہودیوں کی پروردہ اور اسلامی نظریات کے خلاف ہے۔

فری میسن تنظیم پر لگنے والی پابندی کے حوالے سے ایک ویب سائٹ پر دست یاب رپورٹ کے مطابق 16-06-1983 کو مارشل لاء ریگولیشن 56 کے تحت فری میسن کی غیر قانونی سرگرمیوں پر فوری طور پر پابندی عائد کر دی گئی۔ لیکن اس کے باوجود ان کی سرگرمیاں جاری رہیں۔ اس حکم کے تناظر میں 29-12-1985 کو ان کی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس سے قبل 1965 کے آخر میں حکومت پاکستان کی جانب سے مسلح افواج کے اراکین پر فری میسن، روٹری اور لائنز کلب کی

رکنیت لینے پر پابندی عائد کردی گئی تھی۔ 1969 میں دیگر سرکاری ملازمین پر بھی پابندی عائد کردی گئی کہ وہ ایسے کسی ادارے کے رکن نہیں بن سکتے جس کے اغراض ومقاصد سے عوام ناواقف ہوں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فری میسن تنظیم پر پہلی بار پابندی کب لگی ۔1972 میں 1973 میں یا 1983 میں۔ ہم نے اس سلسلے میں اپنے ایک وکیل دوست یونس شاد کی مدد سے مارشل لاء ریگولیشن کی وہ نقل حاصل کرلی جس کے تحت فری میسن تنظیم پر پابندی لگائی گئی تھی۔

MARTIAL LAW REGULATION

BY

CHIEF MARTIAL LAW ADMINISTRATOR

(Gazette of Pakistan, Extraordinary, Part I, 17th June 1983)

No 56

اس ریگولیشن کی دفعہ (1) کے تحت اس ریگولیشن کے اجراء سے قبل اگر اس حوالے سے کوئی اور قانون یا عدالتی فیصلہ یا معاہدہ موجود ہے تو وہ منسوخ سمجھا جائے گا دفعہ نمبر (2) کے تحت ایک تنظیم جو عموی طور پر فری میسن کے نام سے جانی جاتی ہے کالعدم قرار دی جاتی ہے اور اس کو تحلیل کیا جاتا ہے۔ دفعہ نمبر (3) کے مطابق اس تنظیم کے زیر اہتمام تمام جائیدادیں متعلقہ صوبائی حکومتوں کے قبضے میں دی جاتی ہے۔ دفعہ نمبر (4) کے مطابق اس سلسلے میں کسی بھی دعوے دار کو کوئی معاوضہ ادا نہیں کیا جائے گا۔ دفعہ نمبر (5) کے تحت تنظیم کی جانب سے کسی بھی عدالت میں کوئی درخواست دائر نہیں کی جاسکے گی۔ دفعہ نمبر (6) کے مطابق اگر صوبائی حکومتیں اس ضمن میں کوئی مشکلات محسوس کرے تو وہ وفاقی حکومت کی مدد حاصل کرسکتی ہے۔ دفعہ نمبر (7) کے مطابق اس حکم پر عمل درآمد کے حوالے سے اگر کوئی رکاوٹ ڈالے گا تو اسے 3 سال قید بامشقت جرمانے کے ساتھ اور بغیر جرمانہ کے بھگتنی ہوگی۔

مائیک بروس جو ایک عالمی غیر سرکاری ادارے کے سینئر مینیجر تھے، انھوں نے میرے دوست مظہر کے توسط سے رابطہ کیا کہ وہ فری میسن ہال دیکھنا چاہتے ہیں اور مجھ سے اس کی کہانی سننا چاہتے ہیں۔ بدقسمتی سے وقت کم تھا اور میں مصروفیت کی وجہ سے نہیں آسکا اور اپنے ایک اور ساتھی امر گرڑو سے گزارش کی کہ وہ انھیں فری میسن ہال کا وزٹ کروادیں۔ کراچی روشنیوں کا شہر اس وقت لوڈ شیڈنگ میں

ڈوبا ہوا تھا۔ جب مائیک آیا۔ موبائل کی ٹارچ کی روشنی میں میرے دوست امر نے انھیں فری میسن ہال کا وزٹ کروایا۔ جس میں بہ مشکل وہ ڈیوڈ سٹار اور ممبران کے ناموں کی تختی دیکھ پائے۔ مائیک دنگ رہ گیا کہ پاکستان کے تاریخی بیانیے narrative میں اس کی کمیونٹی کے وجود کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں جب کہ حقیقت میں ایسی تاریخی جگہیں موجود ہیں جو بتاتی ہیں کہ وہ بھی کبھی یہاں بسا کرتے تھے۔ مہینوں بعد ہم نے اسے یہ بھی بتایا کہ میوہ شاہ قبرستان کے ساتھ یہودی کمیونٹی کا ایک قبرستان بھی موجود ہے اور ایک synagogue بھی۔ اور یہ بھی کہ کراچی کی کم از کم ایک درجن عمارتوں میں کہیں نہ کہیں ہمیں Star of David نظر آتا ہے۔ مائیک بروس کی خواہش ہے کہ پاکستان میں اتنی مذہبی آزادی ہو کہ وہ آزادی سے آ کر وہ تمام عمارتیں اپنی آنکھوں سے دن دھاڑے دیکھ سکیں۔ وہ فری میسن ہال چوری چھپے دیکھنے آیا تھا۔ اس کے ادارے کی ہدایت کے مطابق وہ تاریکی ہونے کے بعد ہوٹل سے باہر نہیں نکل سکتا۔ مائیک بروس یہودی ہیں۔

محقق ناول نویس ڈین براؤن کے مطابق واشنگٹن شہر میں کانگریس لائبریری سے لے کر وائٹ ہاؤس تک تمام اہم سرکاری عمارتوں میں جا بجا Star of David اور فری میسن کی دیگر علامات موجود ہیں۔ اور تو اور ڈالر کے کرنسی نوٹ پر بھی آپ انھیں دیکھ سکتے ہیں۔ ڈین براون اور دیگر محققین کے مطابق جارج واشنگٹن فری میسن سوسائٹی کی Secreat Brotherhood کا ممبر تھا۔ یہی نہیں لیونارڈو ڈاونچی اخوان کے ممبر تھے۔ سب سے اہم بات پاپائیت کے دور میں جب مصور اور مجسمہ ساز banini کو روم شہر اور ملحقہ ویٹیکن سٹی میں مقدس مجسمے بنانے کے لیے ٹھیکہ دیا گیا تو انھوں نے اپنے بنائے ہوئے مجسموں میں خفیہ طریقے سے ایسی علامات رکھیں جو صرف یہودی مسلک سے متعلق تھیں۔ بل کہ کچھ صورتوں میں پاپائیت کے عقیدت کا مذاق بھی اُڑاتی تھی۔ Banini کے یہ مجسمے آج بھی روم اور ویٹیکن میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

بات طویل ہو رہی ہے اس عمارت کے حوالے سے ہم مزید کچھ معلومات آپ کو اگلی قسط میں فراہم کریں گے۔

بات طویل ہو رہی ہے اس عمارت کے حوالے سے ہم مزید کچھ معلومات آپ کو اگلی قسط میں فراہم کریں گے۔

مائیک بروس جو ایک عالمی غیر سرکاری ادارے کے سینئر مینیجر تھے، انھوں نے میرے دوست مظہر کے توسط سے رابطہ کیا کہ وہ فری میسن ہال دیکھنا چاہتے ہیں اور مجھ سے اس کی کہانی سننا چاہتے ہیں۔ بد قسمتی سے وقت کم تھا اور میں مصروفیت کی وجہ سے نہیں آسکا اور اپنے ایک اور ساتھی امر گرڑو سے گزارش کی کہ وہ انھیں فری میسن ہال کا وزٹ کروا دیں۔ کراچی روشنیوں کا شہر اس وقت لوڈ شیڈنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ جب مائیک آیا۔ موبائل کی ٹارچ کی روشنی میں میرے دوست امر نے انھیں فری میسن ہال کا وزٹ کروایا۔ جس میں بہ مشکل وہ ڈیوڈ سٹار اور ممبران کے ناموں کی تختی دیکھ پائے۔ مائیک دنگ رہ گیا کہ پاکستان کے تاریخی بیانیے narrative میں اس کی کمیونٹی کے وجود کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں۔ جب کہ حقیقت میں ایسی تاریخی جگہیں موجود ہیں۔ جو بتاتی ہیں کہ وہ بھی کبھی یہاں بسا کرتے تھے۔ مہینوں بعد ہم نے اسے یہ بھی بتایا کہ میوہ شاہ قبرستان کے ساتھ یہودی کمیونٹی کا ایک قبرستان بھی موجود ہے اور ایک synagogue بھی۔ اور یہ بھی کہ کراچی کی کم از کم ایک درجن عمارتوں میں کہیں نہ کہیں ہمیں Star of David نظر آتا ہے۔ مائیک بروس کی خواہش ہے کہ پاکستان میں اتنی مذہبی آزادی ہو کہ وہ آزادی سے آ کر وہ تمام عمارتیں اپنی آنکھوں سے دن دھاڑے دیکھ سکیں۔ وہ فری میسن ہال چوری چھپے دیکھنے آیا تھا۔ اس کے ادارے کی ہدایت کے مطابق وہ تاریکی ہونے کے بعد ہوٹل سے باہر نہیں نکل سکتا۔ مائیک بروس یہودی ہیں۔

محقق ناول نویس ڈین براؤن کے مطابق واشنگٹن شہر میں کانگریس لائبریری سے لے کر وائٹ ہاؤس تک تمام اہم سرکاری عمارتوں میں جا بجا Star of David اور فری میسن کی دیگر علامات موجود ہیں۔ اور تو اور ڈالر کے کرنسی نوٹ پر بھی آپ انھیں دیکھ سکتے ہیں۔ ڈین براون اور دیگر محققین کے مطابق جارج واشنگٹن فری میسن سوسائٹی کی Secreat Brotherhood کا ممبر تھا۔ یہی نہیں لیونارڈو ڈاونچی اخوان کے ممبر تھے۔ سب سے اہم بات پاپائیت کے دور میں جب مصور اور مجسمہ ساز banini کو روم شہر اور ملحقہ ویٹیکن سٹی میں مقدس مجسمے بنانے کے لیے ٹھیکہ دیا گیا۔ تو انھوں نے اپنے بنائے ہوئے مجسموں میں خفیہ طریقے سے ایسی علامات رکھیں۔ جو صرف یہودی مذہب سے متعلق تھیں۔ بل کہ کچھ صورتوں میں پاپائیت کے عقیدت کا مذاق بھی اُڑاتی تھی۔ Banini کے یہ مجسمے آج بھی روم اور ویٹیکن میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

اب بات کرتے ہیں جیون کی۔ جیون کی عمر 75 برس ہے ان کی پیدائش ہال کے احاطے میں بنے ہوئے ایک گھر میں ہوئی۔ ان کے خاندان میں ان کے والد فری میسن کے پہلے ملازم تھے۔ والد کے انتقال کے بعد ان کے بڑے بھائی ملازم ہوئے۔ جو جلد ہی وفات پا گئے۔ اس کے بعد جیون فری میسن کے ملازم ہوئے۔ جیون سے جب ہم نے بات چیت کا آغاز کیا تو جز بز کا شکار تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ بولنا شروع ہوئے ان کی گفتگو میں دکھ بھی تھا، مسرت بھی، ماضی بھی، حال بھی، لیکن پوری گفتگو کے دوران وہ ہال میں ہونے والی سرگرمیوں کے بارے میں، بہت محتاط تھے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ ان سے جو بات ہوئی اسے جو ہے جہاں ہے کی بنیاد پر لکھا جائے۔ اس میں ہم کس قدر کامیاب ہوئے اس کا فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔

(س) جیون ہمیں فری میسن ہال کے بارے میں بتائیں؟

(ج) پہلے جو آ رہا تھا نہ ہمارا انٹرویو۔ ابھی وکیل نے ہم کو منع کیا ہے۔ نہیں نہیں میں آپ کو بتاؤں نا وہ کہتے تھے، بہت ہو گیا۔

(س) آپ کی عمر کیا ہے؟

(ج) 74

(س) اسی گھر میں آپ پیدا ہوئے تھے؟

(ج) جی

(س) آپ کے والد کا کیا نام تھا؟

(ج) ویسے تو اس کو پربھو، پربھو بولتے تھے یہی نام تھا۔

(س) جیون آپ نے اپنی عمر کے 75 سال یہاں گذار دیے۔ ذرا بتایئے کے پاک انڈیا تقسیم سے قبل اور اس کے بعد یہاں کیا ہوتا تھا۔

(ج) اس وکت (وقت) جیسے کہ ایسا نہیں تھا یہاں ٹریفک نہیں تھی۔ گھوڑا گاڑی چلتی تھی۔ زیادہ تر تانگے چلتے تھے۔ بعد میں آہستے آہستے چلنے لگا۔ اب آپ اور کیا معلوم کر رہے ہیں؟

(س) میں یہ جاننا چاہتا ہوں؟ کہ یہاں کیا ہوتا تھا؟ میٹنگز ہوتی تھیں؟ پارٹیاں ہوتی تھیں؟ اور کیا ہوتا تھا؟

(ج) یہاں کوئی پارٹی وارٹی نہیں ہوتی تھی۔ یہ جو نیچے اوپر کمرے ہیں یہ ان کا آفس تھا۔ اس کے اوپر ان کا ڈرائنگ روم تھا۔ اسٹور روم تھا۔ کچن تھا۔ آگے کو لیڈیز روم تھا۔ ان لوک (لوگ) کا شام کو جو آتے تھے کھانے پینے کا پیچھے کی طرف تھا۔ تو اس وقت اتنا زیادہ کچھ نہیں تھا۔ اپنے والے بہت کم تھے۔ اپنے والے جو تھے بہت کم تھے۔ گورے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چلے گئے۔ آخر میں 6 یا 7 رہ گئے۔ یہ 1973 کی بات ہے جب۔ اصل میں کیا تھا کہ یہاں جو کوئی بھی آتا تھا پرمننٹ نہیں رہتا تھا۔ اب بڑی بڑی کمپنیوں میں کام کرتے تھے۔ وہ آتے رہتے تھے۔ اس کو چلاتے رہتے تھے۔ کوئی سیکریٹری تھا۔ کوئی ٹریزرر تھا جو کوئی بھی تھا۔

(س) بورڈ پر جام ایوب کا نام، شیرازی کا نام بھی ہے کیا یہ سب لوگ آتے تھے؟

(ج) یہ آتا ہوے گا۔ ہمارے والد صاحب کے ٹیم (ٹائم) پر۔ یہ ایسا ادارہ تھا کہ کوئی لوگ اس کو چلاتا ہی رہتا تھا۔ ہمارے جو والد صاحب تھے وہ گجر (گذر) گیا۔ تو ہمارے بڑے بھائی کو لگا دیا۔ ابھی وہ گجر (گذر) گئے تو اس کی جگہ ہم کو دیا۔ تو یہ چل رہا تھا۔ یہ مکان بھی چل رہا تھا۔ ابھی اسی مکان کے اندر ہی ہماری پیدائش ہے۔ ابھی میرے 4 بیٹے اور 3 بیٹی ہے سب یہاں رہتے ہیں۔ یہ تو ابھی ہیریٹیج والوں نے اس کی ری ہیبلی ٹیشن کے لیے کوئی سروعات (شروعات) کی تھی۔ ابھی وہ کیا کہنا چاہتے۔ یہ 1842 کی بلڈنگ تھی۔ اس وکت (وقت) کو ان کے جو یہ سیکریٹری وغیرہ تھے۔ یہ اتنی صفائی کا خیال رکھتے تھے۔ اس لیے ابھی یہ دیکھو یہ بلڈنگ ایسے کے ایسے ہی کھڑی ہے۔ 1842 بھی کتنا ٹیم (ٹائم) ہو گیا۔ اس کو ان لوگ بہت دیکھ بھال کرتے تھے۔ جو چیز ٹوٹ پھوٹ گیا۔ تو اسی وکت (وقت) اس کو ٹھیک کرا لیتے تھے۔ ابھی اس کے بعد آپ دیکھ سکتے ہیں اس کی حالت کیا ہے۔

(س) یہاں جو درخت ہیں کیا یہ وہی پرانے درخت ہیں؟

(ج) (ایک درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوے) یہ والا ابھی بہت پرانا ہے۔ سامنے ہے نا یہ جامن کا جاڑ (درخت) اس جاڑ کی بات میں بتاؤں آپ کو ہمارے جو ماموں تھے نا۔ وہ انجینئر تھے۔ ابھی ہم بمبئی گیا تھا 84 میں تو وہ ہم سے کہہ رہے تھے کہ وہ جامن کا جاڑ (درخت) ہے ہم کو یہ لگ رہا ہے کہ یہ جو پرانا جاڑ ہے 100 سال سے اوپر کا ہے۔ 74 میں تو ہم دیکھ رہا ہے تو وہ لوک

(لوگ) نے جامن کھایا ہوگا۔ تو ان کو یاد ہے۔ بولا جاڑ لگا ہوا ہے۔ میں بولا ہاں لگا ہوا ہے بولا اچھا! تو یہ جاڑ دیکھ رہے تو ابھی رہ گیا۔

(س) فری میسن والے آپ کو کیا Salary دیتے تھے؟

(ج) ہماری جو Salary تھی وہ جسے کہ ہجاروں (ہزاروں) میں ہی تھا۔ تو اس کے بعد میں وہ ہم کو ہر ایک چیز کے پیسے دیتے تھے۔ میڈیکل بولو تو فیملی میڈیکل بھی ملتا تھا۔

(س) یہاں آنے والوں میں کون لوگ تھے؟

(ج) ابھی تھے آخری میں کم رہ گئے۔ ایک سب سے پرانا تھا ایک کمپنی میں تھا۔ جس کا جیب النساء اسٹریٹ (زیب النساء اسٹریٹ) پر مکان تھا۔ وہی گورے لوگ کو بتاتا تھا کہ یہ آدمی بہت پرانا ہے۔ اس وکت (وقت) ہم لوگوں کو کوئی تکلیف نہیں تھا۔ کوئی بھی کسی قسم کی تکلیف نہیں تھی کیوں؟ ذمے داری ہم لوگ کی تھی۔ یہ تو سارا جو میدان تھا یہ کھلا ہوا تھا۔ یہاں سے فوارہ چوک تک کا۔

(س) اس کو بھوت بنگلہ کیوں کہتے تھے؟

(ج) (ہنستے ہوئے) نہیں نہیں وہ بت خانہ کہتے تھے۔ بت خانہ بہت پرانا اس وکت (وقت) ہے۔

(س) کیا لوگ یہاں عبادت کرتے تھے؟

(ج) نہیں کوئی نہیں۔ شام کو آتے تھے۔ پھر چلے جاتے تھے۔ ساڑھے 6 بجے آتے تھے۔ کھانا وانا سارا یہاں ہوتا تھا۔

(س) پینے پلانے کا بندوبست بھی ہوتا تھا؟

(ج) وہ سب انہی کا ہوتا تھا۔ او (وہ) لوگ شام کو آتے تھے پھر 8 سے 9 بجے تک کھانا کھایا پھر چلے جاتے تھے۔

(س) کیا یہاں فنکشن وغیرہ بھی ہوتے تھے؟

(ج) وہ لیڈیز نائٹ ہوتی تھی۔ شروع میں تو چھوٹے بچہ لوک (لوگ) کی اسکول بھی تھی یہاں۔

(س) لیڈیز نائٹ میں کیا ہوتا تھا؟

(ج) نہیں۔ اس میں عورتیں ہوتی تھیں۔ کھانا وغیرہ سب ہوتا تھا۔

(س) کیا آپ اندر جا سکتے تھے؟

(ج) ہم تو جا سکتا تھا۔ لیکن ہم اوپر نہیں جاتا تھا۔ ہمارا کام ہی نہیں تھا واں (وہاں)۔ وہ لوگ خود ہی جاتے تھے اور آتے تھے۔ اس کے بعد ان لوک (لوگ) کا جو خرچہ وغیرہ ہوتا تھا۔ ہفتے میں ایک دفعہ ان کا میٹنگ ہوتا تھا۔ کہ بھئی وہ فلاں تاریخ کو یہ ہوا تھا اتنا خرچہ ہوا تھا۔ اس کا سب حساب کتاب ہوتا تھا۔

(س) اس بلڈنگ کو بھوت بنگلہ، جادو نگری بھی کہتے تھے۔ کیوں؟

(ج) نہیں نہیں۔ اسے پرانے لوگ بت خانہ کہتے ہیں۔ یہاں ہمارے جو بھی رشتے دار ہیں۔ دوست ہیں۔ وہ سب ہم کو بت خانے والے نام سے جانتے ہیں۔ آپ جا کے بولو گے جیون کو ملنا ہے۔ تو سوچیں گے۔ بعد میں بولو گے۔ بت خانے والا۔ تو بولے گا۔ چلو۔ یہ اس کا گھر ہے۔ پورا یہاں سے لے کے کہیں بھی جاؤ۔ آپ کراچی جاؤ۔ لندن جاؤ۔ امریکا جاؤ۔ وہ جو ہمارے جو جاننے والے ہیں۔ وہ بت خانے والے کہتے ہیں۔

س: فری میسن پر پابندی لگنے کے بعد کیا کسی نے آپ سے رابطہ کیا؟

ج: ہاں۔ 19 جولائی 1972 کی بات ہے۔ جب پابندی لگی۔ اُس کے بعد ہم بے کار ہو گئے۔ اُس کے بعد میں فری میسن کا ایک گورا آیا تھا۔ "جے اے نمو" وہ سیکریٹری تھے یہاں۔ وہ بیچارہ آیا ہمارے پاس۔ یہ 1973 اور 1974 کے بیچ کا بات ہے۔ وہ کہنے لگا ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں۔ ہمارے سے اکاؤنٹ انھوں نے بند کر دیا ہے۔ ابھی ہم کچھ نہیں کر سکتا۔ انھوں نے ہمیں لیٹر دیا۔ جس میں لکھا تھا As per labor law آپ کچھ پیسے دیو تو میں ان کا حساب کلیر کر دوں۔ پھر اس کا کوئی جواب تو آیا نہیں۔ ابھی لیٹر ہمارے پاس ہے۔

س: کیا لوگ اب بھی آتے ہیں اور آپ سے ملتے ہیں؟

ج: ہاں ابھی دہلی سے لوگ آئے تھے۔ عورت تھی۔ بچی کے سنگ آیا تھا۔ پتا نہیں ان کو کیسے معلوم تھا کہ یہ پرانا آدمی ہے۔ اس آپ ملو۔ یہ ابھی تین سے چار سال ہو گیا ہے۔ یہاں روزانہ کوئی نہ کوئی آتے رہتے ہیں۔ ابھی پرانا بلڈنگ ہے۔

س: کیا یہ فری میسن تھے؟

ج: نہیں نہیں! ایسے ہی آتے ہیں۔ یہاں شوٹنگ بھی ہوتی ہے بہت ساری۔ یہ تو کرتے رہتے ہیں۔ ابھی آپ بولو یہ جو روڈ ہے۔ یہ آر، اے، لائن تھا سمجھا۔ رائل ایر فورس لائن Royal Air Force Line اس کو پرانا لوگ آر یا لائن بولتا تھا۔ پورا نہیں بولتا تھا۔

س: اُس وقت فری میسن کے علاوہ یہاں کیا تھا؟

ج: وائی ایم سی اے تھا۔ بہت چلتا تھا۔ اور کچھ نہیں تھا۔

س: فری میسن پر پابندی لگنے کے بعد آپ کے ساتھ کیا مسائل پیش آئے؟

ج: یہ ابھی وائلڈ لائف والوں نے 93 میں نوٹس دیا کہ گھر خالی کرو۔ ان کو معلوم تو تھا کہ پُرانا ہے۔ لیکن میرے کو لیٹر دیا۔ اس وکت (وقت) ہم نے 73 کے اندر کمشنر صاحب کو لکھا تھا۔ منسٹر کو لکھا تھا۔ مولانا کوثر نیازی ایسا ہی کوئی نام تھا۔ منارٹی منسٹر کو لکھا تھا کہ ہمارے سنگ یہ ہوا ہے۔

س: آپ انڈیا میں کہاں کے ہیں؟

ج: نہیں میں اِدھر کا ہی ہے۔ میرا باپ سورت کا تھا۔ یہ لوک (لوگ) 1904 میں آئے تھے۔ میرا ماں اُدھری ٹاٹا مل میں کام کرتا تھا۔ وہ پھر چلے آئے۔ بہت تکلیف اُٹھا کر آئے۔ کبھی کبھی ماں بات کرتا تھا۔ ہم لوک (لوگ) نے اپنے میں تکلیف اٹھا کر آیا۔ ٹرین میں بھی بیٹھے ہوئیں گے۔ تو کسی نے وہ سنگلی (زنجیر) کھینچ دی۔ گاڑی رُک گئی۔ تو وہ آگئے بولے بھائی تم نے یہ کیوں کیا۔ اور لوگ بھی بیٹھے ہوئیں گے۔ انھوں نے بولا یہ لوک (لوگ) تو سیٹ سے اُٹھا نہیں۔ پھر یہ لوگ ادھر کراچی میں آیا۔ پھر سندھ کلب میں آیا۔ ہمارے ماں باپ کا کوئی رشتے دار تھا اُدھر۔ پھر اُس کے پاس چلے گئے۔ اُدھری رہتے تھے۔ پھر ان کو کسی نے بولا بھئی کام ہے۔ فری میسن میں۔ باپ تو گجراتی پڑھے ہوے تھے۔ ابھی گورے لوک (لوگ) انگریزی بولتا ہوئیں گا۔ ہم ابھی بھی سوچتا ہے۔ میرے والد نے ان لوگوں کے سنگ کیسے گذارا ہوگا۔ کیوں کہ یہ لوگ کوئی اردو بولتا تھا نہ گجراتی بولتا تھا۔ یہ تو سارے ہی گورے تھے۔ میں ابھی تک سوچتا ہوں کہ انھوں نے کیسے ان کے سنگ دن نکالا ہوگا۔ انھوں نے 45 سال یہاں کام کیا۔ پھر وہ پیرالائز ہوگئے۔ یہ سارا علاج اور (وہ) لوک (لوگ) کرتے تھے۔ یہ پیچھے ان کو مکان کے علاوہ کمرہ بھی دیا ہوا تھا۔ تو ایسے چلا، چلا پھر بڑے بھائی لگ گئے۔ ہمارا شادی کے بعد وہ بھی (گجر) گذر گئے۔ چلو

بھائی اس کے بعد انھوں نے ہم کو بولا اِدھر کام کرو۔ ابھی ہم تو کلیئرنگ فارورڈنگ میں کام کرتا تھا۔ آٹھ دس سال کا سروس تھا۔ چھوڑ کر اِدھر آنا پڑا۔ پگھار (تنخواہ) کی وجہ سے نہیں مکان کی وجہ سے۔

یہ تھی جیون کی کتھا۔ جیون سے اب بھی مکان خالی کروانے کی کوشش جاری ہے۔ معاملہ عدالت میں ہے۔ وکیلوں کی بھاری فیس جیون پر ایک بوجھ ہے۔ جیون کے مطابق لوگ وقتاً فوقتاً بیرون ملک سے آتے ہیں۔ عمارت کا دورہ کرتے ہیں۔ اس سے بھی ملتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ لوگ فری میسن کے نہیں۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں یہ عمارت گو کہ ایک قدیم عمارت ہے۔ لیکن بیرون ملک سے آنے والوں کو اس میں کیا دلچسپی ہے۔ کراچی کے رہائشیوں کو ہی اس عمارت کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تو جو لوگ دیارِ غیر سے آتے ہیں انھیں کیسے پتہ ہے کہ اس عمارت میں جانا ہے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔ ارے ہاں! میں نے مائیک بروس کا ذکر تو کیا تھا۔ وہ این جی او کے آدمی تھے۔ لیکن دورہ فری میسن ہال کا کرنا چاہتے تھے۔ فری میسن ہال کا نیا نام اب وائلڈ لائف میوزیم ہوگا۔ میرے لیے یہ حیرت کی بات ہے کہ گاندھی گارڈن کا نام چڑیا گھر رکھ دیا اور فری میسن ہال کا نام وائلڈ لائف میوزیم۔ یہ تو خیر کوئی خاص بات نہیں جب رام باغ آرام باغ ہو سکتا ہے تو اور کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔ مسئلہ یہ ہے کہ جیون کب تک ہوپ لاج کے احاطے میں موجود اپنے گھر کو بچا پائے گا۔ اس بارے میں میں کوئی پیشن گوئی نہیں کر سکتا۔

گمشدہ گورا قبرستان اور کیپٹن ہینڈز کا بلوچ قاتل

گورا قبرستان کا نام سنتے ہی ذہن میں شاہراہ فیصل پر واقع مسیحی قبرستان کا خیال آتا ہے۔ گو کہ اس کا سرکاری نام مسیحی قبرستان ہے۔ لیکن اسے عام طور پر گورا قبرستان کے نام سے ہی جانا جاتا ہے۔ ہمارے صحافی دوست سعید جان نے بارہا ہمیں کہا کہ گورا قبرستان پر لکھنا چاہیے۔ لیکن سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ کسی عام قاری کے لیے اس میں دل چسپی کی کیا بات ہو سکتی ہے۔ قبرستان کب قائم ہوا کیوں ہوا؟ اس پر پہلے ہی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ہاں البتہ ایک بات کا ذکر ضروری ہے کہ سعید خان نے یہ بھی بتایا اس قبرستان میں پاکستان کے سابق گورنر جنرل غلام محمد کی قبر بھی ہے۔ بعد ازاں کھوج لگانے پر معلوم ہوا کہ ان کی قبر گورا قبرستان میں نہیں بل کہ اس سے متصل ایک اور فوجی قبرستان میں ہے۔ ایک دن پریس کلب میں ہمارے دوست نعمت اللہ بخاری سے ہم نے ذکر کیا کہ گورا قبرستان پر لکھنا ہے۔ جواباً نعمت بھائی نے فرمایا کس گورا قبرستان پر؟ ہم نے حیرانی سے پوچھا کس سے ان کی کیا مراد ہے؟ کراچی میں ایک ہی گورا قبرستان ہے۔ وہ مسکراتے ہوئے بولے نہیں ایک اور بھی ہے، جو بندر روڈ پر ہے۔ ابھی وہ مزید بتانا ہی چاہتے تھے کہ ان کے ایک مہمان آ گئے وہ معذرت کر کے ان کے ساتھ چلے گئے۔ لیکن ہمارے ذہن میں ایک سوال چھوڑ گئے۔ اچانک ہمارے ذہن میں چار بار ایم پی اے منتخب ہونے والے مسیحی مائیکل جاوید کا نام گونجا۔ ہمیں یقین تھا کہ مائیکل جاوید ضرور اس حوالے سے ہماری مدد کریں گے۔ اگلے روز ہم ان سے ملنے ان کی رہائش گاہ عیسیٰ نگری پہنچے میرا خیال ہے کہ عیسیٰ نگری نا صرف سندھ بل کہ پورے پاکستان میں سب سے بڑی مسیحی آبادی ہے۔ اس آبادی کا حال بھی کبھی آپ کی خدمت میں پیش کریں گے۔ مائیکل صاحب نے دوران ملاقات اس بات کی تصدیق کی کہ سب سے قدیم مسیحی قبرستان بندر روڈ پر واقع ہے۔ لیکن اب اسے مسمار کر کے اس کی جگہ ایک عمارت تعمیر کر دی گئی ہے۔ ہم نے ان سے درخواست کی کہ اگر اس حوالے سے ان کے پاس کوئی دستاویزی ثبوت ہو تو ہمیں ضرور دیں۔ انھوں نے بتایا کہ مسیحی برادری کے ایک فرد کے پاس کاغذات موجود ہیں۔ لیکن اب وہ کراچی سے لاہور منتقل ہو گیا ہے۔ وہ کوشش کریں گے کہ اس سے رابطہ کر کے وہ

دستاویزی ثبوت ہمیں دیں۔ کچھ دنوں بعد مائیکل جاوید نے ہمیں بتایا کہ وہ شخص شدید بیمار ہے اور فالج کی وجہ سے بول چال سے معذور ہے۔ یہ سن کر ہم مایوس ہو گئے اور دل میں سوچا کہ شاید ہم سعید جان کی خواہش پوری نہیں کر پائیں گے۔ ایک دن سرِ راہے ہماری ملاقات ممتاز سیال صاحب سے ہو گئی۔ ممتاز صاحب کا تعلق میر پور خاص سے ہے جو ہمارا آبائی شہر ہے۔ ممتاز صاحب ایک گونا گوں شخصیت کے مالک ہیں۔ ریونیو ڈپارٹمنٹ میں ایک بڑے عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ ہم نے ان سے اپنی اس مشکل کا ذکر کیا تو انھوں نے بھی اس بات کی تصدیق کہ پہلا گورا قبرستان ایم اے جناح روڈ پر ہی تھا۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے محکمے کے ایک ڈپٹی رجسٹرار نے KBCA اور دوسرے محکموں کی ملی بھگت سے یہ جگہ بلڈر مافیا کو لیز کر دی تھی۔ لیکن لیز ہونے سے قبل اس قبرستان کو مسمار کر کے اس پر پلازہ تعمیر کر دیا گیا تھا۔ بعدازاں متعلقہ سرکاری اہل کاروں کو برطرف کر دیا گیا تھا۔ اپنی برطرفیوں کے خلاف ان افراد نے سندھ ہائی کورٹ میں اپیل کی جو رد ہو گئی تھی۔ اس کے بعد سپریم کورٹ نے انھیں بحال کر دیا تھا۔ گمشدہ گورا قبرستان کا کچھ اتا پتہ ہمیں گزیٹئر آف کراچی میں ملا۔ یہ جے ڈبلیو اسمتھ کا مرتب کردہ ہے۔ اس گزیٹئر کی پہلی اشاعت 1919 میں اور دوسری اشاعت 2003 میں انڈس پبلی کیشن کے زیر اہتمام صفدر مہدی نے کی۔ اس گزیٹئر کے مطابق کراچی کے بارے میں مستند تاریخی دستاویزات سے معلوم ہوتا ہے کہ کراچی کا قدیم ترین قبرستان بندر روڈ کے بائیں کنارے پر بندر روڈ اور پریڈی ٹینک کے درمیان ہے۔ یہ سندھ میں کراچی کا سب سے قدیم یورپی قبرستان ہے۔ سندھ کی فتح سے قبل جب ریزرو فورسز نے پرانی کراچی کے قریب پڑاؤ ڈالا تھا۔ یہاں پر سیکنڈ گرینڈیئر ریجمنٹ BNI کے کیپٹن ہینڈرز کی قبر بھی ہے۔ سندھیوں کے ایک گروہ نے 1839 میں قتل کر دیا تھا۔ اس کے لواحقین نے سیٹھ ناؤمل کو کیپٹن ہینڈرز کے دردناک انجام کے بارے میں بتایا کہ ایک دن وہ مگر پیر (منگھو پیر) کی سیر کے لیے گھر سے نکلے لیکن وہ واپس گھر نہیں لوٹے۔ ان کی تلاش شروع کی گئی تو ان کی لاش ایک پہاڑی سلسلے کی چوٹی پر ملی کرنل اسپلر آفیسران کمانڈ نے ناؤمل سے رابطہ کیا انھوں نے اس بات کا پتہ چلا لیا کہ قاتل بدنام زمانہ مذہبی رہنما شاہ بلاول کا خلیفہ چاکر تھا (چاکر کلمتی بلوچ تھا) اس کے ماننے والے کیپٹن کے کوٹ پر لگے سونے کے بٹن چرانا چاہتے تھے۔

حیدر آباد کے پولیٹیکل ایجنٹ میر نور محمد کو اس بات پر مجبور کیا گیا۔ خلیفہ چاکر کو گرفتار کرے۔ گرفتاری کے بعد اسے کراچی بھیجا گیا۔ اس کے مقدمے کی سماعت ایک ملٹری کورٹ میں کی گئی۔ سزا کے بعد اسے اس مقام پر پھانسی دی گئی جہاں قتل ہوا تھا۔ یہ مقام نیپئر بیرکس سے دو میل دور شمال مشرقی علاقے میں تھا۔ اس مقام کو وینڈز ہل کے نام سے جانا جاتا ہے۔ معروف مؤرخ گل حسن کلمتی اپنی کتاب کراچی کے لافانی کردار میں میر چاکر خان کلمتی کو ایک حریت پسند قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق چاکر خان کو جس وقت سزائے موت دی جا رہی تھی اور ان کے چہرے پر سیاہ نقاب چڑھانے کے لیے جب ایک انگریز اہلکار آگے بڑھا تو چاکر خان نے اسے روک دیا انھوں نے پھانسی کا پھندہ اپنے گلے میں خود ڈال کر جلاد کو پیروں کے نیچے سے تختہ ہٹانے کے لیے کہا۔

خیر یہ تو ثابت ہو گیا کہ گم شدہ گورا قبرستان بندر روڈ پر ہے۔ لیکن کہاں ہے؟ اس قبرستان کی جگہ پر اقبال سینٹر کے نام سے ایک عمارت تعمیر کر دی گئی ہے۔ ہم اقبال سینٹر پہنچے وہاں انجمن تاجران کے سیکریٹری ضیاء صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ یہ نہیں معلوم یہ گورا قبرستان ہے یا نہیں لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ وہ بچپن میں یہاں کھیلتے تھے اور یہاں کچھ قبریں ہوتی تھیں بعد میں یہاں اقبال سینٹر بن گیا۔

اب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ بندر روڈ پر اقبال سینٹر کہاں ہے؟ زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس عمارت کو آپ آسانی سے تلاش کر لیں گے۔ بھئی بندر روڈ کے مین چوراہے جامع کلاتھ کے سگنل پر جہاں دل پسند مٹھائی والے کی مشہور دکان ہے یہی اقبال سینٹر ہے جو کراچی کے پہلے گورا قبرستان کی قبروں پر قائم ہے۔

نبی باغ مسجد اور گرودوارہ

عنوان پڑھتے ہی آپ سوچ رہے ہوں گے کہ کیا یہ ممکن ہے۔ جی ہاں بالکل یہ ممکن ہے۔ اس کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں نہ ہی ویب سائٹز پر اسے تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ معلومات آپ کو کسی ویب سائٹ، تاریخی یا تحقیقی کتاب یا کسی مضمون سے نہیں مل سکے گی۔ ہم اس سے قبل ایک بلاگ میں کراچی کے ایک گرودوارے رتن تلاؤ کا ذکر کر چکے ہیں۔ نامور محقق زاہد چوہدری نے اپنی کتاب سندھ مسئلہ خود مختیاری کا آغاز میں لکھا ہے کہ ''رتن تلاؤ کراچی کے سکھ گرودوارے میں بدامنی کی افسوس ناک وارداتیں ہوئیں۔ جہاں اڑھائی سو سکھ مرد، عورتیں اور بچے بمبئی جانے کے لیے مقیم تھے۔ گرودوارے کو آگ لگا دی گئی تقریباً 70 لوگ زخمی ہوئے۔ رتن تلاؤ کے علاقے سے ہم بہ خوبی آگاہ ہیں لیکن اس گرودوارے کا سراغ نہیں مل پا رہا تھا۔ ہم یہ بھی جانتے تھے کہ گرودوارہ ٹیمپل روڈ نامی کسی سڑک پر ہے لیکن تقسیم کے بعد کراچی میں سڑکوں کے نام اس تیزی سے تبدیل ہوئے ہیں کہ ٹیمپل روڈ کو تلاش کرنا بھی ایک مشکل کام تھا۔ ٹیمپل روڈ لاہور میں بھی ہے خاصا مشہور ہے۔ اس روڈ پر بھٹو صاحب کے ذاتی دوست اور ان کی حکومت کے وزیر ڈاکٹر مبشر حسن صاحب بھی رہتے تھے۔ اسی دور کے ایک اور وزیر ملک غلام نبی کی رہائش بھی اسی روڈ پر تھی اس پر کوئی مندر یا گرودوارہ ہے یا نہیں اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں یہ بات ہمیں ہمارے محسن حسین نقی نے بتائی۔ لیکن ہم جس ٹیمپل روڈ کا ذکر کر رہے ہیں وہ کراچی میں موجود ہے۔ اس روڈ پر مندر بھی ہے لیکن فی الحال یہ ہمارا موضوع نہیں، ٹیمپل روڈ اور اس پر واقع مندر کے بارے میں پھر کبھی بات کریں گے۔ ہاں تو ہماری بات ہو رہی تھی ٹیمپل روڈ پر نبی باغ اور مسجد کے بیچ گرودوارے کی۔ اس سے پہلے کہ ہم گرودوارے کے بارے میں مزید بات کریں۔ پہلے تقسیم ہند سے قبل اور بعد میں سکھوں کی آبادی اور دیگر گرودواروں اور رہائشی علاقوں کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ ''محمودیہ رضویہ اپنی کتاب کراچی ملکہ مشرق کے صفحہ نمبر 34 پر لکھتی ہیں کہ پنجابی سکھ 1930 سے کراچی آنا شروع ہوئے، بہت جلد ترقی کر گئے ترکھان، بڑھئی لوہار کا کام کرتے تھے الیکٹرک فٹ کرنا بہ خوبی جانتے۔ مکانات کی تعمیر میں

لکڑی کا کام بھی یہی کرتے تھے یعنی دروازے کھڑکی وغیرہ کی مرمت وٹھیکے داری، اونٹ گاڑی کا کام بھی سنبھالنے لگے تھے۔ لیکن یوپی اور پنجاب میں سکھوں اور مسلمانوں کے تعلقات بد سے بدتر ہو گئے۔ اس وجہ سے اگست 1947 سے یہ کراچی چھوڑ کر پنجاب جانے لگے۔ ان کا تعلق اسلامی ممالک بلوچستان، سرحد، بل کہ افغانستان عراق اور ایران سے رہ چکا ہے۔ تلاش معاش اور پیشے کی قدر دانی کی وجہ سے ان کی وہاں رسائی تھی۔ لیکن اب کچھ عرصے کے لیے یہ سلسلہ بھی بند ہو جائے گا۔" ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے وجود میں آنے سے قبل سکھ کراچی کے کن علاقوں میں آباد تھے اس بارے میں عثمان دموہی صاحب اپنی کتاب کراچی تاریخ کے آئینے کی دوسری اشاعت میں لکھتے ہیں۔" یہ لی مارکیٹ کے علاقے میں آباد تھے، نانک واڑہ کا نام ان ہی کا رکھا ہوا ہے۔ کراچی میں انھوں نے اپنا ایک اسکول اور کئی گرودوارے تعمیر کرائے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد یہ تمام ہندوستان چلے گئے تھے۔"

ایک اتوار کی صبح ہم جلدی بیدار ہو گئے۔ حلوہ پوری کھانے کے لیے ٹیمپل روڈ پر مندر کی دیوار کے ساتھ حلوہ پوری کی دکان سے ناشتہ کیا اور ریگل کی طرف چل نکلے اچانک ایک کالج پر نظر پڑی جس کا نام گورنمنٹ کالج نبی باغ ہے۔ کالج کا گیٹ کھلا ہوا تھا ہم نے سوچا چلو اندر ہو آئیں کیوں کہ سابقہ تجربات کی روشنی میں ہمیں یہ گمان تھا کہ ہو سکتا ہے اس کالج کا نام تبدیل ہو گیا ہو۔ اندر مکمل سناٹا تھا کالج کی بیرونی عمارت کے ساتھ ایک راستہ بھی تھا جو عمارت کی عقبی جانب جا رہا تھا۔ ہم اس راستے پر چل دیے ایک قدیم عمارت کے آثار نظر آئے جو بالکل ویران تھی۔ چھت گری ہوئی، کھڑکیاں ناپید ایک صاحب وہاں کھڑے ہوئے تھے۔ اور اس عمارت کے اندر خود رو جھاڑیاں کاٹ کر اپنی بکریوں کو کھلا رہے تھے۔ انھوں نے سوالیہ نظروں سے ہماری جانب دیکھا ہم نے کہا کہ کیا یہ اسکول کی پرانی عمارت ہے وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولے نہیں مگر گرودوارہ ہے پھر انھوں نے کہا آپ کون ہیں ہم نے کہا شوقیہ فوٹو گرافر ہیں اگر ان کی اجازت ہو تو کچھ تصویریں بنا لیں! انھوں نے کہا شوق سے اور گرودوارے کا شکستہ اور خستہ حال دروازہ کھول دیا ہم نے جلدی جلدی عمارت کی تصویریں ہی بنائیں جلدی اس لیے کہ تصویریں بنانے کے حوالے سے ہمارے تجربات خاصے تلخ ہیں اگلا دن پیر کا دن تھا ہم تقریباً 11 بجے کالج پہنچے پرنسپل صاحب کا معلوم کیا اور ان کے کمرے میں ان سے ملنے گئے۔ پرنسپل

صاحب کو اگر ہم نے بتایا کہ ہم قدیم تعلیمی اداروں پر لکھ رہے ہیں اگر ان کے کالج کی تاریخ مل جائے تو اس پر بھی لکھیں گے۔ان کے سپاٹ چہرے پر کوئی تاثرات نہیں تھے انھوں نے کہا کہ ہم ایک ہفتے بعد ان سے ملیں تو شاید کچھ مواد مل جائے۔ان کے ساتھ ایک اور صاحب بھی بیٹھے تھے انھوں نے فوراً اپنا تعارف کرایا اور سندھی لہجے میں بتایا کہ وہ کالج میں اردو ادب پڑھاتے ہیں۔ساتھ ہی ساتھ یہ انکشاف بھی کیا کالج پر تو لکھیں نہ لکھیں۔اس کے عقب میں موجود گرودوارہ قدیم ہے اس پر ضرور لکھیں۔پرنسپل نے ناخوش گوار نظروں سے اپنے ساتھی کی جانب دیکھا اور کھڑے ہو کر ہم سے ہاتھ ملایا اس کے معنی صاف تھے کہ ہمیں اب چلنا چاہیے۔

ہمارے ایک سکھ دوست سردار رمیش سنگھ جو اکثر پریس کلب چکر لگاتے ہیں ان کا نمبر اپنے موبائل میں فون میں تلاش کیا جو نہیں ملا۔اس کے بعد چار بار منتخب اقلیتی عیسائی ایم پی اے مائیکل جاوید سے ان کا نمبر لیا رمیش سنگھ سے رابطہ ہو گیا۔رمیش نے بتایا کہ وہ ڈہرکی آئے ہوئے ہیں ایک ہفتے بعد کراچی لوٹیں گے۔انھوں نے یہ بھی بتایا کہ گرودوارے کی تصاویر بھی ان کے پاس ہیں۔ہم نے انھیں بتایا کہ تصاویر ہم نے بھی بنالی ہیں۔میرے لیے یہ ایک ہفتہ نہیں ایک سال تھا۔خیر رمیش سنگھ کراچی واپس لوٹے ان سے مائیکل جاوید سے ملاقات ہوئی طے پایا کہ اگلی اتوار کو ہم رمیش سنگھ کے ساتھ دوبارہ گرودوارے جائیں گے۔ایک ہفتہ اور خیر۔۔ خدا، خدا کر کے اتوار کا دن آیا شام کو ہم اور رمیش سنگھ گرودوارے پہنچے کالج کے اندر بچے کرکٹ کھیل رہے تھے ہم خاموشی سے کالج کے اندر داخل ہو گئے ۔آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہم گرودوارے میں داخل ہو گئے۔رمیش سنگھ کے مطابق گرودوارے کا نام گرودوارہ رتن تلاؤ ہے۔انھوں نے بتایا کہ وہ گرودوارہ دوبارہ بحال کروانا چاہتے ہیں۔لیکن کمشنر آفس میں اس کا ریکارڈ نہیں مل رہا ہے۔"آپ سمجھ تو گئے ہوں گے کہ کیوں نہیں مل رہا" ابھی ہم بات چیت کر ہی رہے تھے ایک نوجوان پتھر کا بنا ہوا ایک نقش لے کر آیا۔جس کے بارے میں ہمیں رمیش نے بتایا کہ یہ سکھوں کا مقدس نشان ہے۔رمیش نے مزید بتایا کہ یہ نشان عمارت کے چاروں جانب لگا ہوا تھا۔ لیکن بعد میں توڑ دیا گیا۔گرودوارے کے اندر کلاس روم بھی بنا دیا گیا تھا۔تو انھوں نے گرودوارے میں لگا ہوا بلیک بورڈ بھی ہمیں دکھایا۔اس کے بعد ہم نے فرش کا ملبہ صاف کیا تو ٹائلوں سے بنا خوب صورت فرش بھی نظر آیا گرودوارے کے شکستہ آثار اب بھی نبی باغ کالج میں موجود ہیں۔لیکن باہر سے

نظر نہیں آتے کیوں کہ بیرونی حصے پر کالج کی عمارت اور عقبی حصے کے ساتھ ایک سہ منزلہ خوب صورت مسجد ہے جس پر مسجد کا پتہ رتن تلاؤ لکھا ہوا ہے۔ مسجد اور مدرسے کی دو عمارتوں کے بیچ گرودوارہ غائب ہوگیا۔ محمودیہ رضویہ کی سکھوں کی اسلامی ممالک سے بے دخلی کی خواہش اپنی جگہ اور عثمان دموہی صاحب کی معلومات اپنی جگہ سردار رمیش سنگھ کے مطابق سکھ آج بھی کراچی میں آباد ہیں۔ ان کے گرودوارے بھی ہیں جہاں وہ پوجا پاٹ کرتے ہیں۔ ایک گرودوارہ گرگرنتھ صاحب سنگھ سبھا، نارائن پورہ رنچھوڑ لائن اور دوسرا گرونانک ٹیمپل منوڑہ پر ہے۔ ان کا مزید کہنا تھا کہ 1993 کی ووٹر لسٹ کے مطابق صوبہ سندھ میں تقریباً 10 ہزار اور کراچی میں ساڑھے تین ہزار سکھ آباد تھے۔ اب یقیناً ان کی آبادی میں اضافہ ہوا ہوگا۔ اس وقت کراچی کے علاقوں رنچھوڑ لائن، لائٹ ہاؤس، (سابقہ لائٹ ہاؤس سنیما اور موجودہ لنڈا بازار) کینٹ ریلوے اسٹیشن سے ملحقہ آبادی، نارائن پورہ کمپاؤنڈ اور گلشن معمار میں آباد ہیں۔

گرو مندر کی تلاش

گرو ہندی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی استاد یا پیشوا کے ہوتے ہیں، لیکن اس کو اصل فروغ سکھ مت کی وجہ سے ہوا۔ سکھوں کے مذہبی پیشواؤں کو گرو کہتے ہیں جیسے سکھ مت کے بانی بابا گرو نانک اردو ڈکشنری بورڈ کی مطبوعہ اردو لغت کے مطابق سکھ مذہب کی کتاب کو گرو پرنالی کہتے ہیں۔ اسی طرح ان کی مذہبی عبادت گاہ کو گردوارہ کہتے ہیں۔ سکھوں کی مذہبی کتاب کا عام فہم نام گرو گرنتھ ہے۔ گرودیو بھی ایک نام ہے یعنی بڑا گرو۔ اردو اور ہندی میں گرو گھنٹال کا چلن بھی عام ہے جو عموماً منفی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ تو ہو گئے لفظ گرو کے معنی اور مختلف استعمال کراچی میں بسنے والے لاکھوں افراد میں شاید ہی کوئی فرد ایسا ہو جسے گرو مندر کے محل وقوع کا علم نہ ہو یا وہ کبھی اس چوک سے گذرا نہ ہو۔ ہمارا شمار بھی ان لاکھوں افراد میں کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے دل میں ہمیشہ ایک خواہش رہی کہ گرو مندر کا چوک تو دیکھا ہوا ہے۔ کبھی گرو مندر بھی ہو آئیں۔ جب بھی مزار قائد کے سامنے واقع قائد اعظم اکادمی سے کسی دستاویز کی فوٹو اسٹیٹ کروانی ہوتی تو گرو مندر چوک پر فوٹو اسٹیٹ کے لیے جاتے۔ چوک کے اطراف میں ایک بہت بڑی مسجد جسے سبیل والی مسجد کہا جاتا ہے موجود جب کہ دائیں جانب ایک گول ٹائپ مارکیٹ ہے جس میں ایک یتیم خانہ، پوشیدہ سی گوشت اور سبزی مارکیٹ ہے۔ لیکن مندر کہیں نہیں۔ ہمارے پاس موجودہ جمشید ٹاؤن کا ادھورا اور سابقہ جمشید کوارٹر کا 1971 کا مکمل نقشہ بھی موجود ہے۔ لیکن اس نقشے میں بھی کہیں گرو مندر نظر نہیں آیا۔ یہ نقشہ لے کر ہم اپنے ایک دوست صحافی کفیل فیضان کے توسط سے جمشید ٹاؤن کے دفتر پہنچے اور وہاں شعبہ تعلقات عامہ کے فرحان صاحب سے ملاقات کی انھوں نے نقشہ دیکھنے سے قبل ہی یہ بتا دیا کہ اب تک کہ ریکارڈ کے مطابق گرو مندر چوک تو ہے لیکن گرو مندر نہیں ہے ہاں البتہ گرو مندر سے سولجر بازار کی جانب جاتے ہوئے ایک مندر ہے اس مندر کے بارے میں بھی معلوم تھا مندر کا نام؟ ہمارے ایک صحافی دوست نے بتایا کہ سبیل والی مسجد کے ساتھ ایک گلی میں گرو کا مندر ہے۔ خیر ہم اور ہمارے ساتھی ولید احسان اگلے دن گرو مندر پہنچے۔ سبیل والی مسجد کی عقب والی گلی جو انتہائی چھوٹی سی ہے دو افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سے مندر کا پتہ پوچھا تو انھوں نے گرو مندر

چوک پر گول مارکیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انتہائی اعتماد کے ساتھ کہا کہ مندر مارکیٹ کے درمیان میں ہے۔خیر مارکیٹ کے مرکز میں پہنچے وہاں کوئی مندر نہیں تھا۔وہاں موجود ایک صاحب سے معلوم کیا تو انھوں نے ہمیں بتایا کہ مندر یہاں نہیں بلکہ پیپلز سیکریٹیریٹ سے متصل سڑک جو کشمیر چوک کی جانب جارہی ہے۔اس پر تھوڑا سا آگے جا کر دائیں جانب ایک پیٹرول پمپ ہے اس کے ساتھ ہی گرومندر ہے۔ہم فوراً اس جانب چل دیے۔وہاں پیٹرول پمپ پہنچے۔وہاں پر موجود ایک صاحب سے مندر کے بارے میں دریافت کیا تو پہلے انھوں نے ہمیں سولجر بازار والے مندر کے بارے میں بتایا ہم نے ان سے درخواست کی اس مندر کا ہمیں پتہ ہے لیکن وہ گرومندر نہیں ہے۔چند لمحوں کے لیے وہ سوچ میں ڈوب گئے۔پھر انھوں نے بادل نخواستہ پان تھوکتے ہوئے کہا بھائی جان اسلامیہ کالج کے سامنے گولہ دیکھا ہے۔ہم نے کہا گولہ وہ پھر بولے گولہ ہم نے حیران ہو کر کہا کون سا گولہ وہ بولے دنیا کا گولہ بات ہماری سمجھ میں آرہی تھی ان کا اشارہ داؤد انجینئرنگ کالج کے سامنے لگے ہوئے دنیا کے نقشے کی طرف تھا۔ہم نے اقرار کیا کہ ہاں گولے پر پہنچ گئے پھر وہ بولے تین سے چار گلیاں کراس کر کے الٹے ہاتھ پر ایک گلی آئے گی۔اس میں داخل ہو جائیں سامنے مندر ہے۔اب داؤد انجینئرنگ کی مخالف سمت پر موجود سڑک پر پہنچے ایک گلی وہاں تو ہر گلی میں رکاوٹیں لگی ہوئی تھیں۔خیر ایک گلی سے علاقے میں داخل ہوئے 3 سے 4 گلیاں کراس کرنے کے بعد ہمیں ایک مندر نظر آ گیا۔مندر کو دیکھتے ہی سکون کا سانس لیا۔مرکزی دروازے پر ایک تختی آویزاں تھی جس پر انگریزی میں یہ تحریر لکھی ہوئی تھی:

IN MEMORY OF

THE LATE SETH SHIVJIBHAI THAKURSIBHAI

JEWELLER

HIS SON SONI HIRJIBHAI SHIVJIBHAI J.P.

HAS DONATED THE COST OF THIS COMPOUND WALL

..................................&..................................

THE TILING IN TEMPLE & COMPOUND OF THE

SHREE SHIVIBHAI SHIVALAYA A.D.1943

V.S.2000 دروازہ اندر سے بند تھا چاروں جانب خاموشی تھی گھنٹی بجانے پر اندر سے ایک

خاتون کی آواز آئی کون؟ ہم نے مشرقی روایات کے مطابق معلوم کیا کہ گھر میں کوئی مرد ہے اندر سے آواز آئی نہیں، کیا بات ہے؟ ہم نے کہا مندر کے بارے میں کچھ معلوم کرنا ہے۔ خاتون نے کہا ان کے شوہر اس وقت گھر میں نہیں ہیں دیر سے آئیں گے ہم نے کہا کہ ان کا موبائل فون نمبر دے دیں۔ وہ بولیں میں لے کر آتی ہوں۔ کچھ دیر بعد ان کی آواز آئی بھائی نمبر میرے پاس نہیں ہے۔ آپ صبح 8 بجے آجائیں۔ ان سے ملاقات ہوجائے گی۔ یا پھر ہفتہ کے دن آجائیں اس دن ان کی چھٹی ہوگی۔ گرومندر تلاش کرنے کی ہماری امید مندر پر لگی تختی پڑھ کر دم توڑ چکی تھی مندر پر لگی تختی پر صاف لفظوں میں لکھا تھا "شری شیوبائی شیوالا" یعنی یہ گرومندر نہیں بلکہ "شیو" کا مندر تھا۔ ہم مایوس ہوکر واپس جانے لگے۔ اس پورے عمل کے دوران ملیشیا لباس میں ملبوس ایک سیکیورٹی گارڈ ہمارے آس پاس منڈلاتا رہا۔ جب ہم واپس لوٹنے لگے تو اس نے ہماری آمد کا مقصد دریافت کیا جو ہم نے اسے بتایا کہ ہم گرومندر کی تلاش میں نکلے ہیں۔ ان کا چہرہ اچانک روشن ہوگیا۔ وہ بولے کہ 10 سے 12 سال پہلے یہاں کچھ ہندو خواتین آتی تھیں لیکن اب نہیں آتیں۔ ان کی گفتگو کا اگلہ مرحلہ انتہائی خوف ناک تھا۔ خاں صاحب بولے یہ عورت جس سے تم ابھی بات کیا ہے اس کا ایک بھائی ڈی ایس پی (پی) ہے دوسرا کسٹم میں ہوتا ہے۔ ادھری اگر ان لوگ کا شک ہوجائیں گا تو رینج رز (رینجرز) آجائے گا ابھی دیکھو ام (ہم) اتنا ٹیم (ٹائم) سے ادھری (ادھر) گارڈ ہے۔ فولیس (پولیس) کو اگر بتاوے گا ادھر وارادات (واردات) ہوا ہے نئ (نہیں) آئے گا۔ مگر خدا قسم یہ ہندو ایک فون کرے تو ابھی آجائے گا۔ ہم نے ان کی بات سن کر ان سے صدر جانے کا راستہ پوچھا جو انھوں نے ہم کو بتایا یوں ہم پریس کلب کی جانب روانہ ہوگئے۔ پریس کلب پہنچنے کے بعد جب ہم نے اپنے دوست ماہر تعلیم پروفیسر کرن سنگھ سے اس مندر کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا کہ "شیوالا" مندر کو بھی کہتے ہیں اور "شیو" کے مندر کو بھی کہتے ہیں۔ کراچی پورٹ ٹرسٹ کے احاطے میں واقع ایک مندر کے پجاری وجے مہاراج سے جب ہم نے گرومندر کی بابت معلوم کیا تو انھوں نے بتایا کہ گرومندر چوک تو ضرور ہے لیکن اس علاقے میں گرومندر نامی کوئی مندر نہیں ہے۔

ہفتے کے دن میں اپنے ایک ساتھی عبدالوہاب حسن کے ساتھ مذکورہ مقام پر پہنچا اس وقت دن کے تقریباً 12 بج رہے تھے گھنٹی بجانے پر ایک صاحب نے دروازہ کھولا اور اس کے بعد دونوں ہاتھ جوڑ کر ہمیں خوش آمدید کہا۔ ہم نے کہا کہ ہم مندر کے بارے میں کچھ معلومات لینے آئے ہیں۔ انھوں نے

دوبارہ ہاتھ جوڑے اور کہا آجائیے ہم اندر داخل ہوگئے وہ خود مندر کے فرش پر بیٹھ گئے اور ان کے ساتھ ایک ملاقاتی بھی تھا۔ ملاقاتی کی طرف ہاتھ جوڑ کر معذرت کی اور دوبارہ ہماری جانب ہاتھ جوڑ کر ہمیں ایک بار پھر خوش آمدید کہا اور اس کے بعد اپنے بیٹے کو آواز دی کہ مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے ''رِلّی'' (ایک سندھی چادر جو عموماً مہمانوں کو بیٹھانے کے لیے فرش پر بچھائی جاتی ہے) لانے کے لیے کہا لیکن ہم جب تک مندر کے فرش پر بیٹھ گئے تھے اس لیے ان کا بیٹا ہمارا منہ ہی تکتا رہا۔ سنتوش صاحب نے ایک بار پھر ہاتھ جوڑ کر ہمارے آنے کا مقصد معلوم کیا۔ ہم نے انھیں بتایا کہ ہم ''گرومندر'' کی تلاش میں آئے ہیں۔ وہ مسکرائے اور کہا گرومندر چوک تو ہے لیکن گرو کا مندر کہاں ہے یہ کسی کو معلوم نہیں۔ اپنے مندر کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ 1992 میں جب بابری مسجد کو مسمار کیا گیا تو اس کے رد عمل میں اس مندر کو بھی مسمار کر دیا گیا یہاں کہ پجاری کشن چند نے بہ مشکل اپنی جان بچائی اور یہاں سے بھاگ نکلا ہم نے ان سے دریافت کیا کہ یہ مندر شیوالا کیوں ہے تو انھوں نے بتایا کہ شیوالا اس مندر کو کہتے ہیں تو شیو کا مندر ہو لیکن اس میں گئو (گائے) بھی موجود ہوں۔ مندر کے ساتھ والا جو پلاٹ آپ دیکھ رہے ہیں جس پر اب ایک کار شوروم والے کا قبضہ ہے دراصل یہاں پر گائے باندھی جاتی تھی اور ان کے لیے پانی پینے کا بندوبست بھی ہوتا تھا۔ لیکن بابری مسجد کے واقعے کے بعد یہ حصہ مندر سے جدا کر دیا گیا اب وہاں کاروں کا شوروم ہے۔ سنتوش نے مزید بتایا کہ انھیں اس بات کا کوئی علم نہیں ہے کہ مندر کے اس حصے کو اپنے نام کرنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا۔ ہم نے ان سے پوچھا کیا یہ ''گرومندر'' ہے تو وہ ہاتھ جوڑ کر ایک بار پھر مخاطب ہوئے کہ یہ گرو کا مندر نہیں ہے۔

کافی دنوں بعد ہم اپنے فوٹو جرنلسٹ دوست آصف حسن (جو ایک مظاہرے کی کوریج کرتے ہوئے گولی لگنے سے شدید زخمی ہو گئے تھے) کی عیادت کے لیے آغا خان اسپتال گئے وہاں سے واپس لوٹتے وقت ہمارے دوست فوٹو جرنلسٹ اختر سومرو ہمارے ہم راہ تھے ہم نے ان سے کہا کہ گرومندر ہوتے ہوئے چلتے ہیں وہ ہمارے ساتھ ہو لیے ''گرومندر'' پہنچ کر ہم نے ایک بار پھر لوگوں سے مندر کا پتہ دریافت کیا مگر لوگ ''گرومندر'' کے وجود سے انکاری تھے۔ ہم سبیل والی مسجد کے پچھلی گلیوں کی جانب گئے۔ ہم آگے بڑھ رہے تھے کہ اچانک اختر سومرو صاحب نے رکنے کو کہا ہم رک گئے۔ انھوں نے گلی کے درمیان پہنچ کر بتایا کہ ایک بار ہنگاموں کے دوران ٹھیک اسی مقام پر ہمارے ساتھی فوٹو

جرنلسٹ نعیم الحق کی موٹر سائیکل نذرِ آتش کی گئی تھی اس جگہ کا دیدار کر کے ہم دوبارہ لوٹنے لگے تو ایک بار پھر اختر سومرو کی آواز آئی رکو ہم نے کچھ جھنجھلا کر کہا اب کیا ہوا انھوں نے گلی کے کونے پر واقع ایک بنگلے کے کھلے گیٹ کی طرف اشارہ کیا بنگلے کے اندر عمارت کی پیشانی پر انگریزی میں کچھ لکھا تھا۔ ہم خاموشی سے بنگلے میں داخل ہو گئے بنگلہ بالکل سنسان تھا قریب جا کر دیکھا تو انگریزی میں یہ عبارت لکھی تھی۔

GUR MANDAR

ہم نے فوراً تصویریں بنانی شروع کر دیں۔ ابھی ہم تصویریں بنا ہی رہے تھے کہ بنگلے کے اندر ایک کونے پر بنی ایک بدوضع مختصر سی دو منزلہ عمارت جو تجاوزات لگ رہی تھی کہ اچانک اس کی بالائی منزل کی ایک کھڑکی کھلی جس میں سے ایک خاتون کا چہرہ نمودار ہوا اور وہ چلا چلا کر کہنے لگی۔ گھر کی تصویریں کیوں بنا رہے ہو؟ اس کے ساتھ ہی ایک اور خاتون کا چہرہ ہمودار ہوا اور وہ بھی اسی طرح چلانے لگی۔ چند لمحوں بعد ایک خونخوار چہرے والے بڑے سے منھ والے صاحب کا چہرہ نمودار ہوا اور وہ بھی اسی طرح چلانے لگے اور کہنے لگے کس کی اجازت سے آئے ہو۔ ہم کراچی کی قدیم عمارتوں کی تصویریں بناتے ہوئے بارہا ایسی صورت حال کا شکار ہو چکے ہیں اور کبھی کبھار اس کے نتائج بہت سنگین ہوتے ہیں ہم نے وہاں سے نکلنے میں عافیت جانی۔ گو کہ ہمارا دل چاہ رہا تھا کہ بنگلے کا مکمل معائنہ کیا جائے اور مزید تصویریں بنائی جائیں۔ بہ ہر حال ایک بات تو ثابت ہوئی کہ یہ گرومندر نہیں بلکہ "گرمندر" ہے۔ "گرمندر" کی عمارت پر ماربل کی ایک تختی کے علاوہ ظاہری طور پر مندر کی علامات نظر نہیں آتیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ "گرمندر" ہے یا "گرومندر" اس کا گرو بہت ہی پراسرار اور طاقت ور ہے۔ "گرمندر" یا "گرومندر" کا نام بدلنے کی دو بار بڑے بھرپور انداز میں کوشش کی گئی۔ پہلی بار 1992 میں جب بھارت میں بابری مسجد کا تنازعہ کھڑا ہوا تو اس وقت اس چوک کا نام بابری چوک رکھا گیا اور چوک کے آس پاس کی دیواروں پر بابری چوک لکھ دیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود یہ "گرومندر" ہی رہا۔ 30 مئی 2004 کو جامعہ بنوریہ کے مہتمم مفتی نظام الدین شام زئی کے قتل کے بعد اس چوک کا نام شام زئی چوک کر دیا گیا۔ لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے یہ "گرومندر" ہی رہا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ "گرمندر" یا "گرومندر" کے "گروجی" اتنے طاقت ور ہیں کہ انھوں نے خود سے منسوب چوک کا نام بدلنے کی تمام کوششیں ناکام کر دیں۔ یہ چوک آج بھی گرومندر چوک ہے۔

ہندو جم خانہ 18 ایکڑ سے 1 ایکڑ تک

ہندو جم خانہ کے لیے 1921 کو 39,178 گز سے 4816 گز تک زمین لیز کی گئی۔ یہ زمین تقریباً 18 ایکڑ بنتی ہے۔ لیز کی مدت 100 سال تھی جو 2020 کو ختم ہو جائے گی۔ ہمارا اکثر تقریبات کے سلسلے میں ہندو جم خانہ جانا ہوتا ہے۔ ایک بار ہم اپنے دوست اشرف سولنگی کے ہم راہ جم خانہ گئے۔ ہمارے ذہن میں یہی سوال ابھر رہا تھا کہ اس کا رقبہ کسی بھی طرح آٹھ ایکڑ نہیں لگ رہا تھا۔ اشرف سولنگی جن کا تعلق ایک زمین دار گھرانے سے ہے۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ ہندو جم خانہ کا موجودہ رقبہ کسی بھی طرح ایک ایکڑ سے زیادہ نہیں ہے۔ اس بات کی تصدیق ہمارے مہربان دوست معروف موسیقی کار اور ستار نواز نفیس خان صاحب نے بھی کی جو ہندو جم خانہ کی عمارت میں قائم نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پرفارمنگ آرٹ ''ناپا'' میں موسیقی کی تربیت دیتے ہیں۔ ہم سوچ رہے تھے آخر کار باقی اراضی کہاں گئی اس کا ذکر آگے کریں گے۔ فی الحال بات کرتے ہیں ہندو جم خانہ کی۔ ہندو جم خانہ کی تعمیر 1925 میں مکمل ہوئی اور اس کا نام سیٹھ رام گوپال گوردھن داس مہوٹہ ہندو جم خانہ رکھا گیا۔ کراچی میں بندر روڈ پر گوردھن داس مارکیٹ بھی ہے۔ ہندو جم خانہ کو ملک گیر شہرت اس وقت حاصل ہوئی جب 2005 میں سابق فوجی آمر جنرل پرویز مشرف کے دور میں جم خانہ کو ایک معاہدے کے تحت نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پرفارمنگ آرٹ کے حوالے کیا گیا۔ ''ناپا'' کے قیام نے ہندو جم خانہ کی قسمت بدل دی۔ جم خانہ کے ویران کمروں میں نفیس خان کے ستار اور بشیر خان صاحب کے طبلے کی آوازیں گونجنے لگیں۔ اس کے ساتھ ساتھ راحت کاظمی اور طلعت حسین بھی اپنی اداکاری کے جوہر نوجوانوں کو منتقل کرنے لگے اور پھر ضیاء محی الدین کی تو بات ہی کیا وہ طلباء کا شین قاف درست کرنے کے علاوہ انھیں یہ گر بھی سکھاتے نظر آتے کہ تلفظ درست ہونے کے علاوہ جملوں کی ادائیگی بھی کتنی اہم ہوتی ہے۔ یہاں عالمی میوزک کانفرنس بھی منعقد ہوتی رہی ہے گو کہ ہندو جم خانہ فنون لطیفہ کا مرکز بن گیا۔ لیکن ان تمام تقاریب کی خاص بات یہ تھی کہ ہندو جم خانہ میں آنے والے 99 فی صد مسلمان ہوتے تھے ہندو نہیں۔ بلکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ رقص و موسیقی جو ہندو مذہب میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے اس کی تر

بیت دینے والے تمام ماہرین بھی مسلمان ہیں ان میں سے ہندو کوئی نہیں اور یہی صورت حال NAPA میں تعلیم حاصل کرنے والے طالبعلموں کی بھی ہے۔ 2005 میں ہندو جم خانہ میں قائم ہونے والا ''ناپا'' ایک مستحکم ادارے میں تبدیل ہوتا گیا۔ 2009 میں ہندو جم خانہ کے ''ناپا'' کو ایک بار پھر شہرت نصیب ہوئی تاہم یہ شہرت ''ناپا'' کے منتظمین کے لیے تشویش ناک تھی۔ 3 ستمبر 2008 کو ''ناپا'' کے چیئرمین ضیاء محی الدین سکریٹری محکمہ ثقافت سندھ کی جانب سے ایک نوٹس ارسال کیا گیا۔ جس کے تحت انھیں ہدایت کی گئی تھی کہ چوں کہ انھوں نے 23 ستمبر 2005 کو ہونے والے معاہدے کی مخالفت کرتے ہوئے ہندو جم خانہ میں تھیٹر یا آڈیٹوریم کی تعمیر شروع کی ہے وہ غیر قانونی ہے۔ لیز کے مطابق یہ تعمیر سندھ کلچر ہریٹیج پریزروشن ایکٹ 1994 کی خلاف ورزی ہے۔ اس لیے ایکٹ کی دفعہ 8 کے تحت وہ تین ماہ میں ہندو جم خانہ خالی کر دیں۔ ''ناپا'' کے ایک اہم ذے دار اور معروف موسیقار ارشد محمود کے مطابق انھوں نے یا ان کی تنظیم نے معاہدے کی کوئی خلاف ورزی نہیں کی ہے۔ ہندو جم خانہ اپنی اصل شکل میں موجود ہے۔ ''ناپا'' کو نوٹس جاری کرنا غیر قانونی ہے۔ چوں کہ ہماری صحافت بھی ہمارے قومی مزاج کا حصہ بن چکی ہیں۔ اس حوالے سے میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا قومی نعرہ اب اتحاد تنظیم یقین محکم کی بہ جائے یہ ہونا چاہیے افرا تفری، اشتعال اور افواہ۔ اخبارات میں بڑی بڑی خبریں شائع ہوگئیں۔ خبریں پڑھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ ''ناپا'' بس ایک آدھ دن کا مہمان ہے۔ جب ہم یہ بلاگ لکھ رہے ہیں یہ فروری 2015 ہے۔ ''ناپا'' آج بھی ہندو جم خانہ میں موجود ہے اور اسی طرح سے کام کر رہا ہے۔ ہمارے صحافی دوست ریاض سہیل نے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا ہے کہ اس وقت جب ''ناپا'' کا تنازعہ شروع ہوا سندھ کی وزیر ثقافت سسی پلیجو نے فرمایا تھا کہ ''یہ عمارت ہندو برادری کی ملکیت ہے اور شہر میں ایسی کوئی جگہ نہیں جہاں وہ اپنے تہوار منا سکیں۔ جنرل پرویز مشرف نے زبردستی وہاں سے سامان باہر پھنکوا کر اپنے رشتے داروں کے کہنے پر عمارت کو خالی کروا کر ''ناپا'' کے حوالے کیا۔ اس کی ابتدا ہی غلط تھی اور پیپلز پارٹی نے اپوزیشن میں اس اقدام کی مخالفت کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ اس عمارت سے تاریخی نوعیت کے سامان کو بے دردی سے حیدرآباد کے میوزیم منتقل کیا گیا، جس کی بڑی اہمیت تھی۔ صوبائی وزیر کا کہنا تھا کہ پرویز مشرف کے تعلق کی وجہ سے انتقام لینے کی بات غلط ہے۔ پیپلز پارٹی انتقام پر یقین نہیں رکھتی۔ اس عمارت کو ہندو کمیونٹی کی سرگرمیوں کے لیے وقف کیا جائے گا۔''

جہاں تک حزب اختلاف میں رہتے ہوئے ہندو جم خانہ کی ''ناپا'' حوالگی کی مخالفت کا تعلق ہے تو اس کے لیے اس وقت کے اخبارات کا مطالعہ کرنا ہوگا اور اس کے ساتھ ساتھ اسمبلی کا ریکارڈ بھی دیکھنا ہوگا کہ کیا محترمہ نے ایسی کوئی تقریر کی تھی یہ بہت دقت اور وقت طلب کام ہے۔ آل پاکستان ہندو پنچایت نے ''ناپا'' سے ہندو جم خانہ کی واگذاری کے لیے ٹھیک 11 سال بعد 17 فروری 2014 کو اس وقت کے چیف جسٹس سپریم کورٹ کو ہندو برادری کے مسائل کے عنوان سے خط لکھا۔ جس میں ہندو جم خانہ کے حوالے سے ازخود کارروائی کی اپیل کی گئی۔ آل پاکستان ہندو پنچایت کی جانب سے یہ درخواست تو چیف جسٹس آف پاکستان کو بھیج دی گئی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندو جم خانہ کی ہی واگذاری کی درخواست کیوں؟ ہندوؤں کے باقی مقامات کا کیا ہوگا۔ ہمارے دوست وسعت اللہ خان نے اپنے کالم میں ہندوؤں کے کراچی میں مقامات کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''حکومت سندھ کا کہنا ہے کہ ہندو جم خانہ کی تاریخی عمارت نیشنل اکیڈمی آف پرفارمنگ آرٹ سے خالی کروا کر اسے ہندو کمیونٹی کی تقریبات کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ یقیناً یہ ایک قابل قدر اقدام ہوگا۔ کیا اچھا ہوتا کہ حکومت سندھ اقلیتوں کی فلاح کا جذبہ برقرار رکھتے ہوئے یہ بھی معلوم کرلے کہ 1947 میں کراچی شہر میں چھوٹے بڑے ملا کر 420 مندر متعدد گرودوارے اور ایک یہودی معبد ہوا کرتا تھا۔ ان کو زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ جو مندر باقی بچے ہیں ان میں سے نارائن مندر کے صحن کو قریشی دکان دار گودام کے طور پر استعمال کررہے ہیں۔ ناگ ناتھ مندر اب صابن کی فیکٹری ہے۔ پریڈی تھانے کے ساتھ لگے ہوئے مندر پر قبضہ گروپ کا تسلط ہے۔ دریالال مندر ایک گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی کا دفتر ہے۔ بھاگ ناری مندر پر ایک ٹرانسپورٹ اور کوریئر کمپنی کا قبضہ ہے اور پنجرہ بول مندر اس کے ٹرسٹیوں نے بیچ کھایا۔ وسعت اللہ جو لکھتے ہیں کمال لکھتے ہیں۔ ان کی تحریر کو رد کرنا ممکن نہیں۔ چلیں اب آگے کی جانب بڑھتے ہیں۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ 1994 کے ایکٹ کے مطابق کسی بھی تاریخی ورثہ قرار دیے جانے والی عمارت میں کوئی تعمیرات نہیں ہوسکتی تو پیپلز پارٹی کی حکومت کے لیے بے شمار مسائل پیدا ہوجائیں گے۔ معاملہ کفر و اسلام تک پہنچ جائے گا۔ ایسی عمارتوں کے انہدام کے لیے بڑا حوصلہ درکار ہوگا۔ سابقہ وکٹوریہ میوزیم اور حالیہ سپریم کورٹ کی عمارت میں ایک چھوٹی لیکن عالی شان مسجد کچھ عرصہ پہلے تعمیر کی

گئی ہے۔ اسی طرح خالق دینا ہال کے پچھواڑے میں سرکاری دفاتر اور رہائشی کوارٹر موجود ہیں اور تو اور سندھ اسمبلی بلڈنگ میں بھی ایک مسجد ہے اور اس کے ساتھ ساتھ قدیم اسمبلی کے عقب میں خالی جگہ پر نئی اسمبلی بلڈنگ بن گئی ہے۔ NJV اسکول سابقہ سندھ اسمبلی بلڈنگ کے ایک حصے میں محکمہ تعلیم نے پارٹیشن بنا کر دفاتر قائم کردیے ہیں۔ اب میں بولوں کہ نا بولوں؟ سسی پلیجو صاحبہ اور قائم علی شاہ صاحب آپ دونوں نے بہت مشکل کام اپنے کاندھوں پر لے لیا ہے۔

آیئے اب بات کرتے ہیں ہندو جم خانہ کی سرکاری ریکارڈ کے مطابق رقبے کی جم خانہ کا پلاٹ نمبر RB1/5 ہے۔ اس کا مکمل رقبہ 39178 گز ہے۔ 1978 کو 27396 گز کا رقبہ مفت محکمہ پولیس کو دیا گیا۔ اور اسی سن میں 6700 گز فیڈرل پبلک سروس کمیشن اور 4164 گز علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کو دیا گیا۔ لیکن علی گڑھ یونی ورسٹی نے زمین کی قیمت ادا کی جو 1,73,050 روپے تھی۔ اسی طرح عبدالمجید خان نامی ایک شخص کو 416 گز کا رقبہ الاٹ کیا گیا۔ یعنی ہندو جم خانہ کا مکمل رقبہ 39178 گز تھا۔ اس رقبے میں سے اگر دان کیا گیا رقبہ کم کردیا جائے تو ٹوٹل بچنے والا رقبہ 4816 گز بنتا ہے۔ ہندو جم خانہ کے حصول کے لیے معروف وکیل مائیکل سلیم کے مطابق 17 کے قریب افراد و ہندوؤں کی تنظیموں نے انفرادی اور اجتماعی صورت میں مختلف عدالتوں میں مقدمات دائر کیے ہوئے ہیں۔

ہندو جم خانہ کی واگذاری کے لیے جدوجہد کرنے والی ہندو تنظیموں، شخصیات اور محکمہ ثقافت کے ذمے داران اور ''ناپا'' کی مجلس عاملہ سے ہماری درخواست ہے کہ صرف 4816 گز پر اکتفا نہ کریں بلکہ 39,178 گز رقبے کے حصول کے جدوجہد کریں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم انسانی حقوق کمیشن پاکستان کے کور گروپس کے صوبائی رابطہ کار تھے۔ کمیشن کا دفتر اسٹیٹ لائف بلڈنگ نمبر ۵ الاکو ہاوس عبداللہ ہارون روڈ پر واقع ہے۔ ہمارے مہربان استاد جناب حسین نقی صاحب لاہور سے تشریف لائے تھے اور دفتر میں موجود تھے۔ وہ کسی صاحب کو دفتر کا پتہ سمجھانے کی کوشش کررہے تھے۔ وہ فون پر پتہ کچھ یوں بتا رہے تھے۔ بھئی آپ وکٹوریہ روڈ پر آجائیں۔ دوسری جانب ایلفنسٹن اسٹریٹ ہے۔ یہاں پر انڈین لائف انشورنس کی عمارت میں ہمارا دفتر ہے۔ دوسری جانب فون پر موجود صاحب غالباً پتہ سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ میں نے نقی صاحب سے درخواست کی کہ اگر ان کی اجازت ہو تو میں پتہ سمجھا دوں۔ انھوں نے فون میری طرف

بڑھا دیا۔ میں نے ان صاحب سے کہا کہ اگر آپ کلفٹن کی جانب سے آ رہے ہیں تو آپ عبداللہ ہارون روڈ پر آ جائیں۔ زینب مارکیٹ کے سگنل سے آگے آئیں تو اسٹیٹ لائف بلڈنگ نمبر 5 پر آ جائیں۔ اگر صدر کی جانب سے آ رہے ہیں تو زیب النساء اسٹریٹ پر آ جائیں۔ سگنل کے بعد دائیں جانب گلی میں مڑ جائیں۔ وہیں یہ بلڈنگ ہے۔ ان صاحب نے ایک لمبی پُر سکون سانس لے کر فون بند کر دیا۔ نقی صاحب نے ہم سے پوچھا۔ تو اب یہ نام ہیں ان سڑکوں کے۔ ہم نے جواب دیا جی ہاں۔ لیکن وہ اس بات پر مطمئن نہیں ہوئے کہ یہ انڈین لائف انشورنس کمپنی کی عمارت نہیں ہے۔ ہم سمجھے کوئی یادداشت کا معاملہ ہوگا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ جب ہم وکٹوریہ میوزیم کی عمارت ایلفنسٹن اسٹریٹ (زیب النساء اسٹریٹ) پر تلاش کر رہے تھے تو ہمیں ایسا لگا کہ HRCP کے کاشان کاشف کی گاڑی الاکو ہاوس میں داخل ہوئی ہو۔ گو کہ یہ ہفتہ کا دن تھا اس دن دفتر بند ہوتا ہے۔ ہم نے سوچا چلو کاشان صاحب سے ملتے چلیں۔ ہم عمارت میں داخل ہو گئے۔ عمارت میں چھٹی کی وجہ سے مکمل سناٹا تھا۔ ہم نے سوچا کاشان کاشف کو ملنے سے پہلے عمارت کو دیکھ لیں۔ شاید یہیں کہیں وکٹوریہ میوزیم کا آثار مل جائیں۔ عمارت کے اندر دائیں جانب قدیم لکڑیوں کی سیڑیاں اور شکستہ کمرے موجود تھے۔ ہم تھوڑا، آگے بڑھے ایک قدیم سا گیٹ نظر آیا۔ گیٹ کے اوپر ایک پتھر کی تختی لگی ہوئی تھی۔ اس تختی کو جب غور سے دیکھا۔ تو دھندلے حروف میں انڈین لائف انشورنس کے الفاظ کندہ تھے۔ ہم نے جھٹ سے اس کی تصویر بنالی۔ اتنے میں ایک صاحب نے خود کو، کو اسٹیٹ لائف کا گارڈ ظاہر کر کے ہمیں تصویریں بنانے سے منع کر دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ صاحب انڈین لائف انشورنس کمپنی کی اوپر والی منزل پر واقع ایک شکستہ گھر میں رہتے ہیں۔ انھیں خدشہ یہ تھا کہ کہیں عمارت کو ثقافتی ورثہ قرار نہیں دے دیا جائے اور انھیں جگہ خالی نہ کرنی پڑے۔ خیر ہم من ہی من میں اس بات پر شرمندہ ہوئے کہ ہم نے نقی صاحب کی یادداشت پر شک کیا۔ کچھ عرصے قبل اردو یونیورسٹی عبدالحق کیمپس کے شعبہ صحافت سے وابستہ ایک نوجوان استاد طیب بجوی نے جو ہمارے بلاگس کے قاری ہیں نے ہمیں بتایا کہ ان کی بہن جس کالج میں پڑھتی ہیں اس میں ایک پرانی تختی پر کسی انگریز کا نام لکھا ہے۔ طیب نے کہا انھوں نے بہن کو اپنا موبائل کیمرہ دیا تھا۔ تاکہ وہ اس تختی کی تصویر بنا لے لیکن بدقسمتی سے تصویر صحیح نہیں بنی۔ ہم نے اُن سے کالج کا پتہ معلوم کیا۔ تو انھوں نے کہا کہ یہ کالج برنس روڈ پر واقع ہے۔ جہاں گذشتہ دنوں

سندھ ہائی کورٹ کے جسٹس مقبول باقر پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ یہ جگہ ہمارے گھر کے بالکل قریب ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں آج کل الیکٹرونک میڈیا نے چھاپہ مار مہمیں شروع کی ہوئی ہیں۔ اس کی سبب کسی تاریخی مقام کی تصویر بنانا کوئی آسان کام نہیں۔ لوگ اسے منفی انداز سے دیکھتے ہیں۔ اکثر تصویریں بنانے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ ہمارے ایک صحافی دوست اشرف خان سے ایک گفتگو کے دوران جب ہم نے اس بات کا ذکر کیا۔ تو انھوں نے ہنستے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ارے بھائی وہ لوگ جو فوٹو بنانے سے روکتے ہیں۔ ان کے بھی کچھ مفادات ہوتے ہیں اور کچھ میڈیا کا انداز بھی جارحانہ ہوتا جا رہا ہے۔ ہمیں اس موقع پر احمد فراز کا ایک شعر یاد آیا:

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

اب ہم نے سوچا کہ اس کالج میں اس وقت جایا، جائے جب کالج بند ہو۔ چوکی دار سے "معاملات" طے کر کے اندر جا کر اطمینان سے تصویریں بنالیں گے۔ ایک شام ہم وہاں سے گذر رہے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ کالج کے مرکزی گیٹ کے ساتھ ایک چھوٹا گیٹ کھلا ہوا ہے۔ ہم اندر داخل ہو گئے۔ ہمیں اندر کوئی شخص نظر نہیں آیا۔ ہم آگے بڑھے تو ایک تختی نظر آئی۔ ہم نے فوراً اس کی تصویر بنا ڈالی۔ اب ہم عمارت کے دائیں بائیں دیکھنے لگے۔ اتنی دیر میں ایک نوجوان ہمارے پاس آئے۔ انھوں نے شائستہ لہجے میں ہماری آمد کی وجہ معلوم کی۔ ہم نے انھیں بتایا کہ ہم پرانی تاریخی عمارتوں پر لکھ رہے ہیں۔ اس لیے یہاں آئے ہیں۔ انھوں نے کندھے اچکائے اور چلے گئے۔ ہم نے بھی سکون کا سانس لیا۔ جلدی جلدی دو تین اور تختیوں کی تصویریں بنالیں۔ اچانک کسی نے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تو پہلے والے نوجوان کے ساتھ ایک اور نوجوان کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمایاں تھے۔ اس کے سوال کرنے سے قبل ہی ہم نے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ نوجوان نے غصیلے لہجے میں کہا کہ ہم فوراً تصویریں بنانا بند کریں۔ اگر تصویریں بنانی ہیں تو دن میں پرنسپل کی اجازت لے کر تصویریں بنائیں۔ ہمارا کام ادھورا رہا۔ لیکن ان سے اگلے دن پرنسپل سے ملنے کا ارادہ ظاہر کر کے عمارت سے باہر نکل آئے۔ اس کالج کا نام اب گورنمنٹ کالج فار ویمن شارع لیاقت ہے لیکن اندر لگی ہوئی تختیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کالج کا نام Indian CARNEIRO

Girls High School 1933 ہے۔ایک تختی پر پاٹھ شالہ بھی لکھا ہے۔محمودہ رضویہ 1947 میں اپنی مطبوعہ کتاب کے صفحہ نمبر 119 پر کالج اور اسکول کے عنوان سے لکھتی ہیں کہ لڑکیوں کے لیے وشن دیوی ہائی اسکول، کارنیروگرلز ہائی اسکول، شاردا مندر ہائی اسکول اور بھمپت مل آریا پتری پاٹھ شالا کے نام سے لڑکیوں کے اسکول تھے۔ بینکوں کے حوالے سے محمودہ رضویہ اپنی کتاب میں کراچی کے مشہور بینک کو عنوان سے لکھتی ہیں کہ نیشنل بینک آف انڈیا، چارٹرڈ بینک آف انڈیا، امپیرل بینک آف انڈیا کا شمار نامی گرامی بینکوں میں ہوتا تھا۔ایک دن پریس کلب میں دوستوں سے گپ شپ ہو رہی تھی۔ایک دوست عزیز سنگور نے جو ایک نجی ٹی وی چینل کے لیے تاریخی مقامات کے حوالے سے بے شمار دستاویزی فلمیں بنا چکے ہیں ہم سے پوچھا۔ہاں بھائی اگلا بلاگ کس پر ہے۔ہم نے انھیں بتایا کراچی میں انڈیا کے نام سے منسوب پرانی عمارتوں پر۔انھوں نے فوراً ہماری معلومات میں اضافہ کرتے ہوے بتایا کہ سٹی کورٹ کے بلکل سامنے بینک آف انڈیا کی عمارت ہے۔اس کے علاوہ اسٹیٹ بینک آف پاکستان بھی غالباً بینک آف انڈیا تھا۔ہم سٹی کورٹ کے سامنے بینک آف انڈیا کی عمارت تلاش کرنے پہنچے۔عمارت کی جو نشانیاں انھوں نے بتائی تھیں۔وہ عمارت نظر آ گئی۔لیکن اس عمارت کی پیشانی کو پاکستان کے ایک نجی بینک کے بورڈ نے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔بینک آف انڈیا کا نام کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔جب ہم نے مزید قریب جا کر دیکھا تو بینک آف انڈیا دھندلے حروف میں لکھا نظر آیا۔اس عمارت کا نام اب کورٹ ویو بلڈنگ ہے۔اب ہم اسٹیٹ بینک پہنچے۔اس کی جدید عمارت سے متصل ایک پرانی عمارت کے اوپر اسٹیٹ بینک میوزیم لکھا تھا۔لیکن اس کے پیچھے امپیریل بینک آف انڈیا کے الفاظ ہمیں دیکھ کر کسی شریر بچے کی طرح منہ چڑا رہے تھے۔

جونا گڑھ کے ڈاکو کراچی میں

ریاست جونا گڑھ کا شمار تقسیم ہند سے قبل کی اُن ریاستوں میں ہوتا ہے جس کے نواب نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن انڈین حکومت نے اُن کا یہ فیصلہ قبول نہیں کیا اور پھر یہ انڈین ریاست کا حصہ بن گئی۔ اس کے نتیجے میں جونا گڑھ کے لوگوں نے بڑی تعداد میں انڈیا سے ہجرت کی اور پاکستان منتقل ہو گئے۔ ان کی اکثریت کراچی میں آباد ہوئی۔ کراچی میں ان کی جماعت خاصی فعال ہے۔ سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے والد سر شاہ نواز بھٹو جونا گڑھ کے آخری وزیر اعظم تھے۔ جونا گڑھی برادری میں بہت سے نام ور افراد گذرے ہیں۔ ان میں کاروباری شخصیات شامل ہیں تو کھلاڑی اور سیاست دان بھی۔ لیکن اس وقت ہم ذکر یں گے دو مشہور ڈاکوؤں کا، جن میں ایک بلوچ اور دوسرا ہندو تھا جو بعد میں مسلمان ہو گیا۔ بلوچ تو کراچی میں مارا گیا۔ ان دونوں کرداروں کا ذکر اقبال پاریکھ نے اپنی کتاب جوناگڑھ اُجڑے دیار کی کہانی میں کیا ہے۔ بلوچ کا نام قادو مکرانی تھا۔ ہندو کا نام بھوپت ڈاکو تھا۔ قادو مکرانی کا ذکر اُنھوں نے سرسری انداز میں کیا ہے۔ جب کہ بھوپت کا بیان تفصیل سے ہے۔ ان دونوں کے بارے میں دیو مالائی کہانیاں مشہور ہیں کہ یہ امیروں کی دولت لوٹ کر غریبوں میں بانٹتے تھے۔ یہ انگریز سامراج کے خلاف تھے اور اُس کے ساتھ ساتھ مہاجنوں اور بنیوں کے بھی۔ قادو مکرانی کے کردار پر پاکستان میں ایک فلم "جاگ اُٹھا انسان" بھی بنی تھی۔ جس میں مرکزی کردار اداکار محمد علی نے ادا کیا تھا۔ اس کردار کے لیے بھوپت کو بھی کہا گیا تھا لیکن اُنھوں نے انکار کر دیا تھا۔ جونا گڑھ اُجڑے دیار کی کہانی کے مؤلف اِقبال پاریکھ سے رابطہ بڑا مشکل تھا۔ ہمارے صحافی دوست احمد ملک نے اُن کا نمبر فراہم کیا۔ اُس کے بعد اُن سے بھوپت کے بارے میں جو بات چیت ہوئی، وہ کچھ یوں تھی:

"جونا گڑھ ریاست ہمیشہ سے ایک خوش حال علاقہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس علاقے میں لوٹ مار کی وارداتیں عام تھیں۔ زیادہ تر ڈاکو اور لٹیرے یہاں کا رُخ کرتے تھے۔ یہاں کے ڈاکو دوسری ریاستوں میں بھی مشہور ہو چکے تھے۔ اُن میں سرِ فہرست بھوپت سینھ، قادو مکرانی، رحمت اللہ، جھینا اور

ہیرا تھے۔ بھوپت سینھ اور قادُو مکرانی کی لاتعداد داستانیں گُجراتی لوک داستانوں میں عام ہیں۔ دونوں ہی بہت مشہور ڈاکو تھے۔ بھوپت کے دوسرے بھی نام تھے جن سے وہ مشہور تھا۔ اُسے سینھ اور بارو ٹیہ بھی کہا جاتا تھا۔ بارو ٹیہ اس وجہ سے کہا جاتا تھا کہ وہ ظلم کے خلاف بغاوت کرتا تھا۔

اقبال پاریکھ جوناگڑھ اُجڑے دیار کی کہانی کے صفحہ نمبر 98 اور 99 پر بھوپت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''کاٹھیاواڑ کے مشہور لیڈر سردار ولبھ بھائی پٹیل نے بھوپت کو ''چھوٹے شیواجی'' کا خطاب دیا تھا۔ ولبھ بھائی پٹیل نے بھوپت کو انعام واکرام کا لالچ دے کر مُسلمانوں کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا جس کے باعث واساور کی میمن برادری نے دہلی جا کر گاندھی جی سے شکایت کی کہ سردار پٹیل نے بھوپت کو ''چھوٹے شیواجی'' کا لقب دیا ہے اور اب وہ ہمیں بھی لُوٹے گا۔ بھوپت کو جب یہ بات پتا چلی تو کمال چالاکی سے گاندھی جی کو پیغام بھیجا کہ میں مُسلمانوں کے خلاف نہیں ہوں، بلکہ ظالموں کے خلاف جنگ کر رہا ہوں۔ دوسری جانب بھوپت نے میمنوں کو یقین دلایا کہ وہ ان کے خلاف نہیں ہے بلکہ ظالم مہاجنوں اور بنیوں کا جانی دُشمن ہے۔ دربار امرواڑہ کو بھوپت کی یہ بات پسند نہیں آئی۔ اس نے کہنا شروع کر دیا کہ میں بھوپت گروپ تشکیل دیا تھا جو ہمارے خلاف ہو گیا ہے اور میمنوں کی مدد کی باتیں کرتا ہے۔ لہٰذا دربار امرواڑہ نے بھوپت کے خلاف محاذ بنالیا۔ اس نے بھوپت کو گرفتار کرنے کی کوشش کی مگر وہ روپوش ہو گیا۔ بھوپت نے گرنار کے پہاڑی علاقے اور گیر کے جنگل میں پناہ گاہ بنا رکھی تھی۔ وہ اکثر کہتا تھا کہ گرنار کی پہاڑیوں میں مجھے اس طرح کا تحفظ ملتا ہے، جس طرح بچے کو ماں کی گود میں حفاظت ملتی ہے۔ بھوپت اکثر سوراٹھ کے دارالحکومت راج کوٹ میں اپنے بیوی بچوں سے ملنے جایا کرتا تھا۔ سوراٹھ کی سرزمین پر بھوپت اور اس کے ساتھیوں نے ظلم واستبداد کے خلاف خون کی جنگ لڑی تھی۔ بھوپت ہندو تھا لیکن وہ ہندو مہاجنوں اور بنیوں کو ظالم وجابر سمجھتا تھا۔ بھوپت بچپن سے ہی بہادر اور نڈر تھا اور ہر ظلم وزیادتی کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ ظلم وجبر سے نفرت اُس کی فطرت میں شامل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ امیر ظالم بنیوں اور مہاجنوں کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے ڈاکو بن گیا اور پھر اُس نے ظالموں اور جابروں کو تباہ وبرباد کرنے اور مظلوموں، غریبوں کی امداد کرنا اپنی زندگی کا مشن بنا لیا تھا۔''

بھوپت ڈاکو کی کارروائیاں اُس وقت کی انڈین حکومت کے لیے کسی طور بھی قابل قبول نہ تھیں۔ وہ ہر صورت میں بھوپت کو گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ لیکن کسی بھی طرح انھیں اس حوالے سے کامیابی نہیں مل سکی۔ وہ ہر صورت واردات کرنے میں کامیابی حاصل کر لیتا تھا۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے اپنا منھ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ بھوپت کے لیے انڈیا میں زمین تنگ کر دی گئی جس کے بعد اُس نے انڈیا چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ اِس کہانی کو اقبال پاریکھ اپنی کتاب کے صفحہ نمبر 100 اور 101 پر یوں بیان کرتے ہیں:

''بھارتی حکومت نے بھوپت کی گرفتاری کے لیے بھاری رقم بہ طور انعام مقرر کر رکھی تھی۔ جونا گڑھ میں عارضی حکومت قائم ہونے کے بعد ایک روز بھارتی فوج اور پولیس نے گرنار کی پہاڑیوں کو گھیرے میں لے لیا جو بھوپت کی پناہ گاہ تھی۔ بھوپت نے اپنی مخصوص وردی اور صافہ پہاڑی پر ایسے رکھ دیا کہ بھارتی فوج یہی سمجھی کہ وہ پہاڑی پر موجود ہے۔ اور اس طرح بھوپت اپنے مخصوص انداز میں بھارتی فوج اور پولیس کو دھوکہ دے کر راجستھان کے راستے پاکستان میں داخل ہو گیا۔

بھوپت نے 1952 میں اسکندر مرزا کے دور حکومت میں پناہ کی درخواست کی جو قبول کر لی گئی۔ بعد میں صدر ایوب خان نے بھی اس کو کافی سہولیات فراہم کیں۔ پاکستان آکر بھوپت نے مولانا یوسف صاحب کے ہاتھوں اسلام قبول کیا اور اس کا اسلامی نام محمد امین رکھ دیا گیا۔ بھوپت نے اسلام قبول کرتے ہوئے مولانا محمد یوسف سے کہا کہ: '' آپ نے مجھے دینِ اسلام کا سیدھا اور سچا راستہ دکھایا ہے لہٰذا میں اپنے نام کے ساتھ آپ کا نام ملاؤں گا''۔ اور یوں بھوپت مسلمان ہونے کے بعد امین یوسف کہلانے لگا۔ سندھ میں نواب آف مانگرول نے اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کے لیے امین یوسف کو رکھ لیا اور کئی سہولتیں دیں۔

پاکستان میں بھوپت نے ہالاری میمن کمیونٹی کی ایک خاتون حمیدہ بانو سے شادی کر لی جس سے اُس کے تین لڑکے اور چار لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ راج کوٹ بھارت میں ہی بھوپت نے محمد عمر بھائی میرا جی اور عبدالرحمٰن کو اپنا دوست بنا لیا تھا۔ ان کی یہ دوستی اور محبت پاکستان میں بھی قائم رہی۔ امین یوسف عرف بھوپت کے تین صاحب زادے محمد فاروق، محمد رشید اور محمد یاسین اور چار صاحبزادیاں نجمہ، بلقیس، پروین اور بائی ماں ہیں۔

پاکستان میں رہ کر امین یوسف عرف بھوپت کو حج کی سعادت بھی حاصل ہوئی اور انھوں نے حرمین شریفین میں رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگی۔ وہ اکثر اپنے دوستوں سے کہا کرتے تھے کہ مکہ اور مدینہ سے زیادہ سکون پوری دنیا میں مجھے نہیں ملا۔ 28 ستمبر 1996 میں امین یوسف عرف بھوپت کی کراچی میں رحلت ہوگئی۔"

قادر بخش عرف قادو مکرانی کا تعلق بھی جونا گڑھ سے تھا۔ ان کے بارے میں جونا گڑھ کی تاریخ لکھنے والے مورخین کا خیال یہ ہے کہ وہ انگریزی راج کے خلاف تھے اور ان کی جو بھی کارروائیاں تھیں وہ دراصل برطانوی سامراج کو کمزور بنانے کے لیے تھیں۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ قادو مکرانی دراصل ڈاکو نہیں بلکہ ایک باغی تھا جو ہندوستان کو برطانوی تسلط سے آزاد کرانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے ہم خیال لوگوں کا ایک گروہ تشکیل دیا تھا جو انگریز سرکار کے حامیوں سے لوٹ مار کر کے علاقے کے غریب لوگوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔ جب کہ انگریزوں کا خیال اس کے بالکل برعکس تھا۔ کامریڈ واحد بلوچ کے مطابق جانسن نامی ایک انگریز نے کاٹھیاواڑ کے باغی کے عنوان سے ایک کتاب میں لکھا ہے کہ قادر بخش کے جونا گڑھ کے 8 گاؤں لوٹے اس دوران 71 تاجر مارے گئے 89 لوگوں کے ناک کان کاٹ اس واقعے کو لوک فنکاروں نے اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون میں اس طرح کے بے شمار واقعے بیان کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ جانسن مزید لکھا ہے کہ میراول ندی کے کنارے ہماری چھاؤنی تھی یونین جیک پھڑ پھڑا رہا تھا کہ میں چھاؤنی سے اسکاٹ کی بیوی کو فوجی تانگے میں چڑھا کر شہر لے جا رہا تھا کہ حاجی مانگیرو ڈی شاہ کے مقبرے کے اوٹ سے اچانک قادر بخش نمودار ہوا اور للکار کر کہا کہ تم کون تانگے میں کون ہیں۔

میں نے کہا میں دھاری پلٹن کا کپتان جیکسن ہوں اور تانگے میں اسکاٹ کی بیگم ہے۔ یہ سن کو قادر بخش اور ساتھی راستے سے ہٹ گئے اور کہنے لگے کہ ہم عورتوں کا احترام کرتے ہیں۔ لیکن اگر اسکاٹ خود ہوتا تو ہم اسے زندہ نہیں چھوڑتے۔ جس نے میرے پورے خاندان کو مار دیا ہے۔ ہمارے گھر ہمارے لہلہاتے کھیت جلائے اور ہمیں بچوں سے جدا کر کے باغیانہ زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا۔

قادر بخش نے کہا کہ "ہم انگریز درندے نہیں ہیں" بمبئی اور کراچی کے اخبارات میں قادر بخش کے بارے میں سنسنی خیز خبروں کی اشاعت ہونی شروع ہوئی۔ ہمفرے نے نئی نئی پولیس چوکیاں قائم

کیں۔ پولیس کی نفری بڑھائی، انھیں قدرے بہتر ہتھیار مہیا کیے۔ کرم علی کے ٹیلے کے پاس سرسوتی ندی کے کنارے جب ابا بکر بغیر ہتھیار کے ستا رہے تھے کہ ولی محمد نامی ایک پولیس افسر نے اس پر فائر کھول دیا۔ ابا بکر شہید ہوے۔ قادر بخش کے ساتھیوں نے فیصلہ کیا کہ قادر بخش اور اللہ داد کچھ دن روپوش ہو جائیں۔ باقی لوگ جونا گڑھ ہی میں رہیں گے۔

فیصلے کے مطابق قادر بخش اور اللہ داد احمد آباد روانہ ہو گئے۔ وہاں سے بذریعہ ٹرین اندرون سندھ کے راستے کراچی آئے۔ یہاں آ کر قادر بخش اور اللہ داد الگ الگ راستوں کے مکران جانے کی کوشش میں لگ گئے۔ قادر بخش نے ایک اونٹ والے سے بات کی وہ اسے مکران پہنچائے۔ اونٹ والا قادر بخش کو پہچان گیا اور انعام کے لالچ میں اسے بغدادی پولیس کے عقب میں انتظار کرنے کا کہہ کر خود تھانے گیا۔ ایک پولیس والے کو لے کر آیا۔ جب وہ قادر بخش کو قابو کرنے آئے تو قادر بخش نے دونوں کو خنجر سے وار کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ قادر بخش وہاں سے کھسک گئے لیکن ایک مزدور نے گھر کی چھت سے بھاری پتھر مار کر اسے شدید زخمی کر دیا۔ وہ بے ہوشی کی حالت میں گرفتار کر لیے گئے جب حکام کو معلوم ہوا کہ ادر بخش ہے تو انھوں نے اس سے ملاقات کے لیے آنے والے اللہ داد کو بھی گرفتار کر لیا ہے۔ اسکاٹ کو یقین نہیں آیا اس نے تصدیق کے لیے ہر بھائی اور امبارام کو بھی بھیج دیا انھوں نے قادر بخش کو پہچان لیا۔ کراچی میں قادر بخش پر دو آدمیوں کے قتل کا مقدمہ چلا۔ اللہ داد کو جونا گڑھ بھیج دیا گیا۔ وہاں پر دین محمد بھی پکڑا گیا اور جواں سال گل محمد بھی پکڑا جا چکا تھا۔

جن پر جونا گڑھ میں ہندو پینل کوڈ قلم نمبر 121 قتل، ہتھیار بندی، ڈکیتی کے الزام میں مقدمہ چلا۔ اللہ داد اور دین کو پھانسی اور جواں سال گل محمد کو 14 سال قید کی سزا ہوئی۔

1878 میں کراچی میں قادر بخش کو پھانسی کی سزا سنا دی گئی۔ پھانسی دینے کے بعد لاش واجہ فقیر محمد دراخان کے حوالے کی گئی۔ درالائن کلاکوٹ میں مولوی غلام محمد نے میت کو غسل دیا۔ ہزاروں لوگوں نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔ قادر بخش کے جسد کو میوہ شاہ کے قبرستان میں بڑی شان سے دفن کیا گیا۔ جہاں آج بھی جونا گڑھ سے قدر دان اس بہادر کو خراج تحسین پیش کرنے آتے ہیں۔ اس واقعہ کو آج تقریباً 150 سال گزر چکے ہیں۔ لیکن آج بھی کاٹھیاواڑ، گجرات اور جونا گڑھ کے مظلوم لوگوں میں قادر بخش ہیرو کا درجہ رکھتے ہیں۔

آج بھی مقامی رقص کے بولوں ثقافتی میلے ٹیلوں میں اس کی داستانیں مغنی سنا کر میلہ لوٹ لے جاتے ہیں۔ ہندوستان قادر بخش پر ڈرامے اسٹیج ہوتے ہیں۔ فلمیں بھی بن چکی ہیں۔ بہت سی کتابیں رسالے ہندی گجراتی میں قادر بخش پر چھپ چکی ہیں۔ بمبئی گزٹ ہمفرے، اسکاٹ، جانسن، جسٹس بیمن کے چھپے ہوئے یاداشت اور انگریزوں کی لکھی ہوئی کتاب آنٹوٹ لاز آف کاٹھیاواڑ یعنی کاٹھیاواڑ کے باغی میں اس کی کہانی موجود ہے۔ راجستھان کے مظلوم طبقے آج بھی جھوم جھوم کر اونچی لے میں گاتے ہیں۔

''ڈونگرے ڈونگرے قادور رانا ڈاہرا دارو گھوڑانی واگے ٹھارم ٹھاروے، مکرانی قادو جونی دوستی جمدار ماریا ماں ابوڈ نہ ڈک نہ دیے لوک نے۔''

پیارے قادر پہاڑ پہاڑ تیری دھاک ہے، ٹکارم ٹھورے گولیوں کی نت آواز گونج رہی ہے۔ پرانی بستی کے پیارے جمعدار قادو کو ظالموں نے مار دیا جس نے کسی کو دکھ نہیں دیا تھا۔

کراچی کا کھوکھراپار

تقسیمِ ہند کا ذکر ہو تو اس کے ساتھ ہجرت کا پہلو ایک لازمی امر ہے۔ معروف صداکار اور محقق رضا علی عابدی نے اپنی کتاب اخبار کی راتیں میں اپنے کنبے کی پاکستان ہجرت کا ذکر یوں کرتے ہیں۔ ہمارے گھر کا سامان زیادہ تر اونے پونے بکا۔ میرا دارالمطالعہ ردی والے تول کر لے گئے۔ مزید کہتے ہیں کہ سارہ کنبہ واہگہ کی سرحد پر پہنچا۔ بھارت کے کسٹم والے ہمارا سامان دیکھنے لگے۔ ایک بڑے سے صندوق میں محرم کی عزاداری کا سامان اور قدیم تاریخی علم بند تھے۔ ایک افسر اسے کھولنے لگا میں نے کہا کہ اس میں ہماری مذہبی چیزیں ہیں وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ عابدی صاحب اور ان کے اہل خانہ معصوم لوگ تھے۔ جنھوں نے صرف علم و عزاداری کے سامان پر گذارا کیا۔ وگرنا تو لوگ کلیم کے کاغذوں سمیت کیا کچھ نہ لائے۔ جو بہت زیادہ تہی دست تھے۔ وہ اپنے علاقے کا نام ہی لے آئے اور پاکستان میں اسے اپنے نام کے ساتھ جوڑ لیا۔ مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ جو میں نے کہیں پڑھا تھا۔ مرحوم زیڈ اے بخاری جب ریڈیو پاکستان کراچی کے منتظم ہوتے تھے۔ اس وقت ہندوستان سے ہجرت کے بعد ریڈیو پاکستان پر ملازمت کرنے والے کچھ لوگ اپنے نام کے ساتھ اپنے علاقے کا لاحقہ لگاتے تھے۔ مثلاً دہلوی، میرٹھی وغیرہ وغیرہ۔ انھوں نے ایسے کسی صاحب سے کہا۔ میاں اب آپ پاکستان میں ہیں۔ یہ لاحقے ترک کر دیجیے۔ ان صاحب نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہزاروں سال قبل بخارا سے آنے والے تو اب تک بخاری ہیں۔ ہمیں تو ابھی پاکستان آئے ہوئے عرصہ ہی کتنا ہوا ہے۔ بھارتی راجھستان یا متصل دیگر علاقوں سے پاکستان ہجرت کرنے والے کھوکھراپار کے اسٹیشن کو کیسے بھول سکتے ہیں۔ جہاں پاکستان کی حدود میں داخل ہونے کے بعد ان کا پہلا قیام ہوتا تھا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کھوکھراپار کراچی کیسے پہنچا؟ یہ اب نہ صرف اہلیان کراچی بلکہ سندھ کے دیگر علاقوں سے کراچی کے مضافاتی علاقے ملیر میں بسنے والوں کے لیے ایک معمے یا پہیلی سے کم نہیں۔ یہ 2005ء کی بات ہے کہ جب میں ایک غیر سرکاری تنظیم کے کراچی دفتر میں ملازمت کرتا تھا۔ حکومت پاکستان اور بھارتی حکومت کے درمیان یہ طے پایا تھا کہ 17 فروری 2005ء کو کراچی سے بھارت کے لیے ٹرین سروس کا آغاز کیا جائے گا۔ اس سروس

کے حوالے سے سندھ کی قوم پرست تنظیموں کے بہت زیادہ اعتراضات تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس ٹرین سروس کے ذریعے پاکستان میں آباد "ہندوستانیوں کے رشتے داروں کی ایک بڑی تعداد بھارت سے پاکستان منتقل ہو جائے گی۔ سندھی جو سندھ میں اب تقریباً اقلیت بنتے جا رہے ہیں یہ ٹرین سروس انھیں مکمل طور پر اقلیت میں تبدیل کر دے گی۔ خیر غیر سرکاری تنظیموں کو اس بات کی قطعاً پرواہ نہ تھی کہ کون اقلیت میں ہوگا اور کون اکثریت میں؟ یہ تنظیمیں انسان ذات کو تمام سرحدی حدود سے بالاتر سمجھتی ہیں۔ ان کی جانب سے اس سفر میں شرکت کے لیے بڑی گرم جوشی تھی۔ پاکستان میں اس ٹرین کی آخری منزل کھوکھرا پار تھی۔ ایک صبح میں دفتر میں بیٹھا تھا کہ ہماری ایک خاتون ساتھی ترنم نے ہماری دوسری خاتون ساتھی لورڈز جوزف سے پُرمسرت لہجے میں کہا "اللہ کتنا مزا آئے گا نہ انڈیا جاتے میں۔" اتنا آسان سفر۔ توبہ اس سے پہلے تو کراچی سے لاہور جاؤ۔ 18 گھنٹے، پھر وہاں سے دہلی، 12 گھنٹے، اور پھر لوٹ کے راجھستان اف تو بہ! توبہ! اس بات چیت کے دوران میں بھی یہی سوچنے لگا کہ واقعی لوگوں کے لیے کتنی سہولت ہو جائے گی۔ لیکن اگلے ہی لمحے میری خاتون ساتھی نے جو بات کی اُس نے مجھے چونکا دیا۔ موصوفہ کی گفتگو کا اگلا حصہ یہ تھا کہ وہ بس میں بیٹھ کر لانڈھی سے 15 منٹ میں ملیر 15، ملیر 15 سے 15 منٹ میں کھوکھرا پار، اس کے بعد آدھ پون گھنٹے میں انڈیا! یوں تو ہمیں بھی معلوم تھا کہ جس کھوکھرا پار کا وہ ذکر کر رہی ہیں وہ بھارتی سرحد سے قریب ضلع عمر کوٹ میں واقع ہے۔ ٹرین کی روانگی سے تقریباً ایک ہفتے قبل ریلوے مزدور یونین کے نام ور رہنما منظور رضی نے ایک نشست میں ہمیں بتایا تھا کے کراچی سے بذریعہ ٹرین کھوکھرا پار کا فاصلہ تقریباً 284 کلو میٹر ہے۔ جب کہ عمر کوٹ کے ہمارے صحافی دوست لال مالھی جن کی ذمے داری تھی کے جو لوگ اس ٹرین کے ذریعے بھارت جائیں گے ان کو بذریعہ سڑک رخصت کرنے کے لیے کھوکھرا پار پہنچنے والے سماجی کارکنوں کی رہنمائی کریں گے۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ بذریعہ سڑک کراچی سے کھوکھرا پار کا فاصلہ تقریباً 400 کلو میٹر ہے۔ میں نے اُس وقت ترنم کو اس کی اس غلط فہمی پر نہیں ٹوکا۔ میں نے یہ سوچا کہ موصوفہ یہ نہ سمجھیں کہ میں ان پر اپنی جغرافیائی معلومات کی دھاک بٹھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تو خیر محترمہ انڈیا ہو آئیں۔ ایک دن میں نے ازراہِ مذاق کھوکھرا پار کا ذکر چھیڑتے ہوئے ان کے سفر کے بارے میں پوچھا۔ وہ برا سا منھ بنا کر بولیں، تم نے اس وقت کیوں نہیں بتایا؟ کہ کھوکھرا پار کہاں ہے؟ چند لمحوں بعد انھوں نے بڑی معصومیت سے پوچھا کہ اچھا ہم تو غلط سمجھے تھے اب تم ہی بتاؤ

کراچی میں کھوکھراپار کہاں سے آیا؟ اس کے اس سوال نے مجھے لاجواب کر دیا۔ میرا اب بھی اُس دفتر آنا جانا رہتا ہے۔ ترنم اگر کبھی کبھار کام کے دباؤ کے باعث جھنجھلا اُٹھتی ہے، تو میرا اتنا ہی کہہ دینا کافی ہوتا ہے کہ کھوکھراپار کے ذریعے انڈیا جانا کتنا آسان ہے۔ اُس کے بعد ان کا موڈ یک لخت تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہیں۔ اب ہمارے ذہن میں خیال جڑ پکڑ گیا کہ یہ معلوم کر کے رہیں گے کہ کھوکھراپار کے نام کی بستی کراچی میں کب قائم ہوئی۔ کچھ دوستوں کے ذریعے اس سلسلے میں علاقے کے رہائشی مختلف لوگوں سے بات کی مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کراچی کی ایک بستی کا نام کھوکھراپار کیسے پڑا؟ ہمارے ایک صحافی دوست ارباب چانڈیو جو ملیر میں رہائش پذیر ہیں۔ میں نے ان سے اس ضمن میں معلومات کے لیے درخواست کی ارباب نے ہمیں بتایا کہ اگر ہم ملیر میں رہائش پذیر محقق گل حسن کلمتی سے بات کروں تو وہ شاید میری کوئی مدد کر پائیں۔ گل حسن کلمتی کی کراچی کے مختلف علاقوں کی تاریخ پر ایک تفصیلی کتاب بھی شائع ہو چکی ہے۔ جناب گل حسن کلمتی نے ہمیں بتایا کہ تقسیم ہند کے بعد بذریعہ راجھستان ہجرت کرنے والوں کا پہلا پڑاؤ کھوکھراپار کے مہاجر کیمپ میں ہوتا تھا۔ بعدازاں یہ مہاجرین بذریعہ ٹرین سندھ کے مختلف علاقوں میں آباد ہو جاتے تھے۔ ان مہاجریں میں سے کچھ کراچی کی مضافاتی علاقے ملیر میں آباد ہوے۔ اس وقت پورے علاقے کو ملیر کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ان مہاجرین نے علاقے میں اپنی شناخت قائم کرنے کے لیے جہاں وہ آباد تھے اُسے اپنی ہجرت کے پہلے پڑاؤ یعنی کھوکھراپار کی نسبت سے کھوکھراپار کا نام دیا۔ کھوکھراپار کے نام کو باضابطہ طور پر ایوب خان کے دور میں ایک سرکاری نوٹیفکیشن کے ذریعے قانونی شکل دی گئی جس کے بعد یہ نام زبان زد عام ہو گیا اور آج تک اس علاقے کو کھوکھراپار کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ دو یا تین نسلیں گذرنے کے بعد اب کھوکھراپار میں بسنے والے افراد بھی شاید یہ بات بھول چکے ہیں کہ اس علاقے کا نام کھوکھراپار کب کیوں اور کیسے پڑا۔ میں سوچتا ہوں کہ ہجرت کے بعد ملیر میں آباد ہونے والے مہاجرین نے یوپی، دہلی، حیدرآباد کالونی کے بجائے کھوکھراپار کے نام کو ترجیح کیوں دی۔ غالباً وہ اسی دھرتی کی مٹی سے اپنے نئے تعلق کو یہ نام دے کر مضبوط بنانا چاہتے تھے۔ یہ اُس خلیج کو کم کرنے کی کوشش تھی۔ جس کا آغاز پاکستان کے قیام سے ہی سندھی، مہاجر کی شکل میں ہو چکا تھا۔ انھیں اندازہ ہی نہیں ہوگا کہ ان کی اس کوشش کے باوجود 65 سال بعد مقامی اور غیر مقامی افراد کے درمیان نفرتوں کا یہ پودا ایک گھنا اور تن آور درخت بن جائے گا۔

لیاری کے بلاول بلیجیم

معروف صحافی اور صحافیوں کے حقوق کے لیے جدو جہد کرنے والے مظہر عباس نے گذشتہ دنوں ایک انگریزی اخبار میں لیاری کے بارے میں ایک مضمون لکھا۔اس حوالے سے انھوں نے لیاری کے صحافیوں نادر شاہ عادل، صدیق بلوچ، سعید سربازی، لطیف بلوچ اور عزیز سنگور کا ذکر کیا۔ان کے مطابق لیاری کی وجہ شہرت صرف گینگ وار یا جرائم پیشہ افراد ہی نہیں بل کہ صحافی بھی ہیں۔ہم ان سے سو فیصد متفق ہیں۔لیکن لیاری میں صرف صحافی ہی نہیں فٹ بالرز بھی ہیں تو موسیقی کار اور گلوکار بھی۔کیپٹن عمر بلوچ، عباس بلوچ، علی نواز پاکستان کی فٹ بال ٹیم کی قیادت بھی کر چکے ہیں۔موسیقی کے حوالے سے فیض بلوچ، جاڑوک، غلام جان، نور محمد نورل سازندوں کے حوالے سے نمایاں نام بینجو نواز بلاول بلیجیم کا ہے۔صحافت کے حوالے سے رحیم بخش آزاد اور نسیم نکوی بھی بڑا نام ہیں۔اس بلاگ کے لیئے ہم نے دو افراد کا انتخاب کیا ہے ان میں سے ایک بلاول بلیجیم ہیں تو دوسرے نسیم نکوی۔لیاری کی نامور شخصیات پر لکھنے کے لیئے بہت زیادہ تحقیق اور وقت کی ضرورت ہے ہم کوشش کریں گے کہ اس سلسلے کو جاری رکھیں۔

بلاول بلیجیم ایک کمال موسیقی کار اور بینجو نواز تھے۔ان کا تعلق لیاری سے تھا۔ان کی والدہ مائی ماگی بھی بلوچی زبان میں گیت گاتی تھیں، بلاول بلیجیم کے بارے میں لکھنے کے لیے جب ہم نے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تو یہ بہت مشکل کام نکلا ہماری مشکل بلاول کے ایک ہر دل عزیز شاگرد حیدرآباد کے عزیز بھائی نے حل کی۔بلاول نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ حیدرآباد میں گذارا تھا۔ عزیز نے نہ صرف بینجو بجا کر اور سندھ میں مختلف ایوارڈز حاصل کر کے ان کا حق شاگردی ادا کیا بل کہ ان کے فن اور زندگی پر ایک کتاب بھی چھپوائی۔ہم نے دیکھا ہے کہ شاگرد جب باکمال ہو جائے تو استاد کو بھول جاتا ہے۔لیکن ایک لیاری کے بلوچ استاد کا اردو بولنے والا یہ شاگرد کمال ہے۔مقتول بلوچی دانش ور اور ماہر تعلیم پروفیسر صباء دشتیاری نے ہمیں بتایا تھا کہ بینجو دراصل کوئی ساز نہیں بل کہ ایک جاپانی کھلونا تھا جسے بلاول نے ایک ساز کی شکل دی۔بینجو ایک ایسا ساز ہے۔جس کے بغیر سندھی اور بلوچی

موسیقی کی ادھوری ہے۔ نصیر مرزا اپنی کتاب بلاول بیلجیم کے صفحہ نمبر 9 پر لکھتے ہیں کہ "بینجو جاپانی ساز ہے۔ ہوگا لیکن بینجو کو ساز بنا کر بجانے والی ہستی کا نام بلاول بیلجیم ہے۔ بلاول نے اس ساز کو ایک نیا انداز دیا۔ بلاول کے شاگرد رحمت اللہ نے ایک دل چسپ واقعہ یوں بیان کیا کہ ایک دن موسم ابر آلود تھا۔ ہم جھولے لال ہوٹل پر "ترنگ" میں بیٹھے تھے۔ شام کے 6 بجے کا وقت تھا۔ ریڈیو پاکستان حیدرآباد پر سید صالح محمد شاہ کا فتح خان والا پروگرام کچہری شروع ہو چکا تھا۔ استاد بلاول کے قریب حسب دستور ریڈیو چل رہا تھا۔ اچانک ریڈیو سنتے سنتے اُستاد چھلانگ مار کر اُٹھ بیٹھے۔ اور کہنے لگے رحمت اللہ اُٹھو آج کچہری میں بینجو بجائیں گے۔ ہم کمرے سے نیچے اُتر آئے۔ وہ ہوٹل کے باہر اپنی سائیکل پر سوار ہوئے۔ کیریئر پر مجھے بٹھایا۔ چند منٹوں میں ہم ریڈیو اسٹیشن پہنچ گئے۔ انھوں نے اسٹوڈیو میں بیٹھتے ہی فتح خان کو اشارے سے کہا کہ وہ بینجو بجائیں گے۔ بلاول جیسا فن کار ساز بجانے کے لیے اصرار کرے تو کون بھلا انکار کرے گا۔ پروگرام والے خود تو اس بات کا انتظار کرتے تھے کہ کب بلاول آئے اور بینجو بجائیں۔ خیر بینجو کے سُروں پر جب انھوں نے انگلیاں چلائیں تو ایک انڈین گانے کے یہ بول سامنے آئے۔ "دھیرے سے آجا رے اکھین میں نندیا آجا رے آجا" یہ 1971۔72 کا سال تھا۔ انڈین گانے اور ان کی دھنیں ریڈیو پاکستان سے نشر کرنے کی ممانعت تھی۔ ایم ای انصاری جیسے تند مزاج انسان اسٹیشن ڈائریکٹر تھے۔ وہ یہ پروگرام اپنے دفتر میں غور سے سن رہے تھے۔ وہ دفتر سے بھاگتے بھاگتے اسٹوڈیو پہنچے اور بلاول کو گریبان سے پکڑ کر اُٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن یہ بلاول اُستاد تھے۔ اُٹھے ہی نہیں۔ دھن بجاتے رہے۔ انصاری کی جانب دیکھتے ہوئے انھوں نے اپنی انگلی ہونٹوں پر رکھ کر انھیں کہا "خاموش"۔

آخر کار انھوں نے دھن بجا کر مکمل کی۔ بعد میں اسٹوڈیو سے نکل کر بینجو اُٹھا کر سائیکل پر بیٹھ کر ہوٹل لوٹ آئے۔ ہوٹل پہنچنے کے بعد انھوں نے مجھ سے کہا کہ ہم نے اپنا شوق پورا کیا۔ اب ریڈیو والے جانیں اور اُن کا کام۔ اگر نوکری سے نکال دیں تو ہم کسی اور ریڈیو اسٹیشن پر جا کر بینجو بجائیں گے۔ پھر ایسا ہی ہوا۔ کچھ عرصے بعد وہ لاہور ریڈیو جا پہنچے۔" معروف ادیب اجمل کمال نے اپنی مرتبہ کتاب کراچی کی کہانی میں پیر علی راشدی کی یادداشتوں میں نسیم تکوی کا ذکر کچھ یوں کیا ہے۔

نسیم تکوی مرحوم لیاری محلے کے بلوچ اور پیدائشی پہلوان تھے۔ (نام ور صحافی صدیق بلوچ نے

ہمیں بتایا کہ بے شک نسیم تکوی مرحوم بلوچ تھے لیکن ان کی پیدائش لیاری میں نہیں ہوئی تھی۔ وہ بلوچستان کے ضلع سبی کے علاقے تلی میں پیدا ہوئے تھے۔ نوجوانی میں انگریزوں کے خلاف جدوجہد کی پاداش میں انھیں اپنا آبائی علاقہ چھوڑنا پڑا۔ وہ بعد ازاں کراچی کے علاقے لیاری منتقل ہو گئے تھے۔ صدیق بلوچ کے مطابق وہ بڑے غضب کے کرائم رپورٹر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک فعال سیاسی کارکن بھی تھے، سدا جوان، سدا بہار؛ آخر تک چہرے سے عمر کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ سیاست کے ڈنک کا شکار تھے۔ صحافت کا پیشہ اختیار کیا، مگر اسے پیشے کے طور پر استعمال نہ کیا۔ اخبار کا نام تھا بلوچستان جدید۔ آزادی کے عاشق تھے اور عزت نفس کے بغیر جینے کو جنجال سمجھتے تھے۔ غریب تھے مگر غیرت مند۔ سندھ اور بلوچستان کی آزادی اور سربلندی کے راستے میں جو کوئی حائل ہوتا، اسے میدان سے بھگانے کی کوشش کرتے۔

اپنی سیاست اور صحافت دونوں کو انھوں نے بلوچیت کے سانچے میں ڈھال رکھا تھا۔ بلوچستان اور سندھ کا ہر دشمن ان کا ذاتی دشمن تھا؛ اور دشمن کا دروازہ تکنا، اس سے ہنس کر ملنا، اس کا نمک کھانا حرام۔ اُس کا احسان اُٹھانا، مثلاً رہائشی پلاٹ لینا، رعایتی سفر کی سہولتیں حاصل کرنا، کاغذ کے پرمٹ پانا، اس کے خرچ پر بیرونی ملکوں کی سیر کرنا بالکل گویا لحم خنزیر۔ یہاں تک کہ اخبار کے لیے حکومت کے اشتہارات بھی قبول نہ کرتے۔ گرہ میں پیسے ہوتے تو پرچہ نکلتا ورنہ ناغہ۔ مگر ناغے کے بعد جب پرچہ آتا تو جیسے موالیوں کے سامنے دو آتشہ آ گئی ہو۔ آگے پیچھے کی سب کسر نکل جاتی۔ اگلے شمارے تک موذیوں کے گھروں میں کہرام مچا رہتا۔

نسیم تکوی مرحوم قلم رانی کے علاوہ دوسرے بھی فن جانتے تھے، مثلاً خردم (ایک دیسی ساختہ ہتھیار جو لوہے اور پلاسٹک کی تار سے بنا ہوتا ہے اس ایک سرے پر لوہے کا ایک گولہ بنا ہوتا ہے اور دوسرے سرے پر ایک کھانچہ جس میں لوہے کے گولے کو فٹ کیا جاتا ہے یہ ہتھیار کمر سے باندھ کر رکھا جاتا ہے) چلانا اور ٹکر مارنا۔ ہاتھ میں قلم کمر میں خردم۔ آدمی پر کیا پتہ کب وار ہو جائے، اس لیے پیشگی دفاعی بندوبست رکھتے تھے۔ ٹکر مارنے کا مطلب تھا سر سے سر ٹکرا کر مخالف کی پیشانی کی ہڈی توڑ دینا، ورنہ کم سے کم ماتھے کی کھال کو پھاڑ کر لہولہان کر دینا۔ جاپان کے جوڈو کراٹے کا یہ سندھی بلوچی نعم البدل تھا۔ دفعہ 144 لگی ہوئی ہو اور لاٹھی وغیرہ لے کر چلنے کی ممانعت ہو تب بھی آدمی اپنا بچاؤ کر

سکے۔ کتنے ہی ایڈیٹروں، اہلکاروں اور حریف کارکنوں پر اشتعال کے موقعوں پر تجربہ بھی کر چکے تھے۔

تقسیم سے پہلے ان کی تمنا تھی کہ موقع ملے تو سندھ آبزرور کے متعصب مہا سبھائی ایڈیٹر آں جہانی کو ٹمراج پنیا کا سر پھاڑ دیں۔ پنیا کو سر عبداللہ ہارون "منھ کا کالا دل کا کالا کوبرا" کہہ چکے تھے۔ رنگ روپ آں جہانی کا واقعی ایسا ہی تھا۔ قلم بھی کالے ناگ کی طرح زہر اُگلا کرتا۔ پنیا کو نسیم کی نیت کی خبر ہو چکی تھی۔ ان کے سائے سے بھی بچا کرتا۔ کراچی میونسپلٹی کے میئر کی پارٹی تھی۔ میں گیٹ سے اندر داخل ہو رہا تھا کہ پنیا تیز تیز قدم اٹھاتا وہاں سے باہر نکل رہا تھا۔ پارٹی شروع ہونے سے پہلے ہی وہاں سے رخصت ہونے کا سبب بتاتے ہوئے بولا "نسیم نامراد پارٹی میں آیا ہوا ہے۔ آنکھیں لال ہیں اور میری طرف دیکھ دیکھ کر دانت پیس رہا ہے۔ ممکن ہے میرے ساتھ کوئی حرکت کر بیٹھے۔ اس لیے جا رہا ہوں۔ تمھارا سندھی بھائی ہے؛ تم اسے سمجھاؤ کہ صحافی کو تشدد پسند نہیں ہونا چاہیے۔ ہو سکے تو ہمارے درمیان صلح کرا دو" مگر میں اس معاملے میں کوئی سرجوشی دکھاتا، اس سے پہلے ہی پنیا خود چوری چھپے بمبئی بھاگ گیا۔ تقسیم ہو جانے کے بعد اس کے قلم کا کھیل ختم ہو گیا۔

تقسیم کے بعد نسیم کے ذہن پر پنیا کے بجائے ایک نوارد، دوسرے ایڈیٹر کی صورت مسلط ہو گئی۔ یہ صاحب مسلمان تھے، سوائے رنگ روپ کے ان کی کوئی مشابہت یا مناسبت پنیا سے نہ تھی۔ مگر نسیم کو لگتا تھا کہ وہ سندھ اور سندھیوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور بلوچستان میں آئینی اصلاحات کے خلاف ہیں کیوں کہ نئی حکومت میں ان کی بہت چلتی ہے۔ ایک دن باتوں باتوں میں نسیم نے کہا کہ اس ایڈیٹر سے اثر، قلم یا زبان میں تو مقابلہ مشکل ہے؛ ارادہ ہے کہ کسی محفل میں اس سے تو تو، میں میں کر کے اس پر اپنا مخصوص ٹکر والا نسخہ استعمال کیا جائے۔

میں نے نسیم کو بہت ڈرایا۔ سمجھایا کہ اس ایڈیٹر کے سر پر حکومت کا ہاتھ ہے؛ اگر اس کے ساتھ کوئی گڑبڑ کی تو جیل کی ہوا کھانی پڑے گی۔ مگر نسیم بے خوف تھے۔ بولے کہ ہتھیار کوئی بھی استعمال نہیں ہوگا؛ کورٹ انسان کے سر کو ہتھیار یا اوزار ہرگز قرار نہیں دے سکتی، اس لیے جیل جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

خوش قسمتی یہ ہوئی کہ دوسرے فریق یعنی اُن ایڈیٹر صاحب، سے بھی میرے اچھے تعلقات تھے۔ میں نے انھیں پیشگی خبردار کر دیا کہ نسیم کس قسم کے آدمی ہیں اور ان کی جانب سے ضرر پہنچنے کے کیا

کیا امکانات ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد وہ نسیم کی خوب خوشامد کرنے لگے۔ جہاں کہیں نسیم پر نظر پڑتی خود دوڑ کر آتے، گلے ملتے اور ''ہیلو مائی ڈیئر مسٹر محمد نسیم خان صاحب'' کے القاب استعمال کر کے بلا وجہ کھیسیں نکالا کرتے۔

بد قسمتی سے چند سال بعد ایک ایسا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا جس پر میرے اور ان ایڈیٹر صاحب کے درمیان اختلاف پیدا ہوا۔ میرے نقطہ نظر کے خلاف تقریر کرنے کے لیے مخالف فریق نے ان ایڈیٹر صاحب کو تیار کیا اور دھوم دھام سے میٹنگ میں بھیجا۔ میٹنگ کی صدارت مجھی کو کرنی تھی۔ میں نے انتظام ایسا کیا کہ پہلی قطار میں جس صوفے پر ان ایڈیٹر صاحب کو بیٹھنا تھا اسی صوفے پر نسیم کے لیے بھی نشست رکھی گئی۔ ایڈیٹر صاحب نسیم کو اپنے برابر میں بیٹھا دیکھ کر حوصلہ ہار بیٹھے۔ انھیں یقین ہو گیا تھا کہ منھ سے ایک لفظ بھی نکلا تو نسیم انھیں ٹکر رسید کریں گے۔ جب انھیں تقریر کی دعوت دی گئی تو وہ دو تین بار ''صدر صاحب، حضور والا!'' کہہ کر دوبارہ کرسی پر ڈھیر ہو گئے۔ یہ دو لفظ بولتے ہوئے بھی ان کی نگاہیں نسیم پر جمی رہیں۔ آخر ہیبت کے مارے بے حال ہو گئے۔ اور تقریر نہ کر سکے۔ جن بزرگوں نے انھیں اتنے اہتمام سے میدان میں اتارا تھا ان کا مقصد خاک میں مل گیا۔

اب نسیم صاحب اور وہ ایڈیٹر صاحب دونوں اس جہاں سے رخصت ہو چکے ہیں۔ ان کے حق میں فقط دعائے مغفرت ہی کی جا سکتی ہے۔ دونوں تاریخ ساز تھے۔ دونوں لاجواب تھے۔

لیاری کراچی کے اُن علاقوں میں شامل ہے جہاں کے لوگوں نے مختلف شعبوں میں اپنا لوہا منوایا ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ لیاری کے لوگوں کی کامیابیوں اور مہارت کے بارے میں اتنا زیادہ نہیں لکھا گیا ہے۔ اب لیاری کی شناخت گینگ وار بدامنی بھتہ خوری کے حوالے سے ہوتی ہے۔

ہلکی دارو تیکھی دارو

کراچی کے سب سے قدیم مے خانے کا سُراغ تقریباً 300 سال قبل ملتا ہے۔ معروف ادیب اور دانش ور آغا سلیم اپنی کتاب رسالہ شاہ عبداللطیف بھٹائی میں سُر کلیان میں لکھتے ہیں کہ ''مومل جب رانو کے فراق میں جل کر راکھ ہوئی تو اس کی ایک چالاک اور حسین کنیز ناتہ نے بھی کاک محل چھوڑا اور کراچی کے قریب گڈاپ کے مقام پر رہنے لگی۔ گڈاپ میں اُس نے مے خانہ کھولا اور انگور کے رس کے مٹکے تیار کر کے بیچنے لگی۔ کچھ عرصے بعد اس کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ جس کا نام اس نے موکھی رکھا۔ موکھی ماں کی طرح حسین اور چالاک تھی۔ وہ جوان ہوئی تو اس کا حُسن اور نکھرا۔ دور، دور سے لوگ موکھی کو دیکھنے اس کے مے خانے میں آتے اور موکھی ناز و ادا سے ان کی میزبانی کرتی۔ ان دنوں وہاں آٹھ متاروں (شہ زوروں) کا شہرہ تھا۔ ایک دن ان متاروں نے بھی موکھی کے حسن کی دھوم سُنی۔ وہ موکھی کو دیکھنے اور اس کی انگوری شراب پینے مے خانے آئے۔ وہ اُسے دیکھ کر وہ اس پر فریفتہ ہو گئے۔ موکھی نے ان کے لیے پرانی شراب کے مٹکے کھولے۔ لیکن شراب نے ان پر کوئی اثر نہ کیا۔ وہ اور شراب مانگنے لگے۔ آخر کچھ شراب نے اور موکھی کے حُسن نے ان پر اثر کیا۔ وہ چلے گئے۔ کچھ دنوں بعد وہ پھر آئے اور موکھی سے شراب مانگی۔ موکھی کے پاس اتفاق سے پرانے مٹکے ختم ہو چکے تھے۔ اُسے اس بات کا بھی احساس تھا کہ تازہ شراب ان پر اثر نہیں کرے گی۔ اُسے یاد آیا کہ شراب کا ایک مٹکا کئی سالوں سے رکھا ہے۔ موکھی نے مٹکے کا ڈھکن کھولا تو پورا مے خانہ مہک اٹھا۔ متاروں نے شراب پی۔ ایسی شراب انھوں نے آج تک نہیں پی تھی۔ وہ مستی میں جھومتے ہوئے اپنی گھروں کو چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد موکھی نے خالی مٹکا اٹھایا تو اُسے سانپ کی ہڈیاں نظر آئیں۔ موکھی گھبرا گئی۔ اُسے یقین ہوگیا کہ زہریلی شراب پی کر متارے مر جائیں گے۔ لیکن ایک دن اچانک متارے مے خانے میں آئے۔ موکھی انھیں زندہ دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ موکھی جام بھر بھر کر متاروں کو پلاتی رہی۔ لیکن اس کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر انھوں نے پوچھا کہ پچھلی بار تم نے جو شراب پلائی تھی وہ اب کیوں نہیں پلا رہی۔ موکھی نے انھیں بتایا کہ وہ شراب زہریلی تھی۔ ان شہ زوروں نے شراب چکھی تھی

زہر پینا نہیں سیکھا تھا۔ یہ سنتے ہی آٹھوں مے خانے میں ہی مر گئے۔ قصہ اس سے بھی زیادہ طویل ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ مختصراً اس کا احوال آپ کی نظر کریں۔ اس داستان میں ہم سمجھے کہ شاہ عبدالطیف کا مقصد یہ ہے کہ وہی لوگ امر ہوتے ہیں جو زہر کو زم زم سمجھ کر پی جاتے ہیں۔ نہ کہ وہ جو زہر کا سن کر اُس کی ہیبت سے ہی مر جاتے ہیں۔ شاہ عبدالطیف فرماتے ہیں۔

تیغ تنی ہو گردن پر اور، لب پر جام پہ جام

خم کے خم خالی ہوں ہر سو، مے نوشی ہو عام

وہ کب تشنہ کام، جو پالیں حال و مستی

بُرا نہ چاہا موکھی نے اور، زہر کا تھا نہ اثر

بس ایک گھونٹ کی خاطر چوما، مے خانے کا در

جاں سے گئے گذر، بول میں زہر گھلا تھا

آپ یقیناً اسے ایک دیو مالائی داستان سمجھ رہے ہوں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ معروف مورخ گل حسن کلمتی اپنی کتاب کراچی سندھ کی ماروی کے صفحہ نمبر 366 پر لکھتے ہیں کہ سہراب گوٹھ سے حیدر آباد جاتے ہوئے نئی سبزی منڈی سے 8 کلومیٹر دور جا کر موکھی کی قبر تک پہنچا جا سکتا ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ تیسر ٹاون اسکیم سے پہلے صرف دیہہ تیسر کے علاقے اسکیم میں شامل تھے۔ لیکن موجودہ حکومت نے دیہہ موکھی کو بھی اس اسکیم میں شامل کر لیا ہے۔ بل ڈوزر موکھی کی قبر اور اس کے ساتھ موجود قبرستان کو ختم کرنے وہاں آئے۔ لیکن آس پاس کے دیہاتیوں نے ہمت کر کے انھیں واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ لیکن کسی بھی وقت رات کے اندھیرے میں مورڑو کے بھائیوں کے قبروں کی طرح موکھی کی قبر کو بھی مسمار کر دیا جائے گا۔ (مورڑو کا قصہ بھی آپ کو سنائیں گے) یہ تو رہی کراچی کے پہلے مے خانے کی تاریخ۔ جو بہت ہی قدیم ہے۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ کراچی کے علاقے ملیر کی مشہور دیہہ شرافی نہیں بل کہ شرابی ہے۔ سرکاری رکارڈ میں آج تک اس کا نام شرابی ہے۔ مورخ و محقق گل حسن کلمتی اپنی کتاب کراچی سندھ کی ماروی کے صفحہ نمبر 521 پر لکھتے ہیں کہ خداداد گبول (خداداد کالونی ان ہی کے نام سے

منسوب ہے اور اس زمین کے مالک بھی وہ تھے) کے حوالے سے یہ بات عام تھی کہ انگریزوں کے دور میں جب کسی بھی سرکاری زمین کی نیلامی ہوتی تھی تو وہ ہمیشہ زیادہ سے زیادہ بولی دے کر اُسے خرید لیتے تھے۔ مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ ہمیشہ شراب کے نشے میں رہتے تھے۔ اس لیے اُن کی ملکیت کا علاقہ شرابی مشہور ہوا۔ دیہہ شرابی لانڈھی تحصیل میں واقع ہے۔ قدیم سندھ میں شراب کشید کرنا اور پینا کوئی بری بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔ شراب بنانے کے الگ الگ طریقے تھے۔ لوک رام ڈھوڈھیجا اپنی کتاب میرا وطن میں لوگ کے صفحہ نمبر 326 پر ''شراب کی بھٹیاں اور نشہ'' کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ سندھ کی شراب اعلیٰ اور معیار میں بہتر ہونے کی وجہ سے دیس پردیس میں مشہور تھی۔ انگریز، یوروپی شراب کے مقابلے میں سندھی شراب پسند کرتے تھے اور سوغات کے طور پر اسے اپنے ملکوں میں بھی لے جاتے تھے۔ سندھ کے بڑے شہروں میں بھی شراب کی بھٹیاں ہوتی تھیں۔ جہاں سے شراب خانے شراب تیار کرواتے تھے۔ شوقین سیٹھ اور زمین دار اپنا کچا مال (انگور، کھجور، مشک، سونف، زعفران، گلاب، گڑ اور ببول کی چھال) دے کر اپنی پسند کے مطابق تیکھی یا ہلکی ''دارو'' تیار کرواتے تھے۔ جوان بیویوں کے ''ادھیڑ عمر'' مرد، دنبے کے گوشت کی شراب تیار کرواتے تھے۔ جو جنسی طاقت کے لیے جوشیلی اور شہ زور سمجھی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک امیرانہ شہوتی شراب تیار کی جاتی تھی۔ دیسی شراب کی 24 بوتلوں میں یونانی حکیم سے حاصل کردہ قوت باہ کا مصالحہ جس میں ستر تیتروں اور دنبے کی چربی بھٹی پر رکھ کر اُسے کاڑھ کر اس سے بوتلیں بنائی جاتی تھیں۔ بوتلوں میں کستوری، عنبر، مشک، ثابت دانہ اور مصری ڈال کر اُسے ملتانی مٹی لیپ کر بند کر کے کیکرے کے درخت کی جڑ میں ڈال دیا جاتا تھا۔ چھ ماہ بعد جب وہ بوتلیں باہر نکالی جاتی تھیں۔ تو ایسی پُر جوش شراب بن جاتی تھی جس کا خمار عادی شرابی بھی برداشت نہیں کر پاتے تھے۔ اس شراب میں کباب ڈبو کر کھائے جاتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود مغز میں تراوٹ اور خمار طاری ہو جاتا تھا۔ لیکن پھر سرکار نے انگریزی شراب کی فروخت میں اضافے کے لیے یہ بھٹیاں بند کروادیں۔ لیکن چوری چھپے اس کی تیاری جاری رہی۔ کراچی کے حوالے سے ماہر شہریات عارف حسن کا مضمون جو نامور ادیب اجمل کمال کی مرتبہ کتاب کراچی کی کہانی میں شائع ہوا میں لکھا ہے کہ ''صدر میں بڑی تعداد میں شراب خانے اور بلیرڈ روم تھے۔ پیراڈائز سینما کے بلمقابل ''رٹز بار'' نفیس شراب خانوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس میں ٹیک کے فریموں

والے شیشے کے پارٹیشن اور جستے کا بنا ایک کاونٹر تھا۔ کبھی کبھی انتظامیہ کی طرف ہندوستانی فلموں کے گانے بجائے جاتے، جن سے متاثر ہو کر کئی گاہکوں کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ ایمپریس مارکیٹ میں ''اولڈ ٹوڈی شاپ'' جہانگیر پارک کے سامنے ''یوبار'' (U Bar) اور ٹرام پٹے پر ''ونرز بار'' زیادہ عوامی نوعیت کے شراب خانے تھے۔ اسلامائزیشن کے ساتھ ہی شراب خانے معدوم ہو گئے اور صرف ایک بلیرڈ روم جو لکی اسٹار کے نزدیک ہے باقی رہ سکا۔ سینئر فوٹو جرنلسٹ ظفر صاحب نے ہمیں بتایا کہ بہ حیثیت فوٹو جرنلسٹ 1972 میں انھوں نے کراچی میں اپنے کام کا آغاز کیا اس سے قبل وہ حیدر آباد میں کام کرتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ کراچی کا سب سے منہگا بار روم ہوٹل Exeelsors ہوٹل میں جس کا ٹکٹ 350 روپے ہوتا تھا اس میں صرف صاحب حیثیت اور انتہائی امیر لوگ جاتے تھے۔ بار روم میں کیبرے ڈانس بھی ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ سول لائن پولیس اسٹیشن کے ساتھ تاج ہوٹل ہوتا تھا جو بعد میں Pecocke ہوٹل بنا۔ اس میں بھی بار تھا۔ اس بار میں متوسط طبقے کے لوگ جاتے تھے۔ میٹروپول ہوٹل میں Oasis بار تھا جو بعد میں چائنیز ریسٹورینٹ بن گیا تھا۔ ایئر پورٹ روڈ پر کبانا بار ہوتا تھا جبکہ صدر میں موجودہ یونائیٹڈ ہوٹل کے پاس بھی ایک بار تھا جو لال پری کے نام سے مشہور تھا۔ اس بار میں غریب طبقے کے لوگ جاتے تھے۔ اسی طرح فریئر مارکیٹ میں رومانا، شبانہ کلب ہوتا تھا۔ رومانا، شبانہ دونوں کلب میں ڈانس کرتی تھیں اس لیے یہ کلب ان کے نام سے مشہور تھا اس کلب کا ٹکٹ 30 روپے تھا۔ یہ تمام مے خانے 1977 میں اس وقت بند ہوئے جب ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف پاکستان قومی اتحاد نے نظام مصطفی کی تحریک چلائی۔ اس تحریک کا اثر کم کرنے کے لیے بھٹو صاحب نے شراب خانوں پر پابندی اور جمعہ کی چھٹی کا اعلان کیا۔ لیکن یہ قدم ان کو بچا نہ سکا۔ بالآخر ان کے خلاف تحریک کے نتیجے میں ضیاء الحق نے مارشل لاء لگا دیا اور کچھ عرصے بعد اسلامی نظام کے نفاذ کا اعلان کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ بھٹو صاحب کی جانب سے لگائی گئی شراب کی فروخت پر عائد پابندی ختم کر دی۔ اب کراچی کے مختلف علاقوں میں پچاس سے زیادہ شراب خانے ہیں جہاں ہر قسم کی پاکستانی شراب بہ آسانی دست یاب ہے۔ لیکن یہ شراب خانے موکھی کے مے خانے یا ساٹھ کی دہائی میں کراچی میں موجود مے خانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ کیوں؟ ذرا یہ نوٹس تو پڑھ لیں۔

مری ماتا مندر اور امام حسین کا تعزیہ

ایک دن ہمیں وشال نامی شخص نے فون کیا اور ہماری معلومات میں یہ اضافہ کیا کہ وہ ڈان ڈاٹ کام پر ہمارے بلاگ پڑھتے رہتے ہیں۔ انھوں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ رتن تلاؤ کے علاقے میں واقع مری ماتا مندر پر لکھیں۔ جہاں ہندو برادری کے افراد کو اپنی مذہبی رسومات ادا کرنے سے روکا جاتا ہے۔ ہم نے اُن سے درخواست کی کہ وہ شام 7 بجے ہمیں پریس کلب میں ملیں۔ وشال 7 پریس کلب پہنچے۔ اُن کے ہاتھ میں ایک بازو کی تھیلا تھا (جسے ہم شولڈر بیگ کہتے ہیں)۔ ملاقات کے دوران انھوں نے اپنا تھیلا کھولا اور ہمارے سامنے دستاویزات کے انبار لگا دیے۔ ہم نے اُن میں سے کچھ کا اِنتخاب کیا اور باقی انھیں لوٹا دیے۔ اگلا مرحلہ مری ماتا مندر کا دورہ کرنا اور اُس کے بارے میں لکھنا تھا۔

کراچی کے مرکزی علاقے صدر کے قریب ایک علاقہ رتن تلاؤ ہے۔ تلاؤ سندھی زبان میں تالاب کو کہتے ہیں۔ رتن تلاؤ ایک طویل موضوع ہے۔ فی الوقت ہمارا موضوع رتن تلاؤ کے درمیان اکبر مارکیٹ ہے جہاں مری ماتا مندر ہے۔ یہ کراچی کی سب سے بڑی موٹر سائیکل مارکیٹ ہے۔ اکبر مارکیٹ میں ایک سڑک سسٹر اسکوائر اسٹریٹ کے نام سے ہے۔ اب اس اسٹریٹ کا نام گلی نمبر 19 ہے۔ اسٹریٹ پر مختلف عمارتوں کے درمیان آپ کو ایک چھوٹا سا لوہے کا گیٹ نظر آئے گا۔ اِس گیٹ پر ایک جانب اللہ اور ایک جانب یا محمدؐ جب کہ درمیان میں ''مائی جنت کا تازیہ'' لکھا ہے۔ گیٹ کے آس پاس سبز رنگ کے جھنڈے لگے ہوئے ہیں۔ یہ سبز رنگ کے جھنڈے عموماً وہ سُنی مسلمان اپنے گھروں پر لگاتے ہیں، جو اہلِ تشیع کے مذہبی عقائد کے قریب ہوتے ہیں۔ بس غمِ حسین میں تعزیے کے جلوس نکالتے ہیں۔ ایک نقشے کے مطابق اِس مندر کا کُل رقبہ 285 گز تھا جو اَب سُکڑتے سُکڑتے 50 گز رہ گیا ہے۔ یہاں ہندو اپنی مذہبی رسومات ادا کرتے ہیں۔ اور محرم میں اس مندر سے امام حسین کا تعزیہ بھی برآمد کیا جاتا ہے۔ اصل مسئلہ اس مندر کی ملکیت کا ہے۔ لیکن جن فریقوں کے درمیان یہ تنازعہ ہے، وہ 285 گز کی ملکیت پر نہیں بلکہ 50 گز کی ملکیت پر ہے، جو کہ باقی رہ گئی ہے۔ دونوں فریقین اپنے اپنے موقف پر قائم ہیں۔ معاملہ مقدمے بازی تک پہنچ گیا ہے۔ اہلِ محلہ نے مندر

کی ملکیت کے دعوے دار ہندو برادری کے افراد کے خلاف درخواست انتظامیہ کو دی ہے۔ جب کہ مندر پر ملکیت کے دوسرے دعوے داروں نے بھی انتظامیہ کو درخواستیں دی ہیں۔ 2014 کو اکبر مارکیٹ کے رہائشیوں نے متعلقہ تھانے کو ایک درخواست دی جس کا متن حسبِ ذیل ہے:

''ہم تمام اہلِ محلہ گلی نمبر 19 اکبر روڈ رتن تلاؤ کراچی آپ جناب سے عرض کر رہے ہیں کہ اکبر روڈ رتن تلاؤ پر قائم شری مری ماتا مندر اور اس مندر میں موجود حضرت امام حسین کا تعزیہ جو بہت قدیمی ہے، جس کی پوجا اور عبادت کرنے کے لیے تمام مذاہب کے لوگ جن میں ہندو، مسلم اور پارسی دور دور سے آتے ہیں اور اپنی مذہبی رسومات ادا کرتے ہیں۔ یکم مئی 2014 کو کچھ شرپسند افراد جو اسلحہ سے لیس تھے اور اپنے آپ کو ہندو ویلفیئر ایسوسی ایشن کے نمائندے بتا رہے تھے، جن میں آتما پرکاش چنانی، نان جی، وشال، وجے مہاراج اور ساتھی شامل تھے۔ وہ یہ بتا رہے تھے کہ یہ مندر ابھی کھولا گیا ہے جو کہ درحقیقت غلط ہے۔ ان افراد کا کہنا تھا کہ اس مندر میں تعزیے کی عبادت نہیں ہو سکتی۔ جناب ہم تمام اہلِ محلہ محمودہ زوجہ عبداللہ اور ان کے پریوار کو چالیس سال سے شری مری ماتا مندر اور حضرت امام حسین کے تعزیے کی خدمت کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ انھوں نے آج تک کسی بھی مذاہب کے افراد کو نہیں روکا کہ آپ مندر میں تعزیے کی عبادت نہ کریں۔ ہم تمام اہلِ محلہ آپ جناب سے گزارش کر رہے ہیں کہ ان شرپسند عناصر کی وجہ سے پھیلی ہوئی بے چینی اور محمودہ زوجہ عبداللہ اور ان کے پریوار کو ملنے والی دھمکیوں اور مندر پر قبضہ کرنے والی سازشوں کو روکا جائے۔'' (اس درخواست کی خوبصورت بات یہ ہے کہ اس کے لکھنے والے مسلمان ہیں لیکن الفاظ ہندو ہیں۔ جیسے پریوار، پوجا، شری مری ماتا مندر۔)

اسی طرح کی ایک درخواست شری مہاراشٹرا پنچائت کراچی کے وشال راجپوت کی جانب سے کمشنر کراچی کو بھیجی گئی۔ 12/1/2015 کو کمشنر کراچی کو درخواست کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ:

''ہمارا مقدس مندر (مری ماتا مندر) پلاٹ نمبر: 303/B سسٹر اسکوائر اسٹریٹ، رتن تلاؤ، اکبر روڈ کراچی نمبر: 3 میں واقع ہے جو کہ پچھلے کئی سالوں سے زیرِ قبضہ ہے۔ اس مندر پر غیر قانونی قبضہ کرنے والوں کے خلاف ہم لوگوں نے گورنمنٹ کے مختلف اداروں میں درخواست بھی جمع کروائی ہے جس کی کاپیاں ہم اس درخواست کے ساتھ منسلک کر رہے ہیں اور اس مندر سے متعلق اسسٹنٹ کمشنر

ساؤتھ کراچی صاحب کے پاس ہمارے اوپر زیرِ دفعہ 107/117 کا کیس چل رہا ہے اور ہم لوگ ہر تاریخ پر پیش ہو کر اپنا موقف جو ہمارے ساتھ ظلم ہو رہا ہے وہ اسسٹنٹ کمشنر ساؤتھ صاحب کو بھی بتاتے ہیں مگر ہمیں انصاف ملنے کے بجائے تاریخ پہ تاریخ ہی مل رہی ہے۔''

پیر 11 مئی کو میں اور ساتھی محسن سومرو اکبر روڈ پر واقع موٹر سائیکل مارکیٹ کی گلی نمبر 19 سِسٹر اسکوائر اسٹریٹ پر مری ماتا مندر کے گیٹ پر پہنچے۔ گیٹ کے باہر موٹر سائیکلیں کھڑی ہوئی تھیں اور مندر کی نگران خاتون دکان داروں سے موٹر سائیکلیں ہٹانے کا کہہ رہی تھیں۔ اُن کی اس درخواست پر کم ہی توجہ دی جا رہی تھی۔ لہٰذا محسن بھائی اور میں نے موٹر سائیکلیں ہٹانا شروع کیں۔ یہ دیکھ کر سامنے کی دُکان پر موجود ایک نوجوان بھی ہماری مدد کرنے آ گیا۔ خیر بڑی مُشکل سے ہم مندر تک کا راستہ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ خاتون نے ہم سے آنے کی وجہ دریافت کی تو ہم نے انھیں بتایا کہ ہمیں امام حسینؑ کا تعزیہ دیکھنا ہے۔ وہ ہمیں اندر لے آئیں۔ وہاں پر ایک چھوٹا سا صحن تھا اور اُس کے سامنے دو کمرے تھے جن پر تالا پڑا ہوا تھا۔ صحن کے بائیں جانب ایک چبوترا سا بنا ہوا تھا۔ خاتون جنھوں نے اپنا نام محمودہ بتایا تھا، نے ہمیں چبوترے پر لگا پردہ ہٹا کر تعزیہ دکھایا۔ اُن کے مطابق مائی جنت اُن کی والدہ تھیں اور 1957 سے تا دم مرگ اِس تعزیے اور مندر کی نگران تھیں۔ اُن کی وفات کے بعد یہ ذمے داری اُن پر آن پڑی۔ انھوں نے بتایا کہ ہر سال محرم کی نو اور دس تاریخ کو تعزیے کو زیارت کے لیے باہر لایا جاتا ہے۔ اس رسم میں ہندو اور مُسلم سب ہی شریک ہوتے ہیں۔ ہندو مندر میں اپنی پوجا پاٹھ کے لیے آتے رہتے ہیں۔ ہم مندر میں نصب قدیم تختیوں کی تصاویر بنانے لگے جس پر وہ طنزیہ انداز میں مُسکراتے ہوئے کہنے لگیں کہ: ''بنالو بنالو، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ ابھی پچھلے دِنوں سوامی نارائن مندر میں ہندوؤں کی بڑی پوجا تھی۔ ٹی وی والے فلم بنانے آئے تھے لیکن مندر والوں نے اُنھیں بھگا دیا۔'' ہم نے یہ سُنتے ہی کیمرہ بند کیا اور اُن سے رُخصت کی اِجازت چاہی۔ ہندو پنچائت کراچی کے نائب صدر ڈاکٹر راج اشوک نے ہمیں بتایا کہ مندر کا کُل رقبہ 286 گز تھا۔ جواب سُکڑ کر 50 گز رہ گیا ہے۔ اُنھوں نے اس بارے میں ایک دستاویز بھی ہمارے حوالے کی۔ جس میں لکھا ہے کہ مندر کی زمین 1938 میں الاٹ کی گئی تھی۔ اُن کے مطابق بنیادی طور پر یہ مندر ہے۔ وہ تعزیے کی موجودگی کو تسلیم نہیں کرتے۔ مندر کے دروازے پر کچھ بھی لکھا ہو۔ اہم بات یہ ہے کہ 9 مئی 2015 کو سندھ کے

مختلف مندروں کی مرمت اور تزئین و آرائش کے لیے ایک اشتہار شائع ہوا ہے۔ اس میں مری ماتا مندر کا نام بھی شامل ہے۔ یعنی رے کارڈ کے مطابق یہ مندر ہے۔ لیکن 12/7/1978 کو ہونے والے ایک معاہدے کے مطابق مہاراشٹرا پنچائت نے اس بات کی اجازت دی تھی کہ تعزیہ مندر میں اس شرط پر رکھا جائے گا کہ جب ضرورت ہوگی مندر کی جگہ خالی کر دی جائے گی۔ یہ اس معاہدے میں لکھا ہے۔ مائی کا تازیہ (تعزیہ) ہمارے مندر یعنی مری ماتا مندر میں تقریباً تیس سال سے رکھا جا رہا ہے، اور ہمارے بزرگوں کی اجازت سے رکھا جا رہا ہے، اس تازیے (تعزیے) کو ہماری برادری کے لوگ بھی مانتے ہیں، آپ اس بات کا خیال کریں گے کہ جب بھی ہماری پنچائت کو اس جگہ کی ضرورت ہوگی آپ کو یہ جگہ خالی کرنا ہوگی، یہ معاہدہ جانو بھائی فیروز شاہ اور موہن گائیکواڑ جو شری شام سوموونش مہاراشٹرا پنچائت کے سیکریٹری تھے، کے مابین ہوا تھا۔ یہ دستاویز بھی ہمیں وشال نے فراہم کی تھی، مندر کی نگراں محمودہ بیگم کو ہندوؤں کے پوجا پاٹھ پر کوئی اعتراض نہیں۔ جبکہ ہندوؤں کا کہنا یہ ہے کہ مندر جاتے ہوئے وہ عدم تحفظ کا شکار رہتے ہیں۔ یہ بات سچ ہے کہ یہ مندر ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ مندر میں تعزیہ بھی موجود ہے، یوں تو یہ مذہبی رواداری کی ایک خوبصورت علامت ہے، لیکن محمودہ بیگم اور ہندوؤں کے درمیان مندر کی ملکیت کے تنازعے کو کس طرح حل کیا جائے ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا۔

مسٹر جیمز اسٹریچن اور مولانا وفائی

کراچی کی تعمیر و ترقی میں یوں تو بے شمار لوگوں نے حصہ لیا لیکن ان میں ایک بہت بڑا نمایاں نام مسٹر جیمز اسٹریچن کا ہے۔ اسی طرح سیاسی و صحافتی حوالے سے مولانا دین محمد وفائی بھی ایک سرکردہ شخصیت تھے۔

سب سے پہلے ذکر کرتے ہیں جیمز اسٹریچن کا جو پیشے کے حوالے سے انجینئر تھے۔ محمد عثمان دموہی اپنی کتاب کراچی تاریخ کے آئینے میں جیمز اسٹریچن کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

" کراچی کی دل و جان سے خدمت کرنے والا یہ انگریز انجینئر کراچی کو لندن کی طرز پر ترقی دینے کا خواہاں تھا۔ وہ نہایت ذہین اور قابل انسان تھا۔ اگرچہ وہ بنیادی طور پر ایک ریلوے انجینئر تھا مگر شہری منصوبہ بندی میں بھی زبردست مہارت رکھتا تھا۔ اس کا 1873 میں کراچی میونسپلٹی کے چیف انجینئر اور سیکریٹری کے طور پر تقرر ہوا تھا۔ اس نے اپنی غیر معمولی ذہانت، محنت اور لگن سے کراچی شہر کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔

انھوں نے ہی کراچی کے شہریوں کو ٹیلی فون اور بجلی کی سہولتیں بہم پہنچانے کے لیے پہلی دفعہ منصوبے بنائے اور وہ اپنی بلدیہ کی ملازمت کے دوران ہی ٹیلی فون کی سہولت اہل کراچی تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ مگر شہر کو بجلی کی فراہمی اس کے کراچی سے تبادلے کے بعد ممکن ہوئی۔ اس کی کوششوں کے نتیجے میں گھر گھر پانی کے کنکشن دیے گئے تھے۔ اس سلسلے میں اسے پانچ سو پونڈ کا انعام بھی پیش کیا گیا تھا۔

بلدیہ کراچی کی جانب سے شائع ہونے والے رسالے میں جیمز اسٹریچن کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ ان تفصیلات کے مطابق 1873 میں ایک انجینئر جیمز اسٹریچن کا تقرر بلدیہ کے انجینئر کی حیثیت سے ہوا۔ وہ بہت غیر معمولی ذہانت کے مالک تھے، انھوں نے اس شہر کا نقشہ ہی بدل دیا۔ ایمپریس مارکٹ بنوائی، میری ویدر ٹاور بنوایا، ٹراموے کمپنی قائم کرائی۔ ٹرام چلوائی، کیماڑی کا اسپتال بنوایا، ایک آرٹس کالج قائم کیا، کئی مارکیٹیں بنوائیں، سڑکیں بنوائیں اور بلدیہ کا دفتر میکلوڈ روڈ پر زیادہ

بڑی جگہ منتقل کیا۔

اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے پانی کی سپلائی کی ایک اسکیم حکومت کو پیش کی اور یہ بھی دھمکی دی کہ اگر بلدیہ کو یہ قرض نہ ملا تو پھر اسے اپنے وسائل سے اس اسکیم پر عمل درآمد کرنا ہوگا۔ جن میں سرکاری گاڑیوں (فوجی) سے موٹر وہیکل ٹیکس کی وصولی، ٹرانزٹ ڈیوٹی میں اضافہ بھی شامل تھا۔

ٹیکس کی نئی تجاویز اور ان سے حاصل ہونے والی آمدنی کی تفصیل بھی اس کے ساتھ ہی حکومت کو پیش کردی گئی۔ چناں چہ حکومت نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے پہلی بار اس کی منظوری دے دی۔ اور جیمز اسٹریچن کو یہ فرض سونپا گیا کہ وہ اپنی نگرانی میں اس اسکیم پر عمل کرائیں۔

لاگت کا ابتدائی اندازہ 12 لاکھ روپے تھا لیکن حکومت نے کٹوتی کرکے آٹھ لاکھ کردیا۔ چنانچہ پائپ کا قطر کم کردیا گیا اور صرف دو کنوئیں بنائے گئے۔ 18 فروری 1880 کو پہلا ریزروواٹر تیار ہوا اور اپریل 1883 میں یہ اسکیم مکمل ہوگئی، گورنر بمبئی نے اس کا افتتاح کیا۔

کیپیٹل آف سندھ نامی کتاب کے مطابق اس طرح کراچی میں پہلی بار نلکوں کے ذریعے پانی کی سپلائی شروع ہوئی۔ اسی ہزار کی آبادی کے لیے فی کس 45 گیلن یومیہ کے حساب سے پانی ملنے لگا اتنی وافر مقدار میں پانی اس شہر کے باسیوں کو پھر کبھی نصیب نہیں ہوا۔ اس اسکیم پر آٹھ لاکھ 54 ہزار روپے صرف ہوئے حکومت نے اس کارنامے پر جیمز اسٹریچن کو انعام دیا کیونکہ اس طرح حکومت کو سالانہ 20 ہزار روپے کی بچت ہوئی جو اسے فوج کے لیے پانی سپلائی کرنے پر صرف کرنا پڑتا تھا۔

واٹر سپلائی اسکیم مکمل ہو جانے کے بعد شہر میں جگہ جگہ عوامی نلکے لگا دیے گئے۔ گھر گھر کنکشن لگانے کا کام بھی انجام دیا جانے لگا۔ نیز کنوئیں بند کردیے گئے۔ صرف ان مقامات جہاں نل نہیں پہنچا وہاں کنوئیں کام کرتے رہے۔

مسٹر اسٹریچن نے پانی کی سپلائی میں اضافہ کرنے کی بھی کوشش کی اور پانی کی مقدار 30 لاکھ گیلن یومیہ سے 35 لاکھ گیلن یومیہ ہوگئی اس طرح میونسپلٹی کے پاس 5 لاکھ گیلن یومیہ فالتو پانی ملنے لگا یہ پانی اس شہر میں درخت لگانے، باغیچے بنانے اور پارک بنانے پر صرف کیا گیا۔

پانی کی سپلائی کے ساتھ ساتھ گندے پانی کی نکاسی کی ایک علیحدہ اسکیم بھی انھوں نے بنائی جس پر لاگت کا اندازہ ساتھ لاکھ تھا۔ یہ اسکیم بھی منظور ہوگئی اور کام شروع کردیا گیا۔ جیمز اسٹریچن نے

انگلینڈ میں معیار زندگی کو ذہن میں رکھتے ہوئے کام کیا تھا لہٰذا گھر گھر پانی کا کنکشن دینا شروع کیا لیکن اس کے لیے بہت زیادہ رقم پائپ خریدنے پر صرف ہو رہی تھی اس لیے عوامی نلکے بڑھا دیے گئے اس وقت شہر میں 238 نلکے لگائے گئے اور شہر کے مختلف اہم مقامات پر فوارے نصب کیے گئے۔

جیمز اسٹریچن نے ٹراموے کمپنی قائم کرنے کے لیے کئی یورپی تاجروں سے بات کی اور اخراجات اور آمدنی کے گوشوارے بنا کر دیئے۔ چنانچہ ٹراموے کمپنی بنائی گئی، لیکن، جب تک ٹرامیں چلیں، جیمز اسٹریچن کا بلدیہ سے تبادلہ ہو چکا تھا۔

اسٹریچن نے سڑکوں کی روشنی کے لیے بجلی استعمال کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ اور نجی بجلی کمپنی قائم کرانے کے لیے دوڑ دھوپ کی۔ لیکن یہ مقصد اس زمانے میں پورا نہیں ہو سکا کیونکہ یورپی حکمرانوں کو اس شہر سے اتنی زیادہ دلچسپی نہ تھی۔

بہرحال شہر کا نقشہ کافی تبدیل ہو گیا۔ جہاں گرد اڑتی تھی پارک اور باغ نظر آنے لگے۔ مکانات اور بنگلوں کے ساتھ درخت لگ گئے اور شہر کی حالت بالکل بدل گئی۔ کلفٹن اس زمانہ میں سمندر کے کنارے نہانے کی عمدہ جگہ تھی۔ لوگ سمندر کا نظارہ کرنے یہاں جمع ہوتے تھے۔ چنانچہ اس زمانے میں کلفٹن تک ٹریک بنایا گیا اور روشنی کا انتظام کیا گیا۔

اسٹریچن نے ہی سڑکوں پر روشنی کے لیے کیروسین (مٹی کا تیل) استعمال کرنے کی منظوری کرائی۔ کیوں کہ کھوپرے کا تیل عموماً بتی جلانے والے سیڑھی بردار عملہ مقامی لوگوں کی جاتی تھی چنانچہ بلدیہ نے مٹی کے تیل کے استعمال کی منظوری 1883 میں دے دی اس وقت ساٹھ میل طبعی طویل سڑک پر ایک ہزار بتیاں لگائی گئی تھیں۔

مولانا دین محمد وفائی کے بارے میں جی ایم سید اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ مولوی صاحب نے تصنیف و تالیف کا کام بہت زیادہ کیا ہے۔ ان کی تحریر کردہ کتابوں میں نمایاں سوانح حضرت محمد مصطفیٰ، سوانح صدیق اکبر، سوانح فاروق اعظم، سیرت عثمان، سیرت حیدر کرار کرم اللہ وجہہ، سوانح خاتون جنت، سوانح غوث اعظم، نو مسلم ہندو مہارانیاں الختم علیٰ فہم الحضر (رد قادیانی)، ہندو دھرم اور قربانی شامل ہیں۔

مزید لکھتے ہیں کہ 1940 میں جب میں وزیر تعلیم مقرر ہوا تو سندھی ادب کی بہتری اور اس کے

فروغ کے لیے سندھی، ادبی مرکزی صلاح کار بورڈ قائم کیا اور مولوی صاحب کو رکن نامزد کیا۔ علاوہ ازیں سندھی لغت تیار کرنے کے لیے بھی ایک کمیٹی مقرر کی۔ جس میں مولوی فتح محمد سہوانی، جیٹھ مل پرس رام، عثمان علی انصاری، ڈاکٹر داؤد پوتہ اور مولوی دین محمد وفائی نے مشترکہ طور پر موجودہ سندھی لغت کی پہلی جلد تیار کی۔

قیام پاکستان کے بعد سندھی، درسی کتابوں میں از سر نو تیار کرنے کے لیے 1949 میں ایک کمیٹی قائم کی گئی تھی۔ مولوی صاحب اس کمیٹی کے بھی رکن تھے۔ مولوی صاحب ایک نامور صحافی تھے پیر علی محمد راشدی اپنی کتاب وہ دن وہ لوگ میں لکھتے ہیں کہ جس وقت مولوی صاحب الوحید اخبار کے ایڈیٹر ہوئے وہ بڑا صبر آزما دور تھا۔ اس زمانے میں الوحید اخبار کے ایڈیٹر ہونے کے معنی یہ ہوتے تھے کہ ایک پیر الوحید پریس میں تو دوسرا پیر جیل۔

الوحید کے ایڈیٹر مسلسل گرفتار ہوتے رہتے تھے لیکن یہ سیٹ کبھی خالی نہ رہی۔ مولانا دین محمد وفائی ان جاں باز غریبوں میں سے تھے جنھوں نے اپنے ذہن اور قلم کے زور سے اپنی تمام عمر دشواریوں میں گزار کر سندھ میں آزادی اور عزت نفس کے جذبے کو بیدار کیا۔

جہاں تک ان کی تحریروں کا تعلق ہے مجھے ان کا ایک مضمون خاص طور پر بہت پسند آیا۔ جو الحزب سکھر میں شائع ہوا تھا۔ اس کا عنوان "عشاق کانفرنس" تھا۔ مضمون میں دنیا کے نام ور عاشقوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے ان کے عشق کی وارداتیں ان کی زبانی بیان کرائی گئیں تھی۔

مولوی دین محمد کے بارے میں جو بھی تحریریں ملی ہیں۔ اس سے ان کی شخصیت پر مذہبی رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ سندھ کی ترقی اور تعلیم کو تمام چیزوں پر ترجیح دیتے تھے۔

جیمز اسٹریچن کا ذکر تو ہم پہلے ہی کر چکے ہیں اور مولوی صاحب کا حال بھی ہم نے بیان کر دیا۔ جیمز اسٹریچن کی خدمات کے صلے میں کراچی میں ایک سڑک ان کے نام سے منسوب کی گئی تھی۔ یہ سڑک پاکستان چوک سے شروع ہو کر آرٹس کونسل پر ختم ہوجاتی ہے۔

یہ سڑک اب سرکاری طور پر مولوی دین محمد وفائی روڈ ہے۔ لیکن اس پوری سڑک کا دورہ کرنے کے باوجود ہمیں اس نام کا کوئی سرکاری بورڈ نظر نہیں آیا۔ لیکن البتہ دو تین عمارتوں پر سڑک کا نام مولوی

دین محمد وفائی روڈ لکھا ہوا ہے۔ لیکن جیسے ہی آپ پاکستان چوک سے اس سڑک پر سفر کا آغاز کریں گے تو بائیں جانب ٹریفک پولیس چوکی کے بعد ایک گودام کی عمارت ہے جس پر تا حال سڑک کا پتہ اسٹر یچن روڈ لکھا ہوا ہے۔ آپ ہی شاید اس تحریر کو پڑھنے کے بعد میری رہ نمائی کر سکیں کہ میں اس سڑک کو کس نام سے یاد کروں۔

بلاگز اور ان پر تبصرے

یوں تو ہمارے بلاگز پر بے شمار تبصرے کیے جاتے ہیں لیکن دو تبصرے ایسے ہیں
جن کا ذکر ناگزیر ہے یہ تبصرے دو پڑپوتوں کی جانب سے اپنے پڑدادا کے
حوالے سے ہیں جو ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

جناب سب سے پہلے میں اپنا تعارف کرانا چاہوں گا۔ میرا نام سشیل پریم ہرچند رائے ہے۔
میں سیٹھ ہرچند رائے وشنداس کا پڑپوتا ہوں۔ میں نے اپنے خاندان کے بارے میں آپ کی تحریریں
پڑھی ہیں اور میرے خاندان کی شخصیات کو تاریخ کا حصہ بنانے پر میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ اس
حوالے سے میرے پاس کچھ کتابیں اور مضامین بھی ہیں جو میں آپ کو فراہم کرنا چاہتا ہوں۔ آپ
سے رابطہ اور مزید کچھ جاننا میرے لیے اعزاز کی بات ہوگی۔ شکریہ

سشیل ہرچند رائے
ممبئی

(کراچی روشن کرنے والا، ص 132)

آپ کا جیمز اسٹر یچن کے حوالے سے لکھا ہوا بلاگ مجھے ایک دوست کے توسط سے موصول ہوا۔ جیمز اسٹر یچن میرے پردادا تھے۔ وہ میری دادی کے بزرگوں میں سے تھے۔ اسی طرح میری دادی اور میرے والد کی پیدائش بھی کراچی میں ہوئی تھی۔ آپ کی تحریر مجھے بہت اچھی لگی۔ جیمز اسٹر یچن شوقیہ مصور بھی تھے۔ میرے پاس ان کی بنائی ہوئی کراچی کے مقامی لوگوں کی 25 تصاویر موجود ہیں جن کا تعلق مختلف سماجی جہتوں سے ہے۔ وہ آپ کی دھرتی سے از حد محبت کرتے تھے۔ ایک برس پہلے تک میں ان کا مکمل نام تک نہ جانتا تھا لیکن Ancestry.co.uk کے ذریعے میں ان کے بارے میں بہت کچھ جان چکا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ میں ان کی کوئی تصویر اگر اب ہے تو حاصل کرسکوں۔ میں بھی بھارتی ریاست آسام میں پیدا ہوا تھا۔ شکریہ

ڈیوڈ کارنگی

(مسٹر جیمز اسٹر یچن اور مولانا وفائی، ص 218)
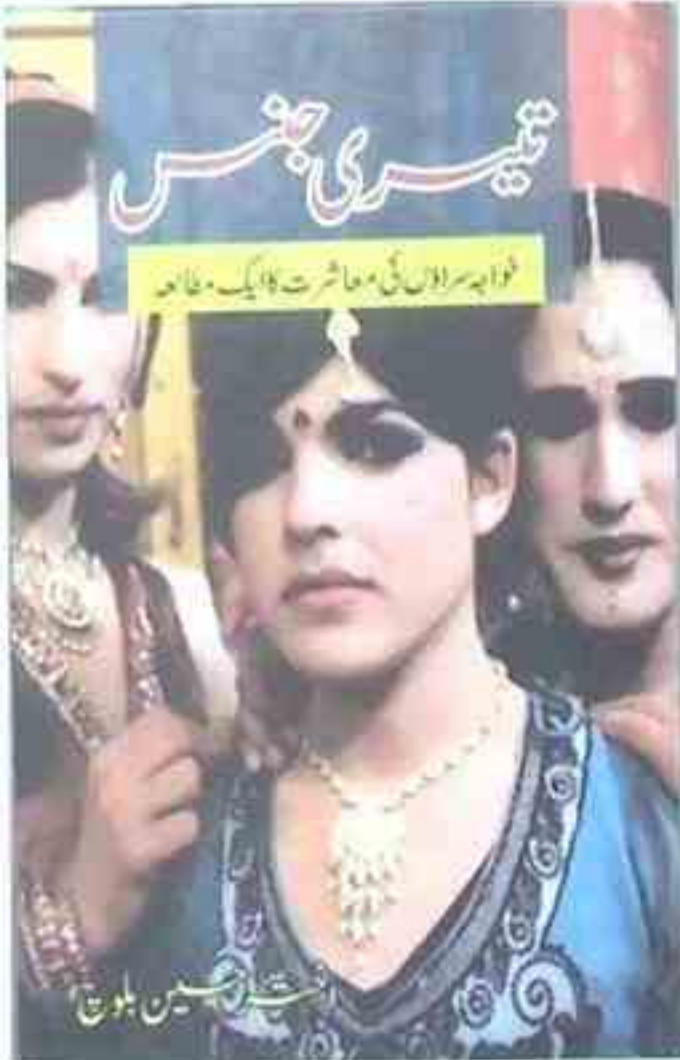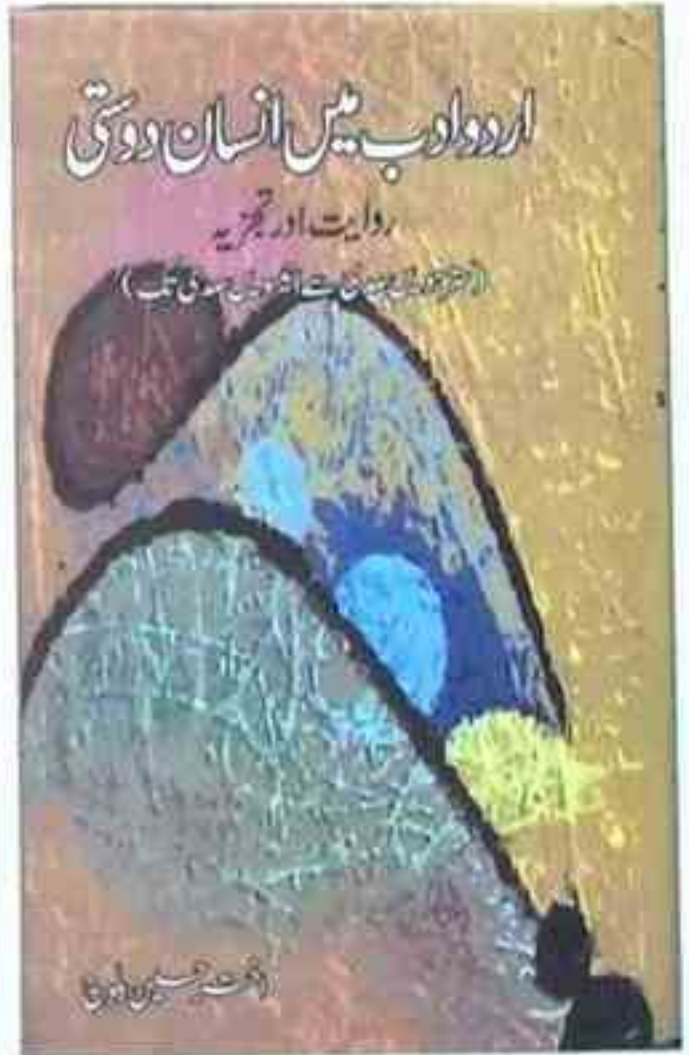
ISBN:978-969-781-919-0

Rs.300